باتیں ملاقاتیں

سلسلے وار ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) 890 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ...... 5000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا...... 6000 روپے

افسانے

رنگِ کائنات

دوشیزہ میگزین

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: فی OB-7 تا پور روڈ، کراچی

Phone : 021-35893121 - 35893122

Email : pearlpublications@hotmail.com
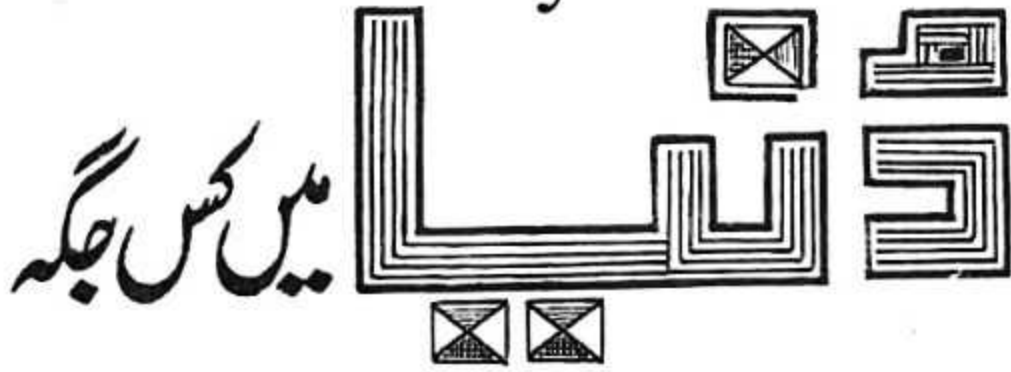
اِس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنّفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافات، جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے، اور قارئین و مدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک "احوال"۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

موسمِ سرما

اللہ تبارک و تعالیٰ کا بنایا ہوا ایک حسین موسم ، جب سبزہ سفیدی کی چادر اوڑھ کر ہر جانب چاندنی بکھیر دیتا ہے۔ گرم قہوے، کافی، ڈرائی فروٹ، رنگ برنگی شالز، ٹوپیاں، مفلر غرضیکہ ہر وہ شے باہر نکل آتی ہے جو اس سرد موسم کے حسن کو مزید نکھار دیتی ہے۔ لوگوں کے مزاج بھی اچھے رہتے ہیں۔ صبح کا اپنا حسن ہوتا ہے اور شام کی اپنی رعنائی ، ہمارے جن علاقوں میں بہت سردی پڑتی ہے وہاں تو برتنوں میں رکھا پانی جم جاتا ہے، پانی کے پائپ چٹخ جاتے ہیں غرض کہ ہر شے سردی کا لبادہ اوڑھ کر ٹھٹھر جاتی ہے، سرد پڑ جاتی ہے بالکل ایسے ہی جیسے باچا خان یونیورسٹی پر حملے کے بعد، آرمی پبلک اسکول کے بعد ساری قوم کے جذبات سرد پڑ گئے۔

ایک طرف جوان لاشے دوسری طرف مارننگ شوز میں وہی بے ڈھنگے ناچ گانے، ہر انگلی صرف بھارت کی جانب اشارہ کرتی ہے مگر بھارتی فلمیں بند نہیں کی جاتیں ...... میرے ملک کے اکثر بچوں اور بیشتر بڑوں کو قائداعظم کے والدین اور دیگر بہن بھائیوں کے نام یاد نہیں مگر کس بھارتی اداکارہ کا کس سے معاشقہ چل رہا ہے ازبر ہے۔ خیر اس میں یقیناً کسی کا قصور نہیں، موت تو برحق ہے۔ جوان جوان بچوں کو لے گئی، اب کوئی کتنا روئے یہ تو معمول بن گیا ہے۔ پھر شاید موسمِ سرما کا سارا قصور ہے کہ انسان کے جذبات، دوسروں کے غم کو بھی محسوس نہیں کرتے اور سرد رہتے ہیں۔

بالکل بے گور و کفن مُردے کی طرح ......

منزہ سہام

قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اوّلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کردینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کرجاؤں کہ میرے دُکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعۂ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کردیے۔ مگر اب...... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جارہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کرجاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے...... آیئے اور اپنے بابا جی کا ساتھ دیجیے......

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرایئے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا قدم......ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ' خوب صورت
رابطوں کی دلفریب محفل

میرے بہت ہی عزیز ساتھیو!

دوشیزہ کی محفل میں مجھے پا کر آپ لوگوں کو یقیناً حیرت ہوئی ہوگی۔ بیٹیاں جب پیا گھر رخصت ہوجاتی ہیں تب مائیں ایک بار پھر کمر کس کر میدان میں کود پڑتی ہیں، آنے والے حالات کو سنبھالنے کے لیے...... تو بالکل اسی طرح میں بھی دوشیزہ کی ذمہ داری اٹھانے میدان کارزار میں کود پڑی ہوں۔ کیونکہ رضوانہ پیا گھر تو نہیں سدھاریں ہاں الیکٹرانک میڈیا کو ضرور پیاری ہوگئیں۔ آج کل اپنی ٹیلی فلم میں مصروف ہیں۔ اس لیے میری دعائیں ان کے ساتھ ہیں کہ اللہ کامیابی عطا فرمائے۔ اب کچھ باتیں آپ لوگوں سے تو مجھے آپ سب کی آراء کا بہت شدت سے انتظار رہے گا۔ زبردست قسم کے خط لکھیے، اپنی رائے کا کھل کر اظہار کیجیے۔ نئے لکھنے والوں کے لیے دوشیزہ کے صفحات ہمیشہ کی طرح حاضر مگر میں پرانے لکھنے والوں کی بھی منتظر ہوں۔ روبینہ اخلاق' حمیرا راحت' صبیحہ شاہ' نسیم آمنہ' سیما مناف' اقبال بانو' روحی یاسر کہاں ہیں آپ لوگ۔ چلیے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے۔ آیئے اس رنگ و خوشبو سے سجی محفل میں قدم رکھتے ہیں۔

✉: یہ ہیں شہناز انور شفا کراچی سے، پیاری سی رضوانہ پرنس، اسلام علیکم۔ اور بہت عزیز منزہ، معتبر سے زین شمسی، اور تمام اہالیانِ دوشیزہ کو بھی دُعا و سلام۔ 2015 رخصت ہو رہا ہے، اور میں یہ تحریر کر رہی ہوں۔ جب تک یہ زیبِ قرطاس اور زیرِ نگاہ ہوگا، نیا سال 2016 شروع ہو گیا ہوگا۔ ماہ و سال کیسے اڑتے چلے جاتے ہیں۔ کارواں آگے پیچھے رواں دواں ہیں۔ میرِ کارواں اپنے نقشِ قدم پہ آنے والے قافلے کے مشعل بردار کو، روشنی کا منبع تھماتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ دوشیزہ بھی اپنی دیرینہ روایات پر قائم، مضبوطی سے، نپے تلے قدم جمائے، رقصاں و شاداں، مائل بہ پرواز ہے۔ اللہ اس کو سدا کامرانیوں سے نوازے۔ آمین۔ دعا گو ہوں اور رہوں گی کہ یہ ہمیشہ اپنی زریں روایات کے پیشِ نظر معیاری ادب تخلیق کرتا رہے۔ اور، عام آدمی تک اس ادب کی رسائی، ممکن و جاری رہے...... آپ سب لوگ کیسے ہیں؟ اور تمام قارئین دوشیزہ کیسے ہیں؟ دعا ہے کہ سب شاد مان اور آباد ہوں۔ آمین۔ اب، اللہ تعالیٰ سب کو، کل عالمِ انسانیت کو، امن اور سکون، کھلے ذہنوں اور کشادہ دلوں کے ساتھ، محفوظ رکھے۔ آمین۔ سبھی ادیبہ واُدبا خوب لکھ رہے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو، کہ، ہم اردو کی آبیاری کریں۔ امسال ایک لغت بھی اپنے ساتھ ساتھ رکھیں اور، ہندی کی بجائے اس کا متبادل اردو لفظ استعمال کریں۔ امریکہ نے غلامی کی باقیات سے اپنی شناخت کو بچانے کے لیے، اپنے ماضی کے مالکوں کی زبان کی پیچیدگیوں کو ختم کر کے ایک سٹیس انگریزی

اس لیے ترویج دی کہ، اُن کی آنے والی نسلیں ذہنی طور پر بھی غلامی سے آزاد ہو جائیں۔ اس لیے اب ایک برطانوی انگریزی اور ایک امریکی انگریزی زبان ہے۔ یہ تو میرا خیال ہے۔ کوئی نصیحت نہیں۔ ویسے جو مزاجِ یار میں آئے۔ دسمبر کے دوشیزہ پر ابھی کوئی تبصرہ نہیں کر پاؤں گی، کیونکہ ابھی فقط خوبصورت سا سرورق، اور پرسوں، مکینک سے گاڑی مرمت کرواتے وقت، فرحت صدیقی کے ساتھ آنگن میں اتری بارات میں شمولیت کر پائی۔ مزہ آ گیا جی۔ سطر سطر دعائیں دل سے جاری رہیں۔ اب اپنی روایتی شادیوں کے سادے مگر پُر ذوق لمحوں سے محظوظ ہونے کو، برطانیہ یا امریکہ جانا پڑے گا۔ یہاں تو اب ہر موقعے پر بدیسی ملمع چڑھا ملتا ہے۔ میڈیا کا احسان ہے۔ مگر کیا ہر چمکتی چیز سونا ہوتی ہے؟ ہاں تو اب جو یہ چند چھٹیاں نصیب میں ساتھ ساتھ آئی ہیں تو، سکون سے، دسمبر کا دوشیزہ پڑھوں گی۔ صرف ایک مریضہ میری زیرِ نگرانی داخل ہے، ایک ہسپتال میں۔ آج وہ بھی انشاءاللہ بہتر ہو کر گھر چلی جائیں پھر ذہنی فراغت بھی ہو جائے گی۔ انشاءاللہ۔ نفسیاتی و ذہنی امراض کے مریضوں کے ساتھ، ذہنی و جذباتی مشقت خاصی زیادہ ہوتی ہے۔ نومبر کا شمارہ اچھا رہا۔ شگفتہ شفیق کی آنگن میں بارات کا تصویر نامہ بہت اچھا لگا۔ بہت مخلص دعائیں ان سب کے لیے۔ تحریر سبھی اچھی ہیں۔ زیرِ تحریر 'تشدد' معاشرے کا عکاس ہے۔ شاید اب زندگی کی سادہ سچائیاں مزہ نہیں دیتی ہیں۔ یا پھر، زیبِ داستاں کے لیے، قلم چوک جاتا ہے۔ دامِ دل میں الجھ جاتی ہوں۔ شاید ابھی تک کچھ نہیں بدلا۔ بیٹی کی پیدائش، نچلے درجے کا انسان ہونا، بیوی کا اسی ظالم رسمِ جہاں کل ایک شکار بننا، دل کو خون کے آنسو رلاتا ہے۔ ہم نے کتنی دہائیاں، عورتوں کو اُن کے جائز حقوق دلانے کے لیے، اپنے سب سے بہترین مہ و سال لگا دیے۔ سڑکوں پر جلوس نکال کر آبلہ پائی بھی سہی۔ تب جا کر کچھ بہتری آئی۔ مگر معاشرہ اُس وقت تبدیل ہوگا جب ہر عورت خواندہ اور معاشی طور پر باختیار ہو کر، اپنے آپ کو، مرد کی جذباتی غلامی سے نکال لائے گی۔ اپنی بیٹیوں کے لیے مثال بن جائے گی۔ عورتوں کا ادب اس سلسلے میں ہراول دستے کا کام کر سکتا ہے۔ زندگی کا یہ بھی ایک اعلیٰ مقصد ہو سکتا ہے۔ تحریر بہت طویل ہوگئی۔ جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ مگر، لاشعور میں کہیں گزشتہ سالوں کے اختتام، جن میں محترم سہام مرزا صاحب سے، سال کی آخری شام، سیر حاصل گفتگو کرنے کی، یادیں کارفرما ہیں۔ اور وہی قلم کو لیے چلی جا رہی ہیں۔ معذرت کہ میں سہام مرزا صاحب کو مرحوم نہیں لکھ رہی۔ وہ تو دوشیزہ میں جیتے ہیں اور منزہ میں بولتے ہیں۔ کیوں منزہ؟ ایک افسانہ 'زہریلی' حاضرِ خدمت ہے، ساتھ منسلک کر رہی ہوں۔ امید ہے کہ دوشیزہ کے معیار پر پورا اترے گا اور اس کے گلشن میں جگہ پائے گا۔ الیکٹرانک میل سے آپ سب سے رابطہ کرنے کی پہلی کاوش ہے۔ اب پہنچ جائے۔ دوشیزہ کے تمام ساتھیوں اور دوستوں کو، جو اس میں رنگ بھرتے ہیں اور اس کے ہم قدم ہیں، سب کو سالِ نو، 2016ء کی بے شمار نیک تمنائیں اور مخلص دعائیں۔ اس عزم کے ساتھ کہ، اب قدم بہ قدم ساتھ نبھائیں گے۔ آمین۔ سارے عملے کو، اتنے نامساعد حالات میں بھی اتنا اچھا رسالہ پیہم شائع کرتے رہنے پر بہت مبارکباد۔ سدا خوش رہیں، خوشیاں بانٹیں، اور نئی خوشگوار یادیں بنائیں۔

☆: بہت ہی پیاری شہناز اتنے زمانوں کے بعد آپ کا خط اور افسانہ دیکھ کر میں تو خوشی سے پھولی نہیں سما رہی، ویسے جتنا آپ کو میں تلاش کرتی ہوں اگر زیرِ زمین خزانہ ڈھونڈ رہی ہوتی تو اب تک کامیاب ہو جاتی۔ خیر یہ تو مذاق کی بات ہے آپ خزانے سے کم تھوڑی ہیں۔ نئے لکھنے والوں کی اپنی جگہ ہے مگر جب دوشیزہ کے پرانے لکھاری محفل میں شریک ہوتے ہیں تو میں ننھی منی سی منزہ بن جاتی ہوں۔ اپنے ابو کے گرد منڈلاتی ان کے چہرے کو تکتی...... اس لیے یہ بڑی سی منزہ جانتی ہے کہ شہناز انور شفا دوشیزہ کے لیے کتنی ضروری ہیں، پھر شفا کی تلاش میں تو سارا جہاں سرگرداں ہے ہم تو خوش نصیب ہیں کہ آپ کو پالیا......بس وعدہ کریں اب آتی رہیں گی۔

سانحہ ارتحال

ہمارے دیرینہ رفیق، کوآرڈینیشن آفیسر APNS محمود احمد کی اہلیہ گزشتہ دنوں رضائے الٰہی سے انتقال کر گئیں۔ ادارہ پرل پبلی کیشنز دکھ کی ان گھڑیوں میں اُن کے ساتھ ہے اور مرحومہ کے اعلیٰ درجات کے لیے دعا گو ہے اور لواحقین کے لیے صبر کی استدعا ہے۔

✉: فیصل آباد سے یہ آمد ہے فرحت صدیقی کی، لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ السلام علیکم! دوشیزہ کا شمارہ پوری آب و تاب سے ملا میں مشکور ہوں کہ آپ نے ماہم کو سجا دیا اپنے دوشیزہ کے ٹائٹل پر۔ اداریہ زبردست تھا۔ لوگ خوف کی بُو میں ڈوبے ہوئے ہیں انہیں امن کی خوشبو سے کیا سروکار' دوشیزہ کی محفل میں رضوانہ کو وعلیکم السلام بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ سب کو محبتوں کی مالا میں پرو رکھا ہے۔ دام دل دل کو دکھا رہا ہے۔ بیٹی تو کائنات کا سب سے پیارا روپ اور خدا کا تحفہ ہے۔ اُم مریم کا ناول کافی مشکل تو نہیں ہو گیا میرا مطلب ہے طویل ہوتا جا رہا ہے۔ افسانے بہت اچھے تھے اب قسط وار کہانی کا انتظار بہت مشکل لگتا ہے۔ سمجھوتے اور بازارِ حسن، عدت' محبت ہم نے بھی کی اور تیرے رنگ بہت لاجواب افسانے تھے۔ دوشیزہ ماشاء اللہ بہت اچھا جا رہا ہے۔ آپ کا معیار بھی بہت زبردست ہے۔ اللہ آپ سب کو خوش رکھے۔ میری طرف سے سب کو سلام اب اجازت دیجیے۔

☆: بہت ہی سوئٹ فرحت! شمارے کی تعریف کا شکریہ، آپ کی پسندیدگی قلم کاروں تک پہنچا دی ہے۔ یقین مانیے اِن کا دل بہت بڑا ہوگا۔ سینئر لکھاری جب نئے لکھنے والوں کی تعریف کرتے ہیں تو چاروں طرف کہکشاں سی چھا جاتی ہے۔ محفل میں آتی رہا کیجیے۔ مجھے بھی حوصلہ ملتا ہے۔

✉: اور یہ نامہ آیا ہے نسیم آمنہ کا، لکھتی ہیں۔ منزہ پرچہ تو مجھے بارہا تاکید کے بعد بھی نہیں بھیجا جا رہا ہے مگر اِس بار میں خود لے آئی تو گل کے بارے میں پڑھ کر شاک لگا۔ بڑا اچھا ساتھ رہا۔ وہ ہمیشہ اپنی کتابیں بھیجا کرتی تھیں۔ دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ میں بنے رشتے بہت ہی پائیدار نکلے مگر اب وہ نہیں، دل ٹوٹ گیا۔ بہرحال یہی حقیقت ہے۔ لنچ کی تصویریں دیکھیں سب بہت اچھے لگے۔ میں ملیر کینٹ شفٹ ہو گئی ہوں۔ تم آؤ میرے پاس مجھے اچھا لگے گا۔ بہت عرصے سے کچھ نہیں لکھا مگر اب کوشش کروں گی۔ اللہ تمہیں اپنے بچوں کی خوشیاں دکھائے۔

☆: عزیز از جان نسیم! میں نے سچے دل سے آپ کو پکارا تھا اور آپ آ گئیں، بہت اچھا لگا۔ گل جیسی پیاری شخصیت کے بچھڑنے کا سب کو بہت دکھ ہے مگر ان کی دوشیزہ سے محبت دیکھیں کہ پرانے لکھاری جو ایک عرصے سے زندگی کے شب روز میں اُلجھ گئے تھے۔ رابطے میں آ رہے ہیں۔ لنچ میں آپ کو بہت مس کیا بہت کوشش کی بات ہو جائے مگر وائے ری قسمت، انشاء اللہ جلد ملاقات ہوگی۔ سوچ لیا ہے کہ کم از کم کراچی کے رائٹرز تو جلدی جلدی مل ہی سکتے ہیں۔ مجھے آپ کے افسانے کا انتظار رہے گا اور محفل میں پابندی سے حاضری بھی لازمی ہے پرچے جاری کروا دیے ہیں۔ شرمندہ ہوں کہ چُوک ہوئی، خوش رہیے۔

✉: مختصر تبصرے کے ساتھ آئی ہیں کراچی سے سعدیہ اقبال، لکھتی ہیں۔ السلام وعلیکم! ڈیئر رضوانہ پرنس اور دوشیزہ اسٹاف کو میرا پیار بھرا سلام۔ میں آج پہلی بار اس محفل حاصر ہوئی ہوں۔ دوشیزہ کی فین تو میں کب سے ہوں اس کی ہر کہانی دل کو چھو جاتی ہے باقی تمام سلسلے بھی بہت پیارے ہیں۔ دوشیزہ کی ہی بدولت مجھے لکھنے کا شوق پیدا ہوا ہے تو پہلی بار اپنی تحریر لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں کوئی غلطی کوتاہی ہو تو معاف کیجیے گا امید ہے کہ آپ مجھے دوشیزہ کا حصہ ضرور بنائیں گے میری تحریر کو دوشیزہ کے صفحات پر ضرور جگہ دیجیے گا اللہ پاک ہمارے دوشیزہ اور اسٹاف کو ہمیشہ ترقی و کامرانی عطا فرمائے۔ آمین۔

☆: ڈیئر سعدیہ! تم دوشیزہ کی محفل میں پہلی بار آئی ہو اب آتی رہنا۔ تمہاری تحریر دیکھی تمہیں مزید مطالعے کی ضرورت ہے۔ دوشیزہ کے افسانے غور سے پڑھو اور مصنفین کا انداز تحریر سمجھنے کی کوشش کرو۔ مجھے یقین ہے کہ بہت جلد تم اچھا سا افسانہ لے کر آؤ گی میں منتظر ہوں تمہاری تحریر کی۔

✉: پنڈی سے آئی ہیں مریم مرتضیٰ۔ میں نے یہ ناولٹ آپ کو بھیجا ہے میں قسط وار لکھنا چاہتی ہوں آپ کی اجازت طلب ہے۔ اگر میرا یہ ناولٹ شائع ہو جائے یا ناقابل اشاعت ہو تو برائے مہربانی مجھے بتا دیجیے گا تاکہ میں انتظار نہ کروں۔

☆: ڈیئر مریم! پنڈی کا موسم کیسا ہے خوب سردی پڑ رہی ہوگی......؟ تمہارا نام بہت خوبصورت ہے میری اکثر ہیروئنوں کا یہی نام ہوتا تھا۔ تمہاری تحریر دیکھی مجھے نہیں پتا تمہاری عمر کیا ہے مگر اندازہ ہے کہ کم عمر ہو لہٰذا مشورہ دوں گی کہ فی الحال پڑھنے پر توجہ دو۔ الفاظ کا صحیح چناؤ جذبات کی عکاسی مطالعے سے آتی ہے۔ کوشش کرتی رہو مجھے یقین ہے جلد دوشیزہ میں چھپو گی۔

✉: ٹھٹھری اور کپکپاتی آئی ہیں لاہور سے ثمینہ طاہر بٹ! السلام وعلیکم رضوانہ آپی میرا نام ثمینہ طاہر بٹ ہے اور میرا تعلق لاہور سے ہے میں بہت عرصے کے بعد آپ کی محفل میں شامل ہو رہی ہوں۔ کچھ تو مصروفیات اور کچھ ڈاک پوسٹ نہ کر سکنے کی مجبوری نے ہمیشہ میرے ہاتھ باندھے رکھے میں بنیادی طور پر قلم کار ہوں میری استاد، میری محسن انجم انصار آپا نے ہمیشہ مجھے یہی کمپلیمنٹ دیا کہ تمہارے اندر ایک ناول نگار چھپا بیٹھا ہے اسے کھوجو اسے باہر نکالو اور اپنا ٹیلنٹ جو اللہ نے تمہیں دیا ہے اسے دنیا کے سامنے لاؤ، اسی لیے میں اپنے آپ کو قلم کار کہنے کی جرأت کر جاتی ہوں۔ انجم آپا نے مجھے ہمیشہ دوشیزہ میں لکھنے کا مشورہ دیا اور الحمدللہ دوشیزہ نے اور آپ نے بڑی حوصلہ افزائی کی، میری تحریروں کو اپنے صفحات میں جگہ دی۔ دوشیزہ کے علاوہ سچی کہانیاں میں بھی میری تحریر نے جگہ پائی اور میں آپ کے اور کاشی چوہان سر کے اس تعاون کے لیے بہت شکر گزار ہوں۔ آپی جان! میری پہلے بھی تحریریں کاشی چوہان کے پاس پڑی ہیں انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس سال کے آخر میں وہ چھپ جائیں مگر یہ سال تو ختم ہو گیا اب آپ سے گزارش ہے کہ پلیز میری تحریروں کو جلدی جلدی جگہ دیا کریں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔ میں نے آپ کو آج بھی نئی کہانیاں ای میل کی ہیں اصل میں اب کچھ پوسٹ بھی نہیں کروا پاتی آپ کو بتایا ہی تھا کہ میرے میاں صاحب ٹھیک نہیں رہتے، میرے گھر سے پوسٹ آفس بہت دور ہے اور ان کے لیے وہاں جانا مشکل ہو گیا ہے وہ برین ٹیومر کے مریض ہیں ناں، اس لیے میں پھر انہیں فورس نہیں کرتی بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ میری ڈاک میری کہانیاں لکھی پڑی رہ جاتی تھیں اور کوئی نہیں لے جانے والا ملتا تھا میں پریشان ہو جاتی تھی ظاہر ہے کمیونیکیشن کا کوئی ذریعہ ہی نہیں بنتا تھا پھر اللہ کا شکر ہے کہ میری بہن نے مجھے لیپ ٹاپ بھجوا دیا (مختلف جریدوں میں میری تحریریں چھپنے کی خوشی میں) اور ساتھ ہی ان پیج رائٹنگ بھی بتائی۔ پھر میری بہت اچھی فرینڈز مصباح نوشین، فوزیہ احسان رانا، صدف آصف، صائمہ اکرم چوہدری انہوں نے بہت گائیڈ کیا اور الحمدللہ اب میں اس قابل ہو چکی ہوں کہ ان پیج پر بھی لکھ لیتی ہوں اور ای میل بھی کر لیتی ہوں آپ سے گزارش ہے کہ میری مجبوری کو سمجھتے ہوئے میری کہانیاں ای میل کے ذریعے قبول کر لیا کریں آپ کا بہت احسان ہوگا۔ اب اجازت چاہتی ہوں زندگی نے وفا کی اور اللہ نے چاہا تو جلد ملاقات ہوگی کسی نئی کہانی کے ساتھ حاضر ہوں گی جزاک اللہ۔

☆: سویٹ ثمینہ! جی آیاں نوں......تم دوشیزہ میں اور سچی کہانیاں میں چھپ رہی ہو، اب تو ہماری اپنی ہوئیں ناں انجم انصار بہت اچھی خاتون ہیں مجھے ذاتی طور پر بہت پسند ہیں۔ وہ تمہاری استاد ہیں تو بھئی ان کا نام اونچا

رکھنا اور اچھا لکھنا۔ اللہ تمہارے میاں کو صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ تم ای میل کے ذریعے ہی افسانے اور کہانیاں بھیج دیا کرو اور تبصرے کے ساتھ ضرور آیا کرو۔

✉: ڈی جی خان سے آئے ہیں منعم اصغر دوشیزہ کے اسٹاف، احوالیو اور رضوانہ آپا کو میرا پرخلوص سلام قبول ہو۔ امید نہیں یقین ہے کہ سب خیریت سے ہوں گے اس بار معذرت کے ساتھ ڈائجسٹ تو ملا ہی نہیں اس لیے رائے دینے سے قاصر ہوں اس بار ڈائجسٹ ملا تو اگلے ماہ تبصرہ ضرور بھیجوں گا۔ اس ماہ آپ کو اپنا ایک ناولٹ 'جگنو میری پلکوں پر' ارسال کر رہا ہوں امید ہے دوشیزہ کے لیے پسندیدگی کی سند پانے میں کامیاب ٹھہرے گا یہ ناولٹ۔ پلیز جلد ریڈ کر کے مجھے اپنی رائے سے آگاہ کر دیجیے گا یا میں خود کال کر کے معلوم کرلوں گا پچھلے ناولٹ میں بہت دیر ہوگئی تھی ڈائجسٹ پڑھا ہی نہیں مگر یقین ہے کہ ہمیشہ کی طرح بہت اچھا ہوگا۔ دوشیزہ میں ندا حسنین، فرحین اظفر، سحرش فاطمہ، اور نفیسہ (آپا) کی آمد اچھی لگی امید ہے دوشیزہ کے لیے کچھ نہ کچھ لکھتی رہیں گی اللہ ان کے قلم کو مزید طاقت دے آمین۔ اب چلوں گا بہت محبت و خلوص کے ساتھ اللہ حافظ۔

☆: منعم! تمہارا ناولٹ ابھی نہیں پڑھا جلد ہی پڑھ کر اطلاع دوں گی مگر تم بھی اپنا تبصرہ ضرور دیا کرو تمہاری پسندیدگی مصنفین تک پہنچا دی ہے۔

✉: کراچی سے آگئی ہیں سنبل! ڈیئر پرنسز رضوانہ جی۔ السلام وعلیکم اللہ کا شکر و احسان ہے کہ ہماری طرف سب خیریت ہے اور آپ کی خیریت رب کریم سے نیک مطلوب ہے۔ اب آتے ہیں خطوط کی طرف خط سے پتہ چلا کہ شگفتہ جی نے دوشیزہ کی سرکولیشن میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ شمع جی میں نے تو آپ کا نمبر بھی ڈھونڈ لیا اور اس پر MSG بھی SEND کیا مگر آپ نے Reply ہی نہیں دیا ورنہ میں فون پر بھی بات کرلیتی۔ زمر آپ کو بھی ARY digital پر اپنا ڈرامہ چلنے کی مبارک باد۔ فوزیہ کو ایوارڈ ملنے پر مبارک باد۔ سیما آپ کی بہن ہماری مایہ ناز رائٹر گل اور ہماری بہت پیاری رضوانہ کی والدہ کے انتقال کی خبر ملی۔ دل بہت دکھی ہے اللہ تمام مرحومین کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر عطا فرمائے۔ (آمین) احسن اور منشا دونوں ہی اچھے، انٹرویو بھی لاجواب تھے۔ ایاز اور ماہم کی شادی کا احوال اور تصاویر شاندار تھیں کیا۔ سرورق پر بھی ماہم کی ہی تصویر تھی۔ دام دل میں یہ کیا کیا رفعت جی۔ ایمن کو ہی مار دیا بہت اچھی طرح آپ کہانی لے کر چل رہی ہیں۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ رحمٰن رحیم کا ایک مخصوص انداز ہے وہ اسی انداز سے آگے بڑھ رہی ہے۔ سباس گل کا ناول مکمل ہونے پر رائے دوں گی، عابدہ سبین کا ناولٹ بھی ٹھیک ہے، حبیبہ عمر بھی اچھا لکھ رہی ہیں۔ سعدیہ عابد معاف کیجیے گا آپ کا ناولٹ فارمولا کہانی پر مشتمل ہے اس کنڈیشن پر اتنی رائٹرز لکھ چکی ہیں جس کا کوئی جواب نہیں اور اب یقیناً اگلی قسطوں میں اُم کیلی کو زنیر عباسی سے محبت ہو جائے گی یہ ناولٹ غالباً ادارے کو اتنا اچھا لگا کہ میرے ڈائجسٹ میں دوبارہ لگا اور اس کی زد میں آگئیں۔ بولوں تو فسانے جاگیں، چھوٹی چھوٹی باتیں، اور عدت۔ میں ان افسانوں سے محروم رہی سمجھوتے اچھی تھی بازار حسن بہت خوبصورت احساسات کا افسانہ تھا۔ تیرے رنگ میں نارمل تھی۔ رامس نے کیا خوبصورت افسانہ لکھا ہے مزہ آگیا۔ جب صنف کرخت میں سے کوئی صنف نازک کے جذبات احساسات کو اتنے اچھے انداز میں لکھتا ہے تو مزہ آجاتا ہے۔ شائستہ انور نے بھی اہل مغرب کے دوہرے معیار پر خوبصورت افسانہ لکھا۔ روبینہ شاہین نے فضول خواہشات کو اچھا انجام دیا۔ دوشیزہ گلستان زبردست ہے خصوصاً کینسر کا علاج تو اور ہاں اسماء اعوان آپ لائف بوائے کہانی بھی اچھی لکھ رہی ہیں۔ زین کہاں غائب ہوگئے؟ نئے لہجے میں شاعری اچھی ہورہی ہے۔ یہ تو تھا تبصرہ اور اب سنائیں کیا حال احوال ہے گرمیوں کی شدت لیے سردیاں کیسی گزر رہی ہیں اب پھر بھی موسم بہتر ہے منزہ کا کیا حال احوال ہے باقی تمام اسٹاف کو سلام۔

Email : pearlpublications@hotmail.com

☆ خوف اور دہشت میں لپٹی سچ بیانیاں

☆ ارواحِ خبیثہ کا شاخسانہ بننے والوں کی کہانیاں

☆ زہر بھری دنیا سے، یادگار ناگ بیتیاں

☆ فراعنہ کی سرزمین سے، اسرار بھرے راز عیاں کرتی خصوصی داستانِ حیرت

☆ پوشیدہ دنیا سے بہت خاص طلسم کدے میں قید کرتی وہ کہانیاں، جو آپ کبھی فراموش نہ کر سکیں گے

تو پھر دیر کس بات کی ہے...... لہو منجمد کر دینے والے، ماہ مارچ 2016ء کے شمارے پُر اسرار کہانی نمبر' کی کاپی آج ہی بک کرا لیجیے۔

ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

سچی کہانیاں کا مارچ 2016ء کا شمارہ پُر اسرار نمبر' ہوگا۔

☆: ڈیئر سنبل! تبصرہ ہمیشہ کی طرح بھرپور تھا...... بالکل صحیح پہچانا ٹائٹل پر بھی ماہم تھی۔ زین آج کل اپنے BBA میں بری طرح الجھے ہوئے ہیں اور ہاں سب سے مزیدار بات سنبل جو خط 2009 میں آپ نے پوسٹ کیا تھا وہ مجھے پچھلے ہفتہ مل گیا۔ سنبھال کر رکھا ہے روز دیکھتی ہوں اور محکمہ پوسٹ کی کارکردگی پر سر پیٹتی ہوں سردیاں بہت اچھی گزر رہی ہیں۔ نہ لائٹ کی فکر ہے نہ پانی کی کم یابی کا دکھ یعنی راوی چین ہی چین لکھ رہا ہے۔

✉: کراچی سے یہ آمد ہے خولہ عرفان کی، لکھتی ہیں۔ محترم وعزیز رضوانہ پرنس صاحبہ، مدیر ماہنامہ دوشیزہ ڈائجسٹ۔ السلام وعلیکم! بعد از سلام دو عاعرض ہے کہ آپ کے خلوص ومحبت کا اینڈ حسن خط کی اشاعت کی صورت میں جیسے ہی نظر آیا حسب وعدہ اپنے قلم کی بیٹری چارج ہوگئی، پلیز پلیز پلیز پرنسز یہ نہ سمجھیں کہ میں گاڑی ٹھیک کراکے کسی ورکشاپ سے آرہی ہوں ہرگز نہیں، دراصل ہاتھوں میں دوشیزہ میں موجود مہمانوں کی پھولوں کی صورت خوشبو بس گئی ہے، ذہن مہک رہا ہے سوچا کاغذ کو بھی محروم نہ رکھوں۔ دوشیزہ کا سب سے خوبصورت حصہ، جسے دوشیزہ کی غزل کہوں تو غلط نہیں ہوگا بہت خوب رضوانہ! آپ اور کاشی صاحب نے بہت خوبی سے اتنے حسین لب ولہجوں اور انداز کے بہتے دریا کو کوزے میں بند کیا ہے بصورت ہم اور ہمارے مہمان کے اور دوشیزہ کی سالگرہ کے۔ جس میں اظہار بدست گل رُخ مصنفین اور سروے بدست کاشی چوہان نے رنگ وخوشبو کی بہار سجائی ہوئی ہے۔ ایک مدت بعد مصنفین کی ذاتی زندگی کی جھلک نے ہمارے اندر چھپے جیمز بانڈ کی کچھ تشفی کردی کیا کریں کہ جگر مراد آبادی سے معافی کے ساتھ۔

نہیں جاتی کہاں تک فکر نسوانی نہیں جاتی
مگر عادت تجسس کی پرانی نہیں جاتی

مصنفین کو بچشم خود دیکھ کر اور ان کے تحریر کردہ تاثرات پڑھ کر کسی ایک کی تعریف کرنا ناانصافی ہوگی۔ تصاویر سب بہت شاندار ہیں جس میں منزہ سہام صاحبہ سب میں نمایاں ہیں۔ ان کے ساتھ سنبل، فرح اسلم قریشی، اور اور آپ بلیک اینڈ وہائٹ تصاویر ہونے کے باوجود خوشگوار تاثرات کے ساتھ نمایاں نظر آئیں۔ ویسے اگر تصاویر کلر ہوتیں تو چار چاند لگ جاتے فرداً فرداً سب رائٹرز کے حسن اور حسن سخن پر بھرپور تعریفی مقالہ لکھنے کا دل چاہ رہا ہے لیکن وقت کی کمی سے زیادہ محفل میں جگہ کی کمی کو مدنظر رکھنا ہے صرف اس بندی کا ہی خط شائع نہیں ہونا بہرحال بہت...... بہت...... بہت خوب رضوانہ! اب آتے ہیں تبصرے کی طرف حالانکہ اس دفعہ کا تبصرہ صرف اسی گلستان کا احاطہ کرنے پر مصر ہے لیکن...... رضوانہ حکایت گل بہت اداس کرگئی تھی لیکن دل سے دعا ہے کہ وہ گل دوسرے جہاں میں بھی مہکے اسی طرح جس طرح یہاں وہ اپنی مہکار چھوڑ گئی ہیں آمین۔ رفعت سراج کمال مصنفہ ہیں حساس اور بے ساختہ جملے وبہترین انداز تحریر کے ساتھ ان کا ناول 'دام دل' دل میں تراز و ہوگیا ہے فصیحہ آصف خان کا افسانہ سالگرہ محبت، سباس گل کا میرا فسانہ بس اک تو، دانیہ آفرین کا 'ہے بہار منتظر' تینوں افسانے غلط فہمیوں سے جڑی محبت، خود ساختہ روایات کے ہاتھوں بھینٹ چڑھنے والی عورت کی سفاکیوں کو بے نقاب کرتی اور مذہبی نقطۂ نظر سے عورت کے تحفظ پر دلالت کرتی بہترین تحریریں ہیں قسط وار ناول اور ناولٹ میں ام مریم کا رحمٰن رحیم سدا سائیں عابدہ سبین کا محبت روٹھ جائے تو حبیبہ عمیر کا ناولٹ پلکوں پر ٹھہرے خواب، سعدیہ عابد کا 'کس قدر تجھے چاہیں' پورے ذوق وشوق کے ساتھ مطالعہ کے بعد پھر انتظار کی اضطرابی کیفیت میں مبتلا کرگئے۔ ماریہ یاسر کا بہنا او بہنا، سویرا فلک کا اب کے برس اور ندا حسنین کا مکمل ناول دشمن جاں میرا ساجن اصلاحی پہلو کے ساتھ اچھی تحریریں تھیں مصنفین نے کہانی اور جملوں کے ساتھ خوب انصاف کیا ہے ڈاکٹر اقبال ہاشمانی 'تھا خواب میں خیال' جملوں کی برجستگی اور لفظوں کے خوبصورت استعمال سے جادو جگا دیا۔ دوشیزہ گلستان بھی ہمیشہ کی طرح بہترین معلومات اور فکاہیہ موضوعات سے مزین ملا۔ نئے لہجے نئی آوازیں میں سویرا خالد کی نظم 'ماں' کی کیا تعریف کروں کہ ایک تو ہستی ماں جیسی عظیم اور لفظوں کا خوبصورت پیراہن پہنانے والی اتنی کم عمر شاباش

دنیا
میں کس جگہ
دوشیزہ
کے چرچے نہیں
آپ دوشیزہ کے خریدار بنیں کو ملک کو
زرِمبادلہ بھیجیے
اندرون ملک =/890 روپے
ہر ملک، ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے
زرسالانہ
کویت 55امریکی ڈالرز
ایران 55امریکی ڈالرز
سعودی عرب 55امریکی ڈالرز
سری لنکا 55امریکی ڈالرز
یو اے ای 55امریکی ڈالرز
جاپان 55امریکی ڈالرز
مصر 55امریکی ڈالرز
لیبیا 55امریکی ڈالرز
یونان 55امریکی ڈالرز
ڈنمارک 55امریکی ڈالرز
فرانس 55امریکی ڈالرز
جرمنی 55امریکی ڈالرز
برطانیہ 55امریکی ڈالرز
ہالینڈ 55امریکی ڈالرز
ناروے 55امریکی ڈالرز
پولینڈ 55امریکی ڈالرز
امریکہ 65امریکی ڈالرز
کینیڈا 65امریکی ڈالرز
افریقہ 65امریکی ڈالرز
آسٹریلیا 65امریکی ڈالرز
آج ہی رابطہ کیجیے
88-C II ۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
فون نمبر: 021-35893121 - 35893122

ہے سویرا۔ دوسری نظم فریح اسلم قریشی کی، ان کے لیے اتنا ضرور کہوں گی کہ ان کی شخصیت، تحریر اور شاعری تینوں میں گہری ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ وہ خود شناس بھی ہیں اور نظر شناس بھی۔ اور سب سے زیادہ خوبصورت بات جو دوشیزہ کا حاصل مطالعہ ٹھہری وہ ہے منزہ سہام صاحبہ کا 'پروٹوکول' ہر جملہ حقیقت سے قریب تر، ہمارے جیتے جاگتے معاشرے کا عکاس بہت خوب، پرنسز ایک بات اور یہ کہ ہم لاہور سے تعلق نہیں رکھتے۔ ہماری سانسوں میں کراچی کی خوشبو مہک رہی ہے۔ ہم خولہ عرفان کراچی سے تحریر کرتے ہیں ویسے پرنسز ایک بات اور بتاؤں چاہیں تو شائع کر دیجیے گا آپ کے چہرے سے خلوص اور نرماہٹ، ملنساری کی مسکراہٹ لیے واضح نظر آتی ہے مکھن ہرگز نہیں لگا رہی ہوں۔ چہرہ ہمارے کردار کا آئینہ دار ہوتا ہے آپ بھی یقیناً اس سے متفق ہوں گی۔ خیر اب اپنے افسانے کی طرف آتی ہوں امید ہے میرا نیا افسانہ فرشتہ رحمت آپ کو مل گیا ہوگا۔ دعا ہے کہ بھیجے ہوئے دونوں افسانوں کی اشاعت جلد ہو جائے آمین۔ ایک نظم ارسال کر رہی ہوں پسند آئے تو اشاعت میں دیر نہیں کیجیے گا۔ مذاق کر رہی ہوں، آپ جب بہتر سمجھیں۔ اجازت چاہتی ہوں۔

☆: اچھی سی خولہ! تمہارا خط پڑھ کر بہت لطف آیا بڑا بھرپور تبصرہ کیا ہے۔ اداریہ کی پسندیدگی کا شکریہ تمہارے افسانے مل گئے ہیں پڑھ بھی لیے ہیں انشاء اللہ قریبی اشاعت میں شائع ہوں گے۔

✉: وسکہ سے آئی ہیں نسیم سکینہ صدف! میری اپنی بہن رضوانہ پرنس صاحبہ۔ السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی رضوانہ باجی آپ سے پہلی بار بذریعہ خط مخاطب ہونے کی خوشی حاصل کر رہی ہوں خدا آپ کو زندگی کی سچی خوشیاں دے۔ اس بار سردیوں کے حوالے سے سیاہ و سفید جرسی پہنے ماڈل اچھی لگی۔ منزہ سہام کا پروٹوکول پر ادایہ یادگار تھا۔ سالگرہ سروے بھی مزہ دے گیا۔ خوبصورت جامع جوابات تھے۔ کاشی چوہان کے 'ہم اور ہمارے مہمان' بہت شاندار رہی افغانی پلاؤ اور جھینگا کڑاہی کے ساتھ۔ رفعت سراج کا ناول دام دل اے دل جا رہا ہے۔ ایمن کی موت کا صدمہ بھی ہے اور چمن کے بچی لے جانے پر دادی کا برا منانے کا بھی دکھ ہے۔ تھوڑا سا آگے بڑھے تو میری پیاری دوست فصیحہ آصف کا نام جگمگا رہا تھا۔ سالگرہ محبت نے تو مبہوت کر دیا۔ اتنی سوہنی تحریر کہ بس...... میرا افسانہ بس ایک تو، پیاری سباس گل کمال کر دیا آپ نے تو...... بہت اچھی اسٹوری ہے۔ سویرا فلک' ماریہ یاسر کی تحریریں بھی پسند آئیں مستقل سلسلوں نے تو اک رونق لگا رکھی تھی۔ رضوانہ جی وہ مثال بنتی ہے آپ پر... دوشیزہ میں آپ آئے تو بہار آئی۔ خدا کرے دوشیزہ مزید بلندیوں پر پرواز کرے۔ اس کی پوری ٹیم وسلام۔

☆: اچھی نسیم فون پر بات ہوئی۔ آپ کے نندوئی کے انتقال کا جان کر دکھ ہوا اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ ہم آپ کو بھی کہتے ہیں کہ آپ آئے بہار آئی۔ اسی طرح مکمل تبصرے کے ساتھ آتی رہا کریں۔

✉: یہ ہیں فریدہ فری لاہور سے لکھتی ہیں سویٹ رضوانہ جی السلام علیکم! جنوری کا دوشیزہ ملا دلکش ٹائٹل کے ساتھ۔ دو ماہ سے طبیعت زیادہ خراب تھی میں لکھ ہی نہ سکی۔ مگر دوشیزہ سے رشتہ اتنا پرانا ہے کہ میں اس کو پڑھے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔ اس کے ناول اور افسانے بے حد معیاری ہوتے ہیں۔ کاشی بھائی کے ایکسیڈنٹ کا مجھے بہت دیر بعد پتا چلا اللہ تعالیٰ اُن کو صحت عطا کرے۔ آمین رضوانہ کوثر کی والدہ کو اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں اعلیٰ درجات عطا کرے اور رضوانہ جی کو صبر دے آمین۔ گل کی وفات کا بے حد افسوس ہوا وہ بہت بڑی رائٹر تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی بھی مغفرت کرے، آمین۔ اس مرتبہ بھی ناول اور افسانے ایک سے بڑھ کر ایک لگے۔ فصیحہ آصف کا افسانہ سالگرہ محبت بے حد پسند آیا۔ فصیحہ جی ایسا ہی لکھا کرو شکریہ۔ مکمل ناول سباس گل کا بہترین ناول لگا۔ سباس گل کے ناول تو ہوتے ہی بے حد اچھے ہیں۔ بہنا او بہنا' ہے بہار منتظر' اب کے برس، سہانی خوشی سب کے سب بہترین لگے۔ اُم مریم کے سلسلے وار ناول نے تو کمال کیا ہوا ہے مزا آ رہا ہے پڑھ کر۔ دوشیزہ گلستان میں سب نے بہت اچھا لکھا۔ کچن کارنر میں کچھ بھی پسند نہیں آیا۔

اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گے اللہ حافظ۔

☆: ڈیئر فریدہ! اللہ آپ کو صحت عطا فرمائے، دوشیزہ سے آپ کا لگاؤ مجھ سے ڈھکا چھپا نہیں۔ بس طبیعت ٹھیک کیجیے جلدی اور اس دفعہ کا کچن کارنر پڑھ کر بتایئے کیسا لگا......؟

✉: یہ ہیں ہماری نئی لکھاری ماریہ یاسر کراچی سے لکھتی ہیں۔ پیاری رضوانہ آپی اور سوئٹ منزہ آپی امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ پچھلے مہینے خط اور اپنی ایک ادنیٰ سی کوشش غزل کی صورت میں ارسال کی اور ساتھ ہی انتظار کی سولی پر لٹکنے لگے لیکن خط اور غزل اپنی جگہ بنانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ دل اداس سا ہو گیا اور سوچا کہ آئندہ خط نہ لکھوں گی۔ لیکن اپنی کہانی شائع ہونے پر شکریہ بھی تو ادا کرنا تھا سو دوبارہ کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی اس امید کے ساتھ کہ آئندہ ماہ پیاری اور موہنی سی رضوانہ آپی تھوڑی سی جگہ عنایت کر ہی دیں گی۔ سچ میں مجھے اپنی کہانی دوشیزہ میں چھپنے پر اتنی خوشی ہوئی کہ ناقابل بیان' حالانکہ اس سے پہلے میری 3 کہانیاں ردا میں شائع ہو چکی ہیں لیکن آپ کے پرچے کی تو کیا ہی بات ہے۔ اس میں اپنا نام دیکھنا میری بہت بڑی خواہش تھی جو جنوری کے مہینے میں اللہ کے فضل سے پوری ہوگئی۔ امید ہے آئندہ بھی جگہ ملے گی۔ منزہ آپی آپ نے تو مجھے انتظار کی سولی پر پچھلے مہینے سے لٹکایا ہوا ہے۔ اس سے کب جان بخشی ہوگی۔ میرا مطلب ہے کہ میں نے آپ کو اپنا ناولٹ (پہلی قسط) بھیجی تھی۔ اس کے بارے میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ کی پسند کی سند حاصل کرنے میں کامیاب ٹھہرا یا نہیں۔ اگر میری کوشش کامیاب ٹھہری تو یہ دوشیزہ صفحات کی زینت بننے میں کب تک کامیاب ہوگا۔ اپنی غزل اس بار پھر بھیج رہی ہوں اس امید کے ساتھ کہ قریبی شمارے کی زینت بننے میں کامیاب ہوگی۔ اب آتے ہیں جنوری کے شمارے کی طرف تو رفعت سراج آپی کے دام دل کے تو کیا ہی کہنے۔ میری کیا مجال کہ میں اُن کی تعریف میں کچھ کہہ سکوں یہ تو سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہو جائے گی۔ ناولٹ سب ہی بہترین جا رہے ہیں۔ ندا حسنین کا ناول بھی بہت اچھی کوشش تھا۔ سباس گل کی کہانیاں تو مجھے بہت ہی پسند ہیں۔ اُن کا نام ہی کافی ہے والی بات ہے۔ افسانوں میں مجھے سویرا فلک کا 'اب کے برس' اچھا لگا۔ باقی سب کے بھی اچھے تھے۔ امید کرتی ہوں میرے افسانے کے بارے میں بھی رائے دیں گے سب قارئین اور رائٹرز بھی، نئے لہجے نئی آوازیں میں فرح اسلم قریشی اور اُن کی شاگرد سویرا خالد زبردست رہیں۔ نوشابہ صدیقی اور شمسہ قمر کی بھی شاعری زبردست تھیں۔ اس ماہ کا پورا رسالہ ہی زبردست تھا۔ میری دعا ہے کہ اللہ دوشیزہ کو مزید ترقی دے اور منزہ آپی اور رضوانہ آپی سمیت سارے اسٹاف کو ہمت عطا کرے تا کہ وہ اسی طرح ہمارے لیے دوشیزہ لے کر آتی رہیں، اب اجازت۔

☆: پیاری سی ماریہ! تمہارا خط اگر ملتا تو ضرور شائع کیا جاتا ڈاک کا نظام تو روز بروز زوال پذیر ہے کیا کریں۔ ناولٹ میں تھوڑا سا ٹائم لگتا ہے۔ میں انشاء اللہ جلد تمہیں آگاہ کروں گی اور اتنی جلدی مایوس مت ہوا کرو، ڈٹی رہو۔

✉: یہ آمد ہے نگہت غفار کی کراچی سے، لکھتی ہیں پیاری سی رضوانہ جی امید ہے معہ فیملی اور دوشیزہ فیملی کے آپ بخیر ہوں گی۔ ہم اکبر بھائی (ہاکر) کو فون کر کر کے میسج کر کر کے پریشان کرتے رہے اور آخر میں تنگ آ کر بیٹے کو بک اسٹال بھیج ہی دیا۔ فہد اپنی ساری مصروفیت چھوڑ کر رسالہ لے آئے۔ ٹائٹل موسم کی مناسبت سے اچھا لگا۔ 'پروٹوکول' جیتی رہو سلامت رہو منزہ! بیٹا جی بالکل سچ لکھا ہے خدا کرے، ہم سب سنجیدگی سے اس تحریر کو پڑھیں اور سمجھ کر عمل کریں تو ایسے پروٹوکول سے ہم سب کو نجات مل جائے گی۔ دوشیزہ کی محفل پڑھنے پر علم ہوا کہ یسمارضا کی ہمشیرہ کی رحلت ہوئی، بے حد دکھ ہوا اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے دربار میں اعلیٰ مقام سے نوازے اور اہل خانہ وعزیز واقارب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ہم اور ہمارے مہمان دیکھ کر، پڑھ کر خوشی ہوئی پھر سوچا ارے یہ وہی (انویٹیشن) کا ذکر جس کے بارے میں میری (بہو) طیبہ (نزہت کی بیٹی) نے ٹیلیر سے آ کر مجھ سے پوچھا تھا کہ خالہ ممی دوشیزہ سے آپ کو انویٹیشن ملا تو میں نے کہا نہیں تب وہ بولی امی نے مجھ سے پوچھا کہ خالہ ممی کو دوشیزہ سے انویٹیشن ملا کیا؟ تو طیبہ نے نزہت کو جواب دیا

کہ وہ تو آپ سے پہلے مل گیا ہوگا کیونکہ خالہ ممی کا رابطہ اُن سے رہتا ہے فون پر بھی اور میسج پر بھی۔ انہوں نے آپ سے پہلے خالہ ممی کو فون کر دیا ہوگا۔ میں نے طیبہ کی بات سن کر کہا ہو سکتا کل پرسوں آ جائے...... مگر...... بہرحال آپ سب کو دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ بہت ہی زیادہ اچھا، آج مجھے اس بات پر لگا جب منزہ بیٹی سے بہت دیر بات ہوئی اور انہوں نے بہت ہی خلوص اور محبت سے مجھے چائے پلوانے کی آفر کی، اللہ تعالیٰ اُن کی عمر دراز کرے صحت اور کامیابی نصیب کرے، آمین۔ گل کے بارے میں پڑھ کر بہت دکھ ہوا اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے آمین۔ افسانے سالگرہ محبت' اب کے برس' سہانی خوشی بس یہ ہی افسانے پڑھے اچھے لگے۔ دوشیزہ گلستان میں معصومہ رضا' ریحانہ مجاہد' رضوانہ کوثر' یاسمین رضا' ایلا رمضان کے انتخابات پسند آئے۔ نئے لہجے نئی آوازیں میں سویرا خالد' فرح اسلم' شعبان کھوسہ' شمسہ قمر کے کلام پسند آئے۔ اب اجازت چاہتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ رب کریم ہم سب پر اپنی رحمتوں کی چادر تان دے ہم سب اُس کے رحمتوں کے حصار میں رہیں، آمین۔

☆: نگہت جی اداریہ پسند کرنے کا شکریہ! انشاء اللہ تعالیٰ جلد دوبارہ اپنے رائٹرز کی محفل سجائیں گے اور آپ کو بھی مدعو کریں گے۔

✉: کراچی سے ہنستی مسکراتی آئی ہیں شگفتہ شفیق، لکھتی ہیں۔ کیسی ہو پری۔ نئے سال کا جنوری کا دوشیزہ بے حد پسند آیا۔ چاہے بات دوشیزہ کی محفل کی ہو یا باتیں ملاقاتیں کی۔ ہر رنگ دلچسپ اور محبتوں کی خوشبو سے مہکتا ہوا اور روشنیوں سے جگمگاتا ہوا ہے۔ رفعت سراج کے ناول کے فقرے، اُن کی چٹکیلی باتوں کو یاد کرا گئے جو کہ باربی کیو ٹو نائٹ میں سماعتوں میں رس گھول رہے تھے۔ سارے افسانے اچھے تھے لیکن ہم کو آج کل کی حقیقت سے جڑا افسانہ۔ بہنا او بہنا۔ بے حد اچھا لگا کہ آج کل اس رشتے میں بھی بے حد چالاکیاں اور سفاکیاں در آئی ہیں۔ صرف اپنا ہی مفاد سب کے پیش نظر رہتا ہے چاہے وہ خونی رشتے ہی کیوں نہ ہوں۔ سباس کے ناول کی اگلی قسط کا انتظار ہے۔ اب کے برس' پرانی تھیم پر لکھا ہوا افسانہ تھا' بہرحال سبق آموز تھا۔ سہانی خوشی میں بالکل سچ لکھا گیا ہے۔ ہے بہار منتظر۔ افسانہ بھی اچھا لگا۔ سالگرہ محبت بھی پسند آیا۔ ڈاکٹر اقبال ہاشانی نے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ ہم اور ہمارے مہمان۔ تو بہت ہی پیارا اور اچھا لگا اور خوبصورت یادیں تازہ کر گیا۔ شائستہ عزیز نے بہت ہی خوب تقریب کے تاثرات لکھے۔ فرح اسلم قریشی اور سنبل کے تاثرات پڑھ کے ساری تقریب آنکھوں میں گھوم گئی غرض کہ اس بار ایک بھرپور میگزین پڑھنے کو ملا۔ اپنی نظم بھی اچھی لگی دوشیزہ میں شائع ہو کر۔ تھینکس۔ اب اجازت دو۔ اللہ حافظ۔

☆: عزیز از جان شگفتہ! آپ مجھے پری لکھتی ہیں، پڑھنے والے پری کی طرح ہی نازک سمجھتے ہوں گے۔ کیوں ان کے دل کو دھچکا دینے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ ماریا یاسر کا افسانہ آپ کو اچھا لگا یہ یقیناً ماریہ کے لیے بہت حوصلہ افزا بات ہے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بہت ضروری ہوتی ہے۔ غزل زبردست ہے جناب جلد ہی شائع ہوگی۔

لیجیے ساتھیو! اس ماہ تک کی ہماری آپ کی ملاقات اپنے اختتام کو پہنچی۔ اس ماہ کا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ اگلے ماہ مجھے آپ کی آراء کا شدت سے انتظار رہے گا۔

اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ اگلے ماہ ان ہی صفحات پر ملاقات ہوگی۔ اللہ نگہبان۔

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام

ملنے کے نہیں.....نایاب ہیں ہم

دوشیزہ کی سینئر لکھاری ''گل'' کی یاد میں مصنفہ کی کچھ یادیں

ملنے کے نہیں...... نایاب ہیں ہم
گل کی یادیں
دوستو! اُس کی باتیں کریں
گل جو ہم میں تھا اور آج ہم میں نہیں
زندگی کے کسی بیش وکم میں نہیں
گل رخصت ہو گئیں۔

میرے شوہر نے پوسٹ مین سے رسالہ لے کر کھولا اور یوں ہی اوراق پلٹتے آواز دی۔
''دیکھنا یہ کس گل کا ذکر ہے؟''
میں نے رسالہ لے کر دیکھا، لکھا تھا۔ ''اب گل بھی یادرفتگاں ہوئیں۔..... یا خدا یہ کیا ہوا۔
اناللہ وانا علیہ راجعون دل دکھ میں ڈوب گیا۔
سپیدہ چہرہ، حسین متن سہج سہج بولنے والی حساس دل انسان اور لکھاری گل (مرحومہ) کو آخری سلام پہنچے۔ (میں نے آج ہی 8 جنوری صلوٰۃ تسبیح پڑھ کر گل کو ثواب بخشا ہے)
وہ بہت پیاری ہستی تھیں۔ میری اُن سے آخری بار بات گزشتہ ایوارڈ تقریب سے پہلے ہوئی۔ وہ فون اپنے پاس رکھتی تھیں صحت بہتر ہوتی تو بات کر لیتی تھیں۔
اُن سے کچھ اور بھی تعلق تھے وہ اپنے میجر فرزند اور بہو کے ہمراہ میرے گھر بھی آئی تھیں ایک رات قیام کیا تھا۔ بھوربن میں اُن کے پہاڑی کاٹیج میں، میں اپنی بہن اور بچوں سمیت جا کر رہی تھی۔ میرے بچے ان کو نہیں بھولے۔ انہوں نے محبت اور عزت دی میں اُن کی فراخ دلی اور شفقت نہیں بھولوں گی۔
میری بیٹی دُریہ کو پنجاب یونیورسٹی سے بہترین کہانی لکھنے پر ایوارڈ ملا تقریب اسلام آباد میں تھی۔ تب دانیال اور دریہ (بنٹی) دونوں لاہور پڑھتے تھے۔ تقریب کے لیے دونوں نوعمر بھائی بہن لاہور سے راولپنڈی ڈائیو سروس سے روانہ ہوئے۔ بے حد دھند اور سردی کی رات تھی۔ دھند کے سبب بس معمول سے تاخیر سے پہنچی پنڈی میں انہیں گل آنٹی کے ہاں قیام کرنا تھا جب تک بچے نہ پہنچے فون کے ایک سرے پر مظفر گڑھ میں، میں جاگ رہی تھی اور دوسرے سرے پر گل بچوں کے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔ اُن کا ڈرائیور گاڑی لے کر ٹرمینل پر انتظار کر رہا تھا۔ گیارہ بارہ بجے یہ لوگ پہنچے۔ انہیں دعا سلام کھانا دے کر وہ سونے گئیں۔
اللہ تعالیٰ گل پر اپنی رحمتوں کے سدا بہار پھول برسائے۔ میں اچھے لوگوں کو کبھی نہیں

بھولتی۔ میں نے اُن کی کتاب 'رانجھن یار طبیب سینڈا' پر لکھا تھا۔ وہ سچا اظہار یہ تھا۔

اُن کی کتاب 'مرغابیاں اور کنول' پر میرا لکھا ہولڈ دیباچہ لگا ہوا ہے وہ بھی کبھی ادبی رسالوں میں بھی لکھتی تھیں۔

میں نے بھوربن والے گھر میں اُن کی تصویریں دیکھی تھیں۔ بلاشبہ وہ حسین وجمیل لڑکی رہی ہوں گی۔ اُن کو بیماریوں نے لاچار کردیا وہ اب بھی گریس فل تھیں۔ آسیہ اعوان نے درست کہا اتنے زندہ دل انسان کو اس قدر بیمار جسم نہیں ملنا چاہیے تھا۔

وہ دھیرے دھیرے سلگتی عود کی اگربتی تھیں۔ جس کی مہک پھیلتی رہی اور وہ گھل گئیں۔ معلوم نہیں اُن کے شوہر اب کیسے رہتے ہوں گے۔

جب مئی 1993ء میں میری امی جی کا انتقال ہوا تھا۔ اور جون کا رسالہ آیا تھا۔ رنگین چمک دار کور والا، زندگی سے بھرپور رسالہ بہت عجیب سا لگا تھا کہ دنیا رواں دواں ہر دم جوان رہتی ہے۔ سیما غزل کو میں نے کہا تھا۔ میں اندر سے مرگئی ہوں۔ مجھے رسالہ نہ بھیجا کرو۔ سیما غزل نے تشفی کا خط لکھا تھا۔ وقت نے بتایا کہ مرتے ہم صرف اپنی باری پر ہیں مگر اندر سے بار بار مرتے ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا گل کا پُرسہ کس کو دوں۔ فرزانہ آغا کا نمبر حسب دستور بند ملا...... تمام لکھاری بہنوں اور بھائیوں کو گل کا پرسہ ہو اور مجھے بھی ہو......

دیکھ لی دل نے بے ثباتی گل
پھر طلسم بہار ٹوٹ گیا

اللہ تبارک وتعالیٰ گل مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ دعا ضرور کیجیے۔

☆☆......☆☆

غزل

جو ریت پر بنے تھے گھروندے اُجڑ گئے
کتنے حسین خواب تھے لیکن بکھر گئے

سب دیکھتے رہے ہمیں چپ چاپ اک طرف
دریا محبتوں کے چڑھے اور اُتر گئے

ہم نے تو اُن کی راہ میں پلکیں بچھائی تھیں
لیکن وہ روند کر یہ نگاہیں گزر گئے

اشکوں نے اور حسن کو بخشی ہے تازگی
عارض کھلے گلاب کی صورت نکھر گئے

خود کو فنا کرلیا، خود کو مٹالیا
کچھ بات بھی نہیں تھی مگر وہ بگڑ گئے

اے کاش کوئی پوچھتا گزری تھی اُن پہ کیا؟
جینے کی جستجو میں جو چپ چاپ مرگئے

اپنی تو عمر اُن کی نذر ہوگئی تمام!
جو لوگ ہم پہ جینے کا الزام دھر گئے

پھر یوں ہوا کہ گل نے بھی رستہ بدل لیا
پھر یوں لگا کہ جیسے مقدر سنور گئے

(گل کی ایک یادگار غزل)

دوشیزہ کی سینئر لکھاری ''گُل'' کی یاد میں مصنفہ کی کچھ یادیں

خبر نہ پائی پھر اُس کی کدھر گیا وہ شخص
کہ شہرِ دل کو تو ویران کر گیا وہ شخص
گل آج اُس کے لیے سوگوار بیٹھی ہے
اُسے خبر ہی نہیں کب کا مر گیا وہ شخص

گل کو اس دنیا سے رخصت ہوئے آج شاید پندرہ یا اس سے زیادہ دن ہو گئے ہیں اور مجھے بار بار گل کے اپنے ہی یہ شعر یاد آ رہے ہیں۔ میں تو گل سے ملنے کے پروگرام ہی بناتی رہی اور گل چلی بھی گئی اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی۔ جب بھی اُن سے بات ہوتی تو پروگرام بنتا کہ ان چھٹیوں میں ضرور آپ کی طرف آؤں گی۔ تین سال سے یہ پروگرام بن رہا تھا کہ چھٹیوں میں مل بیٹھیں گے۔ ڈھیروں باتیں کریں گے۔ لیکن تین سالوں سے مجھے چھٹیوں میں لاہور جانا پڑ رہا تھا یوں پروگرام بن بن کر رہتا رہا لیکن اس بار میں نے خود سے عہد کر رکھا تھا کہ ان چھٹیوں میں (دسمبر کی) میں انشاء اللہ ضرور گل سے ملنے جاؤں گی کیونکہ وہ بہت بیمار تھیں۔ اُن کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ دو بار تو بالکل جاتے جاتے رہ گئی۔ اُن کی وفات سے تقریباً پندرہ بیس دن پہلے میں نے انہیں فون کیا تو اُن کی بیٹی رعنا نے فون اٹینڈ کیا انہوں نے بتایا تھا کہ اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ کچھ دیر بعد اُن سے میری بات کروائیں گی۔ لیکن میں نے منع کر دیا کہ انہیں ڈسٹرب نہ کریں۔ میں خود ہی پھر کسی روز کر لوں گی۔ لیکن پھر جب بھی فون کرنے لگتی۔ تو یہ خیال روک دیتا کہ کہیں وہ سو نہ رہی ہوں۔ بے آرام نہ ہو جائیں۔ کئی بار چند نمبر ملا کے چھوڑ دیا اور ہر بار عہد کیا کہ دسمبر کی چھٹیوں میں انشاء اللہ جانا تو ہے۔ جانے سے پہلے فون کروں گی۔ میں عموماً رات کو ہی فارغ ہو کر فون کرتی تھی۔ لیکن پچھلے چند ماہ سے گل کی طبیعت کی خرابی کا خیال مجھے فون کرنے سے روک دیتا۔

پھر بھی کبھی کبھار دو چار منٹ کے لیے بات ہو جاتی تھی۔ آخری بار جب میری اُن سے بات ہوئی تھی تو میں نے اُن سے یہی کہا تھا کہ جیسے ہی موقع ملا اُن سے ملنے آؤں گی۔ خیال تھا کہ اگر کسی سنڈے کو فرصت کے لمحات میسر آ گئے تو دسمبر کی چھٹیوں سے پہلے ہی پروگرام بنا لوں گی۔ میں سوچتی رہی اور وقت میرے ہاتھوں سے پھسل گیا۔ کاش میں اُس روز رعنا کو منع نہ کرتی یا پھر اگر

منع ہی کر دیا تھا تو دوسرے روز انہیں فون کر لیتی۔ بہت عرصہ سے اُن کی طبیعت خراب چلی آ رہی تھی۔ اور مجھے یقین تھا کہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ اپنی بلند ہمتی اور حوصلے سے ان بیماریوں کو شکست دے دیں گی اور پھر کسی بہار کے موسم میں ہم سب ثمینہ، فرزانہ کسی ایک جگہ اکٹھے ہو کر وقت کے دامن سے کچھ خوبصورت لمحے چرا کر اپنا دامن بھر لیں گے۔ (یہ اُن کا پروگرام تھا کہ کسی روز ثمینہ کے، میرے یا اُن کے گھر سب اکٹھے ہوں) یہ تیرہ دسمبر تھا یا شاید چودہ ثمینہ افتخار کے فون نے مجھے چونکایا ہی نہیں تھوڑا سا خوفزدہ بھی کر دیا کہ کچھ عرصہ سے ثمینہ سے میرا رابطہ عید اور کچھ خاص موقعوں پر میسج تک ہی محدود ہو کر رہ گیا تھا۔

سو ثمینہ کے فون سے مجھے فوراً گل کا خیال آیا۔ یا اللہ خیر میرے لبوں سے نکلا اور میں نے بے اختیار ثمینہ سے پوچھا۔

"خیریت ہے۔" ثمینہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گئیں۔

"تمہیں گل کے متعلق پتا ہے۔" اس نے پوچھا۔ میرا دل ڈوب سا گیا۔

"نہیں...... کیا ہوا......" میں نے پوچھا لیکن دل اندر کہیں کسی انہونی کا احساس تکلیف دے رہا تھا۔

اور جب ثمینہ نے بتایا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہیں اور انہیں اِس دنیا سے رخصت ہوئے تو دس دن سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ غالباً تین دسمبر کو...... اور میں ثمینہ سے گلہ بھی نہ کر سکی کہ انہوں نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی۔ انہوں نے خود ہی بتایا کہ انہیں گیارہ بجے پتا چلا تھا اور دو بجے جنازہ تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ میں جنازے تک پہنچ سکوں گی۔ لیکن شاید پہنچ ہی جاتی۔ کوشش تو کر ہی سکتی تھی، پہنچنے کی، آج کل اسلام آباد تک یہاں سے اڑھائی تین گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ شاید اللہ کو ہی منظور نہیں تھا۔ ورنہ فرزانہ آغا ہی فون کر دیتیں وہ تو وہاں ہی تھیں۔ اسلام آباد میں لیکن شاید اُن کے پاس اب میرا نمبر نہ ہو۔ اُن سے بھی تو پانچ چھ سال پہلے بات ہوئی تھی۔ یا شاید اس سے بھی پہلے غالباً 2008 میں...... اور 2008ء میں ہی گل سے میری آخری ملاقات ہوئی تھی۔ ہمیں اسلام آباد برٹش ایمبیسی میں جانا تھا۔ کام سے فارغ ہو کر میں نے انہیں فون کیا اور پھر تقریباً دس گیارہ بجے میں اُن کے گھر گئی۔ میرے ساتھ میری ایک کولیگ اور بھیجی تھیں۔ قدسیہ گھر پر نہ تھی۔ یہ ملاقات مختصر سی تھی اور پھر ان گزرے سات سالوں میں کئی بار پروگرام بنا کبھی میرا کبھی گل کا لیکن......

گل سے دوستی کا رشتہ اٹھارہ سالوں پر محیط ہے۔ اٹھارہ سال قبل گل سے پہلی ملاقات دوشیزہ کی ایوارڈ تقریب میں ہوئی تھی۔ اس ملاقات سے پہلے فون پر دو تین بار بات ہو چکی تھی۔

پھر چند ماہ بعد گل اور ثمینہ افتخار مجھ سے ملنے آئیں یوں دوستی کا رشتہ استوار ہوا اس کے بعد کئی بار ملاقات ہوئی۔ امی اور ابو کی ڈیتھ پر وہ ایک مخلص دوست کی طرف ثمینہ کی ہمراہی میں دکھ بٹانے آئیں۔

یہ رشتہ وقت کے ساتھ بہت گہرا اور مضبوط گل بہت پیاری، بہت مخلص اور بہت خالص اور بہت محبت کرنے والی تھیں۔ وہ رشتوں کو نبھانا جانتی تھیں۔ ہر رشتے سے اُن کی محبت بہت خالص تھی۔ بہت دھیمے اور نرم لہجے میں بات کرتیں۔ ہر ماں کی طرح انہیں بھی اپنے بچوں سے بہت محبت تھی لیکن اُن کی محبت میں طلب نہیں تھی وہ اپنے بچوں کے لیے سراپا دعا اور محبت ہیں۔ ماریہ فیصل اپنے ان دونوں بچوں کے لیے دکھی ہوتیں لیکن وہ بہت حوصلے اور ہمت والی تھیں وہ اکثر

رعنا کے بیٹے کے متعلق بات کرتے ہوئے رعنا کے لیے اُداس ہوجاتیں۔ اتنا حوصلہ اتنی ہمت میں نے بہت کم ہی کسی میں دیکھی ہے۔ انہوں نے بے شمار بیماریاں جھیلیں لیکن ہمت نہیں ہاری۔ جب پہلی بار وہ ہمارے گھر آئی تھیں تو اسٹک کے سہارے چل رہی تھیں۔ کیونکہ کچھ عرصہ پہلے ہی اُن کا آپریشن ہوا تھا۔ میں حیران رہ گئی تھی آپ اس طرح اس حالت میں...... وہ مسکرادیں۔

ثمینہ کے ساتھ پروگرام بن چکا تھا۔ سوچا اب کیا کینسل کروں۔ مل بیٹھ کر خوب باتیں بھی کریں گے۔ میرے دل میں اُن کے لیے جو جذبات ہیں انہیں بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا کیا لکھوں کیا نہ لکھوں۔ وہ بہترین بیوی' بہترین ماں بہترین دوست تھیں۔ میں نے اُن جیسی دوست کوئی نہیں پائی۔ وہ ایک سچی کھری اور مخلص دوست تھیں۔ بے ریا' بے غرض اُن جیسے لوگ دنیا میں کم کم ہیں۔ اُن کی وفات کی اطلاع ملے بھی اب کئی روز ہوگئے ہیں لیکن ابھی تک دکھ کے اس حصار سے باہر نہیں نکل پائی ہوں۔ دو تین بار قلم اٹھایا لیکن پھر کچھ نہ لکھ سکی۔ کیا لکھوں کہ میں تو اتنے سالوں سے انہیں ملنے بھی نہ جاسکی تھی۔ وہ میری مجبوری سمجھتی تھیں۔ کہتی تھیں چلو کوئی بات نہیں میری طبیعت ٹھیک ہوگی تو میں ملنے آجاؤں گی وہ ایک اچھی شاعرہ اور اچھی افسانہ نگار تھیں۔ انہوں نے جو کچھ لکھا بہت خوبصورت لکھا۔ شاعری کے دو مجموعے اور افسانوں کے تین مجموعے چھپے۔

اگرچہ انہوں نے زیادہ دوشیزہ کے لیے لکھا اور خوب لکھا۔ وہ دوشیزہ کے رائٹرز اور قارئین کو اپنی فیملی کہتی تھیں۔ اُن کی شخصیت کی ایک اور خوبی جو مجھے بہت متاثر کرتی وہ اُن کی وطن سے محبت تھی۔ وہ میری طرح ہی متعصب پاکستانی تھیں۔ وطن کے حوالے سے جب بات ہوتی تو وہ جذباتی ہوجاتیں اور ہمیں وطن کے حوالے سے بات کرتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔ اُن کی تحریروں میں بھی وطن سے محبت کا جذبہ جھلکتا ہے۔ وہ کہانی ہو یا شاعری۔

شروع شروع میں جب گل کی طبیعت ٹھیک تھی تو ہم فون پر اکثر ایک دوسرے کو نظمیں اور غزلیں سناتے تھے۔ اُن کی شخصیت سادگی اور پرکاری کا خوبصورت امتزاج تھی۔ اُن کی ایک غزل کے چند اشعار......

آنکھ میں چبھنے لگی ہے اب یہ بینائی مجھے
زندگی کس موڑ پر آخر تو لے آئی مجھے
سینکڑوں حصوں میں دیکھو بٹ گیا مرا وجود
کس قدر مہنگی پڑی اُن سے شناسائی مجھے
جی میں آتا ہے کہ پھر جاکر منالوں ایک بار
روک دیتی ہے مگر یہ آبلہ پائی مجھے

گل کی شخصیت میں کیا نہیں تھا۔ کیا لکھوں چند ملاقاتیں فون کالز اور بے شمار یادوں کا ایک ہجوم ہے اور میں ہوں۔ کیا کہوں گل بہت پیاری تھی۔ مجھے ہی کیا سب ملنے والوں کو...... اللہ سے بھی اُن کا تعلق بہت گہرا تھا۔ کیا آج کل کے دور میں ایسے انسان ملتے ہیں شاید بہت کم۔

وہ ہمیشہ کے لیے سب کو جدائی کا دکھ دے کر چلی گئیں۔ ماریہ اور فیصل اب کس سے دل کی باتیں کہیں گے کون انہیں حوصلہ ہمت اور تسلی دے گا۔

اللہ اُن کے بچوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

اور اُن سے وابستہ تمام رشتوں کو اُن کی جدائی کا غم سہنے کا حوصلہ دے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور اُن کے درجات بلند کرے آمین۔

☆☆......☆☆

اداکار، پروڈیوسر

ذیشان فراز

دوشیزہ کے پڑھنے والوں کی فرمائش پر آج آپ کی خدمت میں شہریار منور صدیقی کا انٹرویو پیش کیا جارہا ہے۔ مجھے بے شمار خطوط موصول ہوئے جس میں لوگوں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ اس نووارد ہیرو کا انٹرویو شائع کریں جو آتے ہی چھا گیا...... یہ الگ بات ہے کہ بیشتر خطوط خواتین کے تھے...... تو جناب آپ کی خواہش پر شہریار کے ساتھ ایک خوبصورت شام۔

ہم: شہریار آپ خواتین میں بہت مقبول ہیں کیا یہ بات جانتے ہیں؟

شہریار: ہنستے ہوئے، میں اُن کا شکریہ ہی ادا کرسکتا ہوں۔

ہم: اچھا یہ بتائیں آپ کا اسٹار کیا ہے؟

شہریار: جی میں Leo ہوں 9 اگست 1988ء کو کراچی میں پیدا ہوا۔

ہم: کیسے بچے تھے بہت شیطان یا بہت نیک؟

شہریار: (کچھ سوچتے ہوئے) نہیں، بہت شیطان بھی نہیں تھا اور بہت نیک بھی...... بس جیسے سب بچے ہوتے ہیں۔ گھر میں سب کو Rules Follow کرنے ہوتے ہیں۔

ہم: اچھا یہ بتائیں کہ آپ کتنے بہن بھائی ہیں؟

شہریار: جی ہم تین بھائی اور ایک بہن تھے...... میرے بڑے بھائی اسفند کی 2012ء میں کار ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہوگئی تھی۔

ہم: اوہ یہ تو بہت بڑا شاک ہے آپ کی فیملی کے لیے؟

شہریار: جی بہت بڑا شاک، ہم سب اپنے آپ کو اب تک یقین ہی نہیں دلا پائے کہ وہ اب ہم میں نہیں، مگر اپنے والدین کے لیے اپنے آپ کو سنبھالتے ہیں وہ آل ریڈی بہت دکھی ہیں، خیر سو پلیز Continue زندگی نام ہی مشکلات کا ہے۔

ہم: شہریار پڑھائی میں کیسے تھے امی کو ڈنڈا لے کر تو پیچھے نہیں دوڑنا پڑتا تھا؟

شہریار: ارے نہیں بھئی اب ایسا بھی نہیں تھا ٹھیک ہی تھا۔ والد ایئرفورس میں تھے ہر کام روٹین میں ہوتا تھا۔ میرے والدین ہر چیز پر نظر رکھتے تھے۔ ٹیچرز سے بھی رابطے میں رہتے تھے ایسے میں بچوں کے پاس پڑھنے کے علاوہ کوئی اور آپشن ہوتا بھی نہیں، ویسے میں نے اے لیول South Shore سے کیا اور پھر IBA کراچی سے فنانس میں ڈگری لی۔

ہم: IBA؟ پھر تو آپ بہت اچھے اسٹوڈنٹ تھے؟

شہریار: سر جھکا کر مسکرانے پر اکتفا کیا۔

ہم: خواتین آپ کو بہت پسند کرتی ہیں اور آپ کس کو پسند کرتے ہیں؟

شہریار: (کانوں کو چھوتے ہوئے) فینز تو سب کو اچھے لگتے ہیں لیکن ابھی مجھے بہت کام کرنا ہے لہٰذا نو Diversions۔

ہم: آپ نے پہلا ڈرامہ میرے درد کو جو زبان ملے کیا تھا؟

شہریار: جی بالکل میرا پہلا ڈرامہ تھا ہم ٹی وی سے نشر ہوا۔ جس میں میں نے گونگے بہرے لڑکے کا کردار ادا کیا تھا۔ اور اسی پر مجھے ہم ایوارڈ ملا۔

ہم: شہریار یعنی آپ نے شوبز میں قدم ڈراموں سے رکھا؟

شہریار: ویسے تو 2012ء میں ڈرامہ انڈسٹری میں قدم رکھا مگر اس سے پہلے تھیٹر بھی کیا اور ماڈلنگ بھی، بعد میں ڈرامے میں آیا۔

ہم: اس کے بعد زندگی گلزار ہے کیا اس میں آپ کا رول بہت پازیٹو تھا کیسا لگا؟

شہریار: زندگی گلزار ہے سے پہلے میں نے تنہائیاں نئے سلسلے، کہی ان کہی کیا بعد میں آسمانوں پہ لکھا اور دو قدم دور تھے کیے، جہاں تک رول کا تعلق ہے تو میرا رول ایک پڑھے لکھے لبرل سے لڑکے کا تھا جو by Force کوئی رشتہ نہیں بنانا چاہتا۔

ہم: کیا ہمیشہ سے یہ سوچ رکھا تھا کہ شوبزنس کو Profession بنائیں گے۔

شہریار: اصل میں سلطانہ صدیقی میری آنٹی ہے انہوں نے میرا پلے دیکھا اور وہ مجھے اس فیلڈ میں لانے والی ہیں۔

ہم: چھٹیاں کہاں گزارنا پسند کرتے ہیں؟

شہریار: بہت ساری جگہیں ہیں لیکن مجھے بیروت بہت پسند ہے۔

ہم: آپ جب فری ہوتے ہیں تو کیا کرتے ہیں؟

شہریار: مجھے سونگز سننا پسند ہے مگر صرف انگلش اور اس کے علاوہ فیملی کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا ہے۔

ہم: آگے کیا ارادے ہیں؟

شہریار: پچھلے دنوں تو میں فلم میں بزی رہا مگر میرا ٹارگٹ پہلے تعلیم پوری کرنا ہے لہٰذا جلد ہی میں ماسٹرز کے لیے باہر چلا جاؤں گا۔ فی الحال تو یہی پلان ہے۔

ہم: آپ نے فلم ہومن جہاں پروڈیوس کی کیسا تجربہ تھا۔

شہریار: بہت اچھا تجربہ تھا لیکن بہت Time Consuming ہے۔ بٹ ٹیم بہت اچھی تھی بہت مزہ آیا۔

ہم: آپ نے خود تو بہت لائٹ مووی پروڈیوس

کی ذاتی زندگی میں کیسی فلمیں پسند کرتے ہیں؟

شہریار: آف کورس! کہانی ہو کاسٹ پسند کی ہو مجھے Leonardo Dicaprio اور Christain Bale کی ہر فلم اچھی لگتی ہے۔

ہم: اور ہیروئن؟

شہریار: Scarleet Johansson اور

یہ میرے لیے بہت بڑا آنر ہے۔

ہم: شہریار آپ کا بہت شکریہ آپ نے اپنا قیمتی وقت دیا۔ امید ہے کہ جلد آپ کو کسی نئے پراجیکٹ میں دیکھیں گے۔

یوں یہ ملاقات تمام ہوئی شہریار منور بہت اچھا آرٹسٹ ہے۔ پروڈیوسر ہے پرسنیلٹی ہم سب کے

جینفر لارنس بہت پسند ہیں۔

ہم: لباس کون سا پسند کرتے ہیں؟

شہریار: جینز اور ٹی شرٹ، فارمل میں سوٹ۔

ہم: شہریار اپنے پڑھنے والوں کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

شہریار: (ہنستے ہوئے) پیغام تو نہیں لیکن Thanks کرنا چاہتا ہوں لوگ مجھے پسند کرتے ہیں

سامنے ہے۔ بہت گڈ لکنگ مگر ایک بات جو شاید بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ بہت Humble اور منکسر المزاج ہے۔ اچھی تربیت اور ایک مکمل گھر اُن کی شخصیت سے پوری طرح جھلکتا ہے۔ اگر ہماری ڈرامہ اور فلم انڈسٹری میں چند لوگ اور ایسے آجائیں تو ہم یقیناً بہت آگے نکل جائیں گے۔

☆☆......☆☆

ماھرہ خان

خوبصورت اور ورسٹائل اداکارہ

مونی خان

ماہرہ 21 دسمبر 1982ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ یونیورسٹی آف کیلی فورنیا سے تعلیم حاصل کی مگر نامکمل چھوڑ دی۔ دوران تعلیم ماہرہ نے وہ تمام کام کیے جو آج کل کے نوجوان اپنے ملک میں رہتے ہوئے سوچ بھی نہیں سکتے۔ صفائی کرنا' کچرا سمیٹنا' رجسٹر پر کھڑے ہونا غرض سخت محنت والے کام' 16 سال کی عمر میں اپنے بچپن کے دوست جو کیلی فورنیا میں بھی ساتھ تھے۔ علی عسکری سے 2007ء میں شادی کی۔ شادی کے بعد بیٹا پیدا ہوا

اذلان مگر افسوس اب یہ شادی دیگر شوبز کی شادیوں کی طرح ٹوٹ چکی ہے۔ ماہرہ نے پہلی فلم بول کی پھر بن روئے اور اب ہومن جہاں...... ڈرامہ سیریل ہمسفر میگا ہٹ ثابت ہوا۔ جس نے ماہرہ کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچادیا۔ اس کے بعد شہرذات اور پھر صدقے تمہارے ماہرہ نے لکس اسٹائل ایوارڈ حاصل کیا۔ ماہرہ بولی وڈ کنگ شاہ رخ خان کے ساتھ فلم 'رئیس' میں بھی آرہی ہیں۔ خوبصورت چہرے والی ہماری اس اداکارہ کا شمار ایشیا کی چارمنگ خواتین کی لسٹ میں دسویں نمبر پر ہوتا ہے۔ ماہرہ خان نے کئی کمرشلز بھی کیے اس کے علاوہ فیشن شوز اور اسٹیج پلے بھی، ورسٹائل اداکارہ آج کل ہومن جہاں کی کامیابی پر پھولے نہیں سما رہی ہیں۔

☆☆☆

محمد ریاض اعوان

بزنس انڈسٹری کا درخشاں ستارہ

محمد اقبال زمان

وقت بہت تیز رفتار ہے اور کامیاب وہ ہے جو اپنی زندگی میں وقت کی لگامیں اپنے ہاتھ میں لے لے اور وقت کو اپنے مطابق چلائے۔ کامیابی اُن ہی کے قدم چومتی ہے جو اپنے وقت کا صحیح استعمال جانتے ہیں۔ وقت کی قدر کرتے ہیں اور زندگی کو جہدوجہد کے راستے پر گامزن کرتے ہوئے ترقی کی منزل پر جا پہنچتے ہیں ۔شہر کراچی جسے ہم منی پاکستان بھی کہتے ہیں۔اپنے دامن میں ایسے ایسے انمول رتن رکھتا ہے جو اپنی مثال آپ ہیں۔کامیابی کا تاج اپنی محنت سے اپنے سر پر سجانے والوں میں بزنس انڈسٹری کی دنیا کا ایک اہم نام محمد ریاض اعوان بھی ہے۔ محمد ریاض اعوان صاحب تولیہ بزنس انڈسٹری میں ملک اور بیرون ملک اپنی ایک خاص پہچان رکھتے ہیں۔گذشتہ دنوں قارئین دوشیزہ کے لیے ہم نے محمد ریاض اعوان صاحب سے ایک خصوصی ملاقات کی۔آیئے قارئین! آپ کے روبرو اس ملاقات کا احوال پیش کرتے ہیں۔
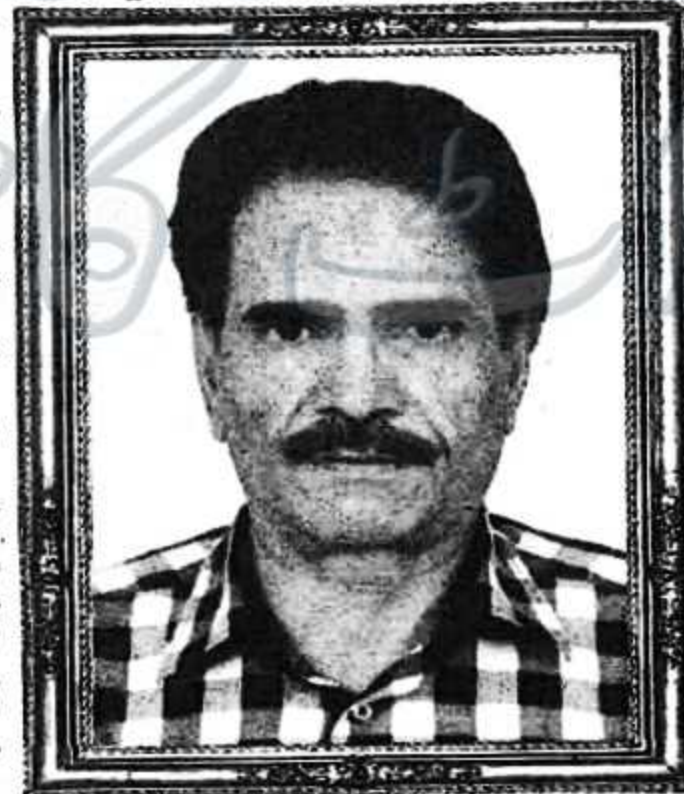
س: آپ کا پورا نام کیا ہے؟

ج: محمد ریاض اعوان۔

س: کچھ اپنے بچپن کے بارے میں بتایئے؟

ج: میں 1953 میں مانسہرہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں جس کا نام مہر اَمجد علی ہے وہاں پیدا ہوا۔اور اس گاؤں کا نام میرے نانا نے رکھا تھا۔یہ مانسہرہ کے دو پہاڑوں کے درمیان ایک جگہ ہے،جس کا نام مہر امجد علی ہے۔

س: تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

ج: میں نے ابتدائی تعلیم مانسہرہ کے ایک گاؤں

اطر شیشہ سے حاصل کی اور اس زمانے میں اپنے گاؤں اطر شیشہ سے تقریباً 5 کلومیٹر پیدل چل کر صبح اسکول آتا تھا اور شام کو 5 کلومیٹر پیدل سفر کر کے گھر واپس جاتا تھا۔

س: تعلیمی زندگی کیسی گزری؟

ج: اسکول اور کالج میں بہت شرارتیں کرتے تھے۔ اسکول ٹیچر ہو یا کالج کے پروفیسرز سے کبھی نہیں بنی۔

س: بزنس مین بننے سے پہلے کوئی اور فیلڈ اپنائی؟

رہا ہے اور کوئی نیا ایکسپورٹر کام کرنے کو تیار نہیں۔ ہمارے بعد جو ملک آزاد ہوئے وہ ہم سے آگے نکل گئے ہیں۔

س: آپ کا اسٹار کیا ہے؟

ج: Aries (برج حمل)

س: آپ کو موسیقی پسند ہے؟

ج: جی ہاں بالکل! موسیقی تو روح کی غذا ہوتی ہے۔

س: کیسا میوزک پسند کرتے ہیں؟

ج: مجھے پرانے گانے پسند ہیں۔ محمد رفیع اور لتا

ج: تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایئر فورس جوائن کی اور پھر کچھ عرصے بعد بزنس کرنا شروع کیا۔

س: بزنس کا شوق کیسے ہوا؟

ج: بزنس مین ہمیشہ میرے آئیڈیل ہوا کرتے تھے اور شروع سے ہی معاشیات میرا پسندیدہ سبجیکٹ تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ پاکستان میں بڑے بڑے سرمایہ کاروں میں ہمارا نام ہے۔ حکومت کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے ہمارا بزنس دن بدن کم ہو

میرے پسندیدہ گلوکار ہیں۔

س: پھر تو آپ کو فلمیں بھی پسند ہوں گی؟

ج: (مسکراتے ہوئے) دنیا بھر میں تفریح کا یہی ایک سب سے آسان ذریعہ ہے۔ ظاہر ہے میں بھی اسی دنیا میں رہتا ہوں۔

س: آپ کے پسندیدہ اداکار کون سے ہیں؟

ج: میں صرف محمد علی سے متاثر ہوں۔ وہی میرے پسندیدہ اداکار تھے۔

س: آپ نے کئی ملکوں کے دورے کیے کون سا پسند آیا؟

ج: مجھے سب سے اچھا آسٹریلیا لگا، جہاں کے لوگ بھی بہت اچھے ہیں۔ اوراس ملک کے مقامات بھی اچھے ہیں۔

س: آپ اپنے گھر والوں کو کتنا وقت دیتے ہیں؟

ج: کوئی بزنس مین اپنے گھر والوں کو وقت نہیں دے سکتا ہے کیونکہ بزنس مین کا زیادہ تر وقت سفر میں گزرتا ہے۔ روزمرہ 10 فیصد ہی گھر والوں کو ملتا ہے۔

س: ادب کے حوالے سے آپ کیا کہتے ہیں۔ آج اور کل میں کیا تبدیلی محسوس کرتے ہیں؟

ج: اردو ادب اب پہلے کے مقابلے میں دن بدن ختم ہو جارہا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا اور انٹرنیٹ نے اردو ادب کو ختم کر دیا ہے اور جو خبر ہم اخبار میں پڑھنا چاہتے ہیں، وہ اب T.V پر چل رہی ہوتی ہے۔

س: ادب کے فروغ کے لیے کیا اقدامات ہونے چاہئیں؟

ج: کسی بھی قوم کی ترقی اس بات پر منحصر ہے کہ وہ قوم مطالعہ کی کس قدر شوقین ہے۔ لائبریریاں کسی بھی قوم کی ترقی کا Symbol ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں لائبریری کلچر ختم ہو چکا ہے۔ حکومت کی قائم شدہ لائبریریوں کی حالت دگرگوں ہے۔ عوام کو باشعور کرنا حکومت کا اولین فرض ہے۔ لائبریریوں کی تعداد بڑھانے کی ضرورت ہے اور لائبریریوں کی ازسرِنو تزئین و آرائش کی ضرورت ہے۔

س: پاک چین دوستی کے بارے میں بتائیں؟

ج: چین اچھا اور مخلص پاکستان کا دوست ہے اور موجودہ دور میں چین سے بہت ساری توقعات رکھتے ہیں اور پاکستان کے حالات بہتری کی طرف جائیں گے ایسی امید ہے۔

س: کھانے میں کیا پسند ہے؟

ج: کھانے میں ہمیشہ مرچ والا کھانا پسند ہے۔ جب تک تیز مرچ نہ کھاؤں مجھے نیند نہیں آتی اور خاص طور پر کانٹینیٹل فوڈ کو پسند کرتا ہوں۔

س: بزنس مین تو سنا ہے بہت پرہیزی کھانا استعمال کرتے ہیں تو پھر آپ......؟

ج: بھئی! بات یہ ہے کہ بزنس مین اپنے آپ کو ایک عام بندہ بھی تو خیال کرے تب ہی تو وہ زندگی کے تمام مزے حاصل کر سکتا ہے۔ اور یہ تو سب کو پتا ہے زندگی میں ذائقے کی اہمیت سانس کے جیسی ہے۔

س: فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟

ج: فارغ اوقات میں کتابیں اور جم جانا زیادہ پسند کرتا ہوں۔

س: زندگی کے وہ کون سے پل ہیں جو ہر پل یاد رہتے ہیں؟

ج: میری زندگی کے ویسے تو کئی قیمتی لمحات ہیں، جو اکثر یاد آتے ہیں۔ لیکن میں اپنی زندگی کا وہ عرصہ ہرگز نہیں بھول سکتا جو کہ میں نے پاکستان ایئر فورس میں گزارا۔

پاکستان ایئر فورس میں گزرا ہوا وقت مجھے بہت یاد آتا ہے۔ جس نے مجھے ایک راستہ دکھایا اور وہ آج تک مشعلِ راہ ہے۔

س: ہمارے قارئین کے لیے کیا پیغام دینا چاہیں گے؟ میرا قارئین کے لیے پیغام ہے کہ اپنے بچوں کو جس قدر ممکن ہو گولی اور ڈنڈے کی سیاست سے دور رکھیں۔

ہمارے شہر کراچی میں تعلیم کا معیار گر گیا ہے۔ اس روشنیوں کے شہر کو تعلیم کا مرکز بنائیں۔ زندہ اور ترقی یافتہ قوموں کی ترقی کا یہی راز ہے۔

☆☆......☆☆

لائف بوائے... رشتے مضبوط بنائے

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت سارے دکھ سکھ اور کامیابی کے راز پنہاں رکھتی ہیں

''مضبوط بال...... مضبوط رشتے...... بیسٹ ایور لائف، لائف بوائے شیمپو کے ساتھ۔''

ماڈل ماں بیٹی کے روپ میں بال لہرا رہی تھیں۔ مجھے یکدم سے کچھ یاد آیا۔ آنکھیں نم ہوئیں اور عکس دھندلے ہوتے ہوتے مجھے پیچھے لے گئے۔ بہت پیچھے......

صدائیں بازگشت بن کر میرے اطراف گونجنے لگیں۔

''شہزین! بیٹی کیا حلیہ بنایا ہوا ہے۔ پلیز چینج کرو حلیہ بچے!''

''بی بی جان! پلیز!''

''نو...... ہری اپ...... یہ لو نیو لائف بوائے شیمپو اور مجھے فوراً باتھ کے بعد گڈ بے بی بن کر دکھاؤ۔''

''بی بی جان!'' وہ منہ بسور کر بولی۔

کچھ ہی دیر میں وہ بال لہراتی لان میں بی بی جان کے پاس موجود تھی۔ بی بی جان نے لان میں ہی ناشتا لگوا لیا تھا۔

''بے بی...... مائی کیوٹی...... سو لو یو۔'' وہ اُسے چومتے ہوئے بولیں۔ ''ہمیشہ اسی طرح خوش باش رہو۔''

''بی بی جان! میں آپ کو بتانا بھول گئی۔ کل کالج ٹرپ پر مری جانا ہے۔ پلیز پرمیشن لیٹر پر دستخط کر دیجیے۔''

سوئٹی کیا ضرورت ہے اس طرح جانے کی...... ابھی میں تم کو اکیلے بھیجنے کے حق میں نہیں ہوں۔''

''اوہ گاڈ! بی بی جان! دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور آپ......؟''

''اوہ مائی سوئٹی اتنی بڑی ہوگئی ہے کہ ہمیں ہی سمجھانے لگی۔ OK گاڈ بلیس یُو۔'' یہ کہتے ہوئے بی بی جان نے پرمیشن لیٹر پر دستخط کر دیے۔

رابعہ شہزین کے پیدا ہوتے ہی اُسے بی بی جان کی گود میں دے کر ملک عدم سدھار گئی تھی۔ ملک مصطفیٰ علی رابعہ کی یاد میں دیارِ غیر بس گئے اور پھر کبھی پلٹ کر وطن واپس نہ آئے۔ ملک مصطفیٰ علی نے جیسے اپنی ہر ذمہ داری بی بی جان کے سپرد کر دی تھی۔

محبت کا ایسا انجام دیکھ کر بی بی جان نے اپنا دل پتھر کر لیا تھا۔ اب وہ لفظ محبت سے بھی نفرت کرتی تھیں۔

☆......☆......☆

بی بی جان نے شہزین کی پرورش ماں بن کر کی تھی۔ پیدائشی طور پر شہزین کے بال بہت روکھے پھیکے اور بے جان تھے۔ ہر طرح کے علاج کے باوجود بال نہایت بے رونق ہی رہے تھے۔ شہزین 6th اسٹینڈرڈ میں تھی جب امپورٹڈ شیمپو کے بجائے بی بی جان نے لائف بوائے شیمپو کا استعمال آخری حل کے طور پر کیا تھا۔ اور پھر...... جادو ہو گیا۔

لائف بوائے شیمپو کے مستقل استعمال نے شہزین کے بال دنوں میں بہترین کر دیے تھے۔ اب اُس کے مضبوط بال ہی اُس کی خوبصورتی کو دوچند کرتے تھے۔

شہرین خود یہی کہتی تھی۔

''لائف بوائے شیمپو کام دکھائے اور بیوٹی گرلز کو بیوٹی کوئین بنائے۔''

☆......☆......☆

مری کے ٹرپ سے واپسی پر شہرین اپنا دل وہیں بھول آئی تھی۔ ''شہریار'' سے اُس کی ملاقات مال روڈ پر ہوئی تھی اور کب وہ اُس کی دھڑکنوں کا امین بن گیا پتا ہی نہ چلا تھا۔

بی بی جان نے اُس کی بے کلی محسوس کی تھی۔ جب اُس سے باز پرس کی تو وہ اپنا دل کھول کر اُن کے آگے رکھ گئی۔

☆......☆......☆

''نہیں سوئٹی! کبھی نہیں ...... میں نے تمہاری ماں کے ایک غلط فیصلے پر سر جھکایا تھا۔ ملک مصطفیٰ علی سے رابعہ کی محبت نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ مگر آپ نہیں......I Hate Love......''

''او کے آئندہ شہریار کا نام تمہاری زبان پہ نہ آئے۔'' بی بی جان رابعہ کے بعد بہت محتاط ہو گئی تھیں۔

ملک مصطفیٰ علی نے بیٹی کو قبول نہ کر کے دولت کے ترازو میں محبت کو تول دیا تھا۔ یہ بات بی بی جان کے لیے قطعاً قابلِ قبول نہ تھی۔ سو وہ محبت کی دشمن بن گئی تھیں۔

☆......☆......☆

شہریار نے جب شہرین سے بی بی جان کا فیصلہ سنا تو وہ ڈٹ گیا۔ اُس نے ہر رکاوٹ دور کر کے شہرین سے کورٹ میرج کر لی۔

شہرین نے جیسے دنیا پا لی تھی۔ وہ محبت میں بی بی جان کو بھی بھلا گئی تھی۔

عارفین کی صورت دوسری شہرین سامنے تھی۔ عارفین کے ساتھ بھی بالوں کے مسائل نے جنم لیا تو شہرین کے سامنے لائف بوائے شیمپو کی مثال تھی۔ سو اُس نے بچپن ہی سے عارفین کو لائف بوائے شیمپو استعمال کرایا تھا۔ آج عارفین کے معمولات میں لائف بوائے سے سر دھونا لازم و ملزوم تھا۔

☆......☆......☆

شہریار آفس سے آ رہے تھے' آگے' بہت آگے انہیں ایک سائیکل چلاتی لڑکی نظر آ رہی تھی' تب ہی ایک بائیک اُس کے پاس آ کر رکی۔ وہ لڑکی سائیکل روک کر اس سے بات کرنے لگی۔

انہوں نے اپنی گاڑی کی رفتار کم کر لی۔ بات مکمل کر کے وہ دونوں اپنی اپنی راہ پر ہو لیے۔

سائیکل خاصی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی' انہوں نے بھی اپنی گاڑی سبک رفتاری سے آگے بڑھالی۔

کھڑکی پر رکھے بازو کی دو انگلیاں پیشانی مسل رہی تھیں۔ انہوں نے 'شہریار لاج' کے آگے گاڑی روک کر اندر نظر ڈالی۔ سائیکل ناریل کے درخت کے پاس کھڑی تھی جسے چوکیدار گیرج میں لے جا رہا تھا۔ انہوں نے گاڑی اندر بڑھالی اور لاک کر کے گھر کے اندر آ گئے۔

''شریفاں بوا' بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟'' لمحہ بھر کو رک کر انہوں نے ملازمہ سے پوچھا۔

''وہ جی' ابا جان کے ساتھ گئی ہیں۔ چھوٹے بابا کوچنگ اور عارفین بی بی ابھی آئی ہیں' اپنی سہیلی کے گھر سے اور مانی صاحب یونیورسٹی سے نہیں آئے۔''

''ہوں......'' وہ اتنا کہہ کر اندر کی جانب بڑھ گئے۔

☆......☆......☆

آج کل وہ اپنی اٹھارہ سالہ بیٹی عارفین کو اٹھتے بیٹھتے' چلتے پھرتے' غرض اس کا ہر عمل نوٹ کر رہے تھے۔ وہ انہیں شہرین کا پرتو لگتی' شوخ و چنچل' مست' کچھ ضدی سی۔ عارفین میں ان کی جان تھی مگر اس کی ضدی طبیعت ان کی ایک ایک ہارٹ بیٹ مس کر دیتی تھی۔ بے اختیار ہی وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر مسلنے لگتے تھے۔

شہرین بھی ہر وقت مسکراتی رہتی تھی جو اس کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ وہ بہت گہرائی میں جا کر نہیں سوچتی تھی یعنی جو کل ہونے والا تھا' اس کی آج فکر نہیں کرتی تھی' اسے اپنا حال بہت عزیز تھا۔

اور انہیں مستقبل کی فکر تھی کہ کہیں......

عارفین کی چنچل ہنسی' شوخ و شنگ لہجہ' شرارتی انداز' آج کل کا ماحول میڈیا کی بڑھتی ہوئی آزادی......اور اندر ہی اندر ایک انجانا سا خوف کہ کہیں ماضی ایک بار پھر خود کو ان کے سامنے نہ دہرائے۔

☆......☆......☆

شہرین کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''تو اس میں حیرت زدہ ہونے کی کیا بات ہے؟'' انہوں نے گرم شال اوڑھے شہرین کو دیکھا۔

بلیک گرم سوٹ میں ان کا چہرہ چمک رہا تھا۔ شہریار کے دل میں آج بھی اکثر انہیں دیکھ کر پہلے دن والی لہر اٹھتی تھی۔ بلیک اور ریڈ رنگ ان پر بہت کھلتا اور سجتا تھا۔

''شیری! عارفین ابھی اٹھارہ سال کی بھی نہیں ہوئی؟''

''تو کیا ہوا' ابھی تو رشتہ دیکھیں گے' جانچ پڑتال ہوگی' جب تک عارفین بھی بیس سال کی ہو ہی جائے گی۔''

انہوں نے اخبار سامنے پھیلالیا۔

''شادی کے لیے وہ بہت چھوٹی ہے؟'' وہ اپنی حیرت پر قابو نہیں پارہی تھیں کہ شہریار' کیوں عارفین کی شادی کی فکر کر رہے تھے' کیوں؟

''تو کیا ہوا؟'' انہوں نے دھیرے سے اپنا چشمہ اتار لیا۔ آنکھوں پر لگا چشمہ ان کی وجاہت کو بڑھا دیتا تھا' کنپٹیوں کے سفید بال ان کی شخصیت کو مزید گریس فل بناتے تھے۔

''آپ بھی تو سترہ سال کی تھیں شادی کے وقت؟'' دھیمے سے انداز میں مسکرائے۔ لمحہ بھر کو وہ بھی مسکائیں۔

''شیری......'' اس نے سر اٹھایا۔ ''وہ زمانہ اور تھا' آج سے بائیس سال پہلے لڑکیوں کی شادیاں جلد ہو جایا کرتی تھیں اور پھر مدمقابل آپ تھے' ایک مکمل گھرانہ تھا' اچھے لوگ تھے۔''

''تو آج کل تو حالات اور بھی خراب ہیں؟'' بغور دیکھ کر انہیں کچھ بتانا چاہا۔

''بس مجھے نہیں پتا۔'' وہ ٹھنکی۔ ''ابھی نہیں' ابھی تو آپ نے بچوں کے حوالے سے بہت سے خواب دیکھے ہیں' عارفین کو ڈاکٹر بنانا ہے' آپ تو پڑھانا چاہتے ہیں اسے؟''

''شہزین......'' انہوں نے دھیرے سے سانس لیا۔

''میں مرا ہوں اور نہ میرے خواب......''

''اللہ نہ کرے۔''

''عارفین کا رجحان بھی ہے۔ وہ شادی کے بعد بھی میری بیٹی رہے گی اور ڈاکٹر بن گئی تو قابلِ فخر بات ہوگی۔''

''مگر شیری' شادی ایک ذمے داری ہے اور عارفین......''

''تو کیا ہوا؟ ہمیں عارفین کی صلاحیتوں پر فخر ہے۔''

شہزین نے سر ہاتھوں میں تھام لیا اور انہوں نے ایک نگاہ ان پر ڈال کر دوبارہ سے اخبار پھیلالیا۔

☆......☆......☆

''ارے' تو اس میں فکر کی کیا بات ہے؟''

''آپا! عارفین بہت چھوٹی ہے' بالکل بچی سی' لاڈلی ہے' اتنی بڑی ذمے داری سنبھال سکتی ہے بھلا؟ اُسے تو بس اپنے بال سنبھالنا بھی نہیں آتے۔ وہ تو بھلا ہو لائف بوائے شیمپو کا کہ اُس کے بالوں کی نگہداشت مجھ سے زیادہ اسی شیمپو کی مرہونِ منت ہے۔''

آپا کے اطمینان کو انہوں نے حیرت سے دیکھا۔

''شہزین' تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تم سے زیادہ اُس کے بال لائف بوائے شیمپو نے سنبھالے ہیں۔ مگر بی بی اولاد اور بال ایک ہی چیز ہیں۔ پنجاب میں بال' بچے ہی کو کہتے ہیں۔ تم بجائے اس کے کہ شہریار سے بحث کرتیں کہ عارفین کی شادی کیوں کر رہے ہیں' یہ پوچھتیں کہ کس سے کر رہے ہیں؟ ہوسکتا ہے کہ کوئی بہت اچھا رشتہ ہو شہریار کی نظر میں؟''

شہزین نے انہیں دیکھا۔ ''ان کی پسند پر مجھے اعتراض نہیں ہے' وہ اپنی حیثیت' اپنے مرتبے سے کم پر کمپرومائز نہیں کریں گے۔ مجھے اعتراض بس عارفین کی کم عمر پر ہے' اکلوتی بیٹی پر ہے۔ آپ ان سے بات کریں' ابھی نہیں' کم سے کم دو تین سال تک تو بالکل نہیں' اس کی تعلیم مکمل ہونے تک تو بالکل نہیں۔''

انہوں نے حتمی سے انداز میں کہا۔

''اچھا' میں بات کرتی ہوں مگر تم تو جانتی ہو کہ اپنے معاملات میں وہ کم ہی بولنے دیتا ہے۔''

''بس مجھے نہیں معلوم۔'' وہ اندر تک ناراض تھیں۔

اس مان' اس اعتبار پر آپا فخر سے مسکرادیں۔

☆......☆......☆

فراز اور عارفین لان میں بیڈمنٹن کھیل رہے تھے' ٹراؤزر' ٹی شرٹ اور گلے میں بے نیازی سے ڈلا پنک اسکارف' اونچی سی پونی اور پونی ٹیل سے نکلتے بال مسلسل متحرک رہنے سے عارفین کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا۔ فراز کو ہرانے کی خوشی الگ اس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اس کی ہنسی بند نہیں ہو رہی تھی۔ کنارے پر بیٹھے تانیہ' جنید' رفیق' شانزہ' واثق تالیاں بجا رہے تھے۔ فراز اسے مسلسل چڑا رہا تھا۔

اسٹڈی روم سے دیکھتے شہریار کے وجود میں کرنٹ سا دوڑ گیا' بھولی بسری یادوں نے دل کو چھولیا۔ ہنسی کی

آوازیں یہاں تک آرہی تھیں۔
کھیل ختم ہو گیا تھا۔ عارفین میچ جیت چکی تھی۔
''چلو، میں ہارا، مانگو جو مانگنا ہے۔'' فراز ٹاول سے پسینہ خشک کر رہا تھا۔
'تم......تم......تم......' کانوں میں ایک بازگشت سی اترنے لگی۔ شہریار کا دل سکڑنے لگا۔ ایک بار پھر ہارٹ بیٹ مس ہوئیں۔ 'کہیں......کہیں...... ماضی خود کو تو نہیں دہرا رہا؟ ماضی ضرور خود کو دہراتا ہے۔' سوچتے سوچتے انہوں نے سینے پر ہاتھ رکھا۔
عارفین ہنس رہی تھی، اس نے ہاتھ اٹھایا ہوا تھا۔ فراز 'باادب، باملاحظہ' کی پوزیشن میں تھا۔
شہریار کے دل میں پتنگے سے لگ گئے۔ بے اختیار وہ اگلے دریچے کے قریب رکے۔ عارفین کی آواز اور شرارتی ہنسی صاف سنائی دے رہی تھی۔
''جاؤ، معاف کیا، ہم دینے والوں میں سے ہیں، لینے والوں میں سے نہیں۔'' اس کا انداز شاہانہ تھا۔ سب ہنسنے لگے۔ فراز نے گھٹنے ٹیک دیے۔
''شکریہ، نوازش، ملکۂ عالیہ، ورنہ میں کس قابل تھا، میری جیب میں تو صرف آپ کو دینے کے لیے صرف یہ ہے۔'' سب ایک بار پھر ہنس دیے۔ جب فراز نے لائف بوائے شیمپو کا ساشے نکال کر اُسے پیش کیا۔ واثق اسے مکے مارنے لگا۔
''ابے بزنس مین کی اولاد...... اور اتنا بڑا کنجوس، سالا بنیا بنے گا۔'' فراز ہنستے ہوئے سیدھا ہوا۔
''بنیا بنوں گا تو بزنس مین کہلاؤں گا نا۔'' ایک بار پھر ہنسی مذاق شروع ہو گیا۔
''سوری ٹو سے...... یہ بات میں نہیں مانتی لائف بوائے شیمپو سستا ضرور ہے مگر اس کا معیار دنیا کے بہترین شیمپوز کی برانڈ میں ہوتا ہے۔ میرے سلکی اور مضبوط بال اس بات کے گواہ ہیں۔'' عارفین نے پونی کھول کر بال لہرائے تو سب نے اس کے چمکتے بالوں کو دیکھ کر ''واؤ'' کہا تھا۔
شہریار کا رکا ہوا سانس بحال ہوا۔ دھیرے سے باہر آئے شہزرین کی تلاش میں۔ وہ کچن میں مل گئیں۔ ان کے چہرے پر سکون اور مسکراہٹ تھی۔
''شیری، آج آپ گھر پر ہیں نا؟ میں آپ کے لیے چکن چاؤمن اور رشین سلاد بنا رہی ہوں۔'' شہزرین نے اُسے محبت آمیز انداز میں دیکھا۔
آپا پر سب کچھ چھوڑ کر وہ مطمئن تھیں اس لیے ناراضگی بھی دور ہو گئی تھی۔
''شہزرین، یہ لوگ ایسے ہی کھیلتے رہتے ہیں۔'' کچن کی کھڑکی سے باہر دیکھتے اوڑ سگار سلگاتے ہوئے وہ سنجیدہ تھے۔
''تو کیا ہوا شیری؟'' انہوں نے بھی کچن کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ''آپس میں کزنز ہیں، گھر پاس پاس ہیں، یونیورسٹی کالج کی چھٹیاں ہیں۔'' ان کا سہل سا انداز تھا۔
''عارفین نے ایف ایس سی مکمل کر لیا ہے نا؟''
''جی، اور وہ آپ کی خواہش پر پری میڈیکل میں جانا چاہتی ہے۔''
''شہزرین، میں نے رشتہ دیکھا ہے۔ لڑکا مجھے پسند ہے۔ انہیں ویک اینڈ پر میں نے کھانے پر بلایا ہے۔ اچھی طرح سے مل لینا اور......'' وہ جاتے جاتے رکے۔ ''اور عارفین کو بھی لڑکے کے متعلق بتا دینا۔''
اپنی بات کہہ کر وہ چلے گئے اور شہزرین ساکت کھڑی رہ گئیں یعنی آپا نے ان سے بات نہیں کی؟
☆......☆......☆
شہزرین رو رو کر ہلکان ہو گئیں مگر شہریار کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور نہ ان کا دل پسیجا۔
''شیری...... ہماری اکلوتی بیٹی ہے، بہت معصوم اور بھولی سی ہم نے اسے ابھی تک اس پر کوئی ذمے داری نہیں ڈالی۔ وہ کیسے اتنی بڑی ذمے داری نبھا سکے گی؟ مجھے کم عمری میں اس کی شادی نہیں کرنا۔'' ان کا روہانسا انداز تھا۔
''اپنی مثال مت بھولو، تم بھی تو......'' انہوں نے ان پر نگاہ ڈالی، رویا رویا چہرہ، متورم آنکھیں، بھرایا ہوا لہجہ۔
''شیری، میرے ساتھ...... آپ کا ساتھ تھا، آپ کی محبت تھی، مشکلیں کتنی تھیں۔ مجھے کوئی کام نہیں آتا تھا، آپ کی امی اور آپا اچھی تھیں۔ انہوں نے سب کچھ سکھایا اور مسئلہ نہیں بنایا۔ ضروری نہیں ہے کہ عارفین کو بھی اتنا اچھا سسرال، اتنے اچھے لوگ ملیں؟ میں اسے سب کچھ سکھا کر سسرال بھیجنا چاہتی ہوں۔'' شہریار نگاہ چرا کر آتش دان کے شعلوں کو دیکھنے لگے۔
''شیری، ہر لڑکی نے پرائے گھر جانا ہوتا ہے، ہم

عارفین کی بھی شادی کریں گے مگر اپنے وقت پر پلیز......''

ان کے سامنے کارپٹ پر رکھے فلور کشن پر بیٹھ کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ''خدا کے واسطے۔'' اور پھر انہوں نے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔

''شہرین......'' انہوں نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

''تم ابھی ان لوگوں سے تو ملو' دیکھیں گے' کتنے مرحلے ہوتے ہیں' ابھی تھوڑی بیاہ رہے ہیں۔''

شہرین نے ان ہاتھوں پر پیشانی ٹکا دی۔ ''آپ کو عارفین کی معصومیت پر پیار نہیں آتا؟ کتنا بچپنا ہے اس کے اندر؟ کم سے کم گریجویشن تو کرنے دیں؟''

وہ شہرین کے آنسو خشک کرتے خاموش سے ہو گئے۔

☆......☆......☆

آپا آج کل اپنی بیٹی نوشین کے پاس اسلام آباد گئی ہوئی تھیں۔ شہریار کے بلائے ہوئے مہمان کھانے پر آئے تھے۔ شہرین ان سے اچھی طرح سے ملیں مگر انہوں نے عارفین کو وجہ نہیں بتائی تھی۔ اپنے سب بچوں سے انہیں ملوایا تھا' وہ لوگ ظاہر میں انٹرسٹڈ نظر آرہے تھے۔

'اچھا ہے' ان کی توجہ عارفین پر نہیں گئی۔' شہرین نے رسان سے سوچا۔ 'ظاہر کون سا ابھی شادی کر رہا ہے' اسے تو بزنس میں اپنے بابا سے آگے جانا ہے۔' شہرین دل ہی دل میں سوچتی رہیں۔

انہیں آپا کا انتظار تھا' اس سے پہلے کہ شیری کوئی اور گیدرنگ رکھ لیتے' کسی اور مہمان کو بلا لیتے' آپا ں ہوتیں تو انہیں سمجھا بجھا لیتیں لیکن اب آپا ہی انہیں سمجھا سکتی تھیں۔ انہیں لگتا تھا' گویا انہوں نے عارفین کی شادی کرنے کا حتمی فیصلہ کر ہی لیا ہے۔

کیا تھا اگر آپا' اس بار زرتاج کو ادھر ہی بلوا لیتیں؟ ہر بار فون کر کے وہ انہیں جلدی آنے کا کہہ رہی تھیں۔ انہیں شیری کے ہتھیلی پر سرسوں جمانے سے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ وہ خوب جانتی تھیں کہ شہریار کی گہری خاموشی میں کوئی نہ کوئی راز پنہاں ہوتا ہے اور پردہ اٹھنے سے انہیں ڈر لگ رہا تھا۔

ان سب سے بے نیاز عارفین سب کزنز کے ساتھ پھوپو کے گھر بیٹھ کر موی دیکھ رہی ہوتی' چچا کے لان میں دھمال ڈل رہا ہوتا' تایا کے گھر میں ون ڈش پارٹی ہو رہی ہوتی یا تو اپنے گھر کے وسیع و عریض لان میں کرکٹ کا میچ ہو رہا ہوتا تو کبھی بیڈمنٹن کا کورٹ لگ رہا ہوتا۔

شوخ و شریر' چنچل عارفین ہر دل کی خوشی تھی' ہر پروگرام کا آغاز بھی اور ہر جھگڑے کی بنیاد تو کبھی کسی لڑائی کی امن کی فاختہ۔ گویا اس کے بغیر ہر پروگرام ادھورا' ویران اور پھیکا سا ہوتا۔

بابا جان سے لاڈ پیار تو......دونوں بھائیوں سے چھیڑ چھاڑ بھی چلتی رہتی تھی۔

''جانے کب جائے گی اپنے گھر؟'' اس وقت بھی وہ سرور سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی' اسے فون سننے نہیں دے رہی تھی کہ سرور نے الجھ کر کہا۔

'باپ کے بعد بھائی بھی.....' شہرین سوچ کر خاموش سی ہو گئی۔

''بے فکر رہیں' ابھی نہیں جانا' بھابیاں لا کر جاؤں گی۔'' اس نے چڑایا۔

''اے اے۔'' سرور نے بھی جواباً منہ چڑایا۔

''منہ دھو رکھو' بابا تو تمہارے لیے رشتہ دیکھ رہے ہیں۔ بس آج کل میں نکالی جاؤ گی پرائے دیس۔''

شہرین کو سانپ سونگھ گیا۔ عارفین' بھائی کو انگوٹھا دکھاتے ہوئے منہ چڑاتی رہی کہ شہریار آ گئے۔

''یہ کس کو دیس نکالا مل رہا ہے؟'' ان کا موڈ بہت اچھا تھا۔

''آپ کی بیٹی کو۔'' سرور ہنسا۔ عارفین سیدھی ہو کر بیٹھی۔

''بتائیں بابا' میں کتنا سچا ہوں؟''

''سرور......'' عارفین گھورنے لگی۔

سرور مسلسل اسے چھیڑ رہا تھا۔ شہریار ہنس دیے۔

''یہ تو حقیقت ہے کہ ہر لڑکی نے سسرال جانا ہوتا ہے۔''

''میرے بابا کوئی جاہل' گنوار' زمیندار یا وڈیرے نہیں ہیں جو بلا سوچے سمجھے میری مرضی کے بغیر مجھے بیاہ دیں۔'' عارفین نے لاڈ سے بابا کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے ٹھنک کر محبت سے کہا۔

شہرین کا انداز ساکت تھا' آنکھیں نم' نظریں باپ بیٹی کے محبت آمیز منظر پر ٹھہری ہوئی تھیں۔ وہ اس وقت بھی منی بچی لگ رہی تھی باپ کے سینے سے لگی' شانے پر سر رکھے۔

''رشتہ اچھا ہو تو تمہاری مرضی چہ معنی دارد؟'' سرور'

باز نہیں آ رہا تھا چڑانے سے اور عارفین سیریس نہیں ہو رہی تھی۔ باپ کے کندھے پر سر رکھے جوابی کارروائی کر رہی تھی۔

☆......☆

''شہرین' عارفین کہاں ہے؟'' گھر میں غیر معمولی خاموشی تھی۔

''نصرت کی طرف گئی ہے۔'' خفگی بھرے انداز میں انہوں نے کہا۔

''مگر وہاں تو کوئی نہیں ہے؟ ادھر سے ہی آ رہا ہوں۔''

''اوہو تو پھر یہ لوگ دھمال ڈالنے بھائی صاحب کے گھر ہوں گے پھر فراز انہیں آئس کریم کھلانے گیا ہوگا۔'' ان کی جانب دیکھے بنا انہوں نے کہہ دیا اور اپنے کام میں مصروف رہیں۔ شہریار کے قدم رک گئے۔

''تم کیسی ماں ہو کہ تمہیں معلوم نہیں کہ تمہاری اولاد کہاں ہے؟'' شہرین نے جھٹکے سے سر اٹھایا اور سناٹے میں رہ گئیں۔

''آج کل کے حالات کیسے ہیں؟''

''کیا ہو گیا ہے شیری؟ برابر میں پھوپو' چچا' تایا کے گھر ہیں' ان گھروں میں جانے پر پابندی لگا دوں؟''

''وہ بڑی ہو گئی ہے' اسے پابندی کی ضرورت ہے۔'' ان کا لہجہ سخت تھا۔

''وہ سب آپ کے بھائیوں اور بہن کے بچے ہیں شیری؟''

''مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اپنی اولاد کی طرف سے بے فکر ہو جائیں؟'' شہریار نے غصے سے منہ پھیر لیا۔

''ہمیں اپنی اولاد پر بھروسہ ہے۔''

''عارفین بہت معصوم اور بھولی ہے۔''

''اتنی معصوم نہیں کہ اپنی حفاظت نہ کر سکے' سمجھدار ہے وہ۔'' زچ ہونے کے انداز میں انہوں نے شہرین کو دیکھا اور آگے بڑھ گئے۔ شہرین انہیں جاتا ہوا دیکھتی رہیں۔

ان کا رخ باہر کی جانب تھا۔ جانے کیسی بے چینی دل کو لگ گئی تھی؟ مگر شہرین کا دل مطمئن تھا۔ اس وقت انہوں نے آپا کو فون ملایا۔

''خدا کے واسطے' آپا آ جائیں۔ شیری اتنے حساس ہو رہے ہیں کہ بس۔''

''اسے سمجھاؤ شہرین......!''

''نہیں آپا' انہیں آپ کے علاوہ کوئی اور نہیں سمجھا سکتا۔''

''اچھا' میں آ رہی ہوں جلدی۔'' انہوں نے انہیں اطمینان دلایا اور فون رکھ دیا۔

شہرین کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہونے لگیں۔ ایک خیال' ایک احساس ان کے دل کو چھو گیا۔ چھٹی حس انہیں کلک کرنے لگی۔ کہیں کچھ گڑبڑ تھی' ایسے ہی تو شیری' عارفین کی شادی کے لیے بے چین نہیں تھے۔

عارفین کی شوخی' شرارت وظرافت' فری انداز کو وہ کسی غلط انداز میں تو نہیں دیکھ رہے تھے؟ وہ بس سوچ کے رہ گئی تھی۔

☆......☆......☆

''شہریار' یہ کیا حماقت ہے' تم کوئی جاہل' ان پڑھ جاگیردار ہو جو کسی خوف سے اتنی کم عمر بیٹی کی شادی کا سوچ رہے ہو؟'' آتش دان کے آگے بیٹھے شہریار ایک نگاہ آپا کو دیکھ کر رہ گئے۔

''تم عارفین کے لیے رشتے دیکھ رہے ہو' ہولا کر رکھ دیا ہے مجھے؟ خبردار جو تم نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی اور کوئی اولاد ہے تمہاری' وہ تو ابھی بچپنے سے نہیں نکلی اور تم......'' اپنے پیروں پر کمبل ٹھیک کرتی آپا نے محبت و پیار سے بھائی کو دیکھا۔ بھتیجی کے لیے بے بہا محبتیں تھیں۔ شہریار خاموشی سے کتاب کے صفحے پلٹ رہے تھے۔

''اور ذرا اس وقت کو آنے تو دو۔ رشتے خاندان سے ہی نکل آئیں گے۔ تمہیں کسی خوف کا شکار ہونے کی ضرورت ہے اور نا سوچنے کی' میں بھی ابھی بیٹھی ہوں۔''

''آپا!'' شہریار نے ایک گہرا سانس لے کر آپا کو دیکھا اور آتش دان میں جلتی آگ کو دیکھنے لگے۔ ''میری بیٹی بہت معصوم ہے' میری جان ہے' اکلوتی بیٹی ہے۔ میں جانتا ہوں آپا! مگر...... اس کی معصومیت ہی مجھے خوف زدہ کیے دیتی ہے۔ آپا! وہ بالکل شہرین کا پرتو ہے' اس کی جوانی کا عکس ہے۔''

باہر کھڑی شہرین محبت آمیز انداز میں مسکرا دی۔ دل ایک بار پھر سے پرانے انداز سے دھڑکا تھا۔

''اور یہ معصومیت انسان کو ضدی بنا دیتی ہے' بعض اوقات ہمیں پتا نہیں چلتا اور ہم چاند کے تمنائی بن جاتے ہیں۔'' آپا ایک ٹک بھائی کو دیکھنے لگیں۔

''اور میں نہیں چاہتا کہ اپنی معصومیت اور ضد کو لے کر عارفین کوئی ایسا فیصلہ کر بیٹھے جس کو میں قبول نہ کر سکوں اور شہرین کی طرح وہ بھی کوئی انتہائی قدم اٹھا کر میرے

لیے پشیمانی کا باعث بن جائے؟"
آپا ساکت ہوئیں اور...... باہر کھڑی شہزین کا دل دھک سے رہ گیا۔

"شہزین میری محبت میں سب کچھ چھوڑ کر آ گئی تھی، سامنے میں تھا۔ اس کے گھر والوں نے میرا رشتہ قبول نہیں کیا تھا۔ اگر میں اسے جھٹک دیتا تو کیا ہوتا؟ وہ میری محبت میں پاگل تھی۔ میں نے اسٹینڈ لیا اور اپنی عزت بنا لیا۔" شہریار دھیرے دھیرے بول رہے تھے۔

شہزین کا وجود ٹھنڈی دیوار سے جا لگا۔

"میری بیٹی نے ماں کی طرح کوئی انتہائی قدم اٹھا لیا تو میں کیا کروں گا؟ اس کے مقابل کوئی میرے جیسا نہ ہوا تو کم پر تو میں سمجھوتا نہیں کر پاؤں گا آپا! اور میں نہیں چاہتا کہ وقت کسی طور خود کو دہرائے۔ میرے اندر جگ ہنسائی کو سہنے کا حوصلہ نہیں ہے اس لیے میں......" وہ چپ ہو گئے۔

آپا چپ ہو گئیں۔

شہزین کے دل کی دھڑکن جیسے رک سی گئی۔

آج محبت کا قصور اس کے کھاتے میں لکھ دیا گیا تھا۔

"بیٹی ماں جیسی نہ ہو۔"

آنکھیں بھیگنے لگیں جب حساب کتاب ہو سود و زیاں کی بات ہو تو سب زیاں عورت کے حصے میں آتا ہے۔ آپا نے بھی تو ایک بار نہ کہا کہ اس سب میں تمہارا قصور بھی تو ہے مگر گھر تو انہوں نے چھوڑا تھا شہریار کے لیے۔ آج یہ بات جو اس زمانے میں محبت تھی طعنہ بن گئی۔

اندر کمرے میں آپا کہہ رہی تھیں۔ "تم کوئی انتہائی قدم مت اٹھاؤ، کچھ مت سوچو۔" انہوں نے اپنا دامن پھیلا دیا۔ "عارفین کو فراز کے لیے مجھے دے دو۔"

"OK آپا! مگر......" جیسے وہ ہوش میں آئے۔

لائف بوائے شیمپو سے لہراتے بالوں والی شہزین اور آج کی عارفین......

"آپا رُکیے! میں ابھی آیا۔" یہ کہہ کر شہریار باہر آیا تو دیوار سے لگی شہزین کی حالت دیکھ کر وہ سب کچھ سمجھ گیا کہ وہ سب کچھ سن چکی ہے۔ اُس نے اُسے کاندھوں سے پکڑ کر ساتھ لگایا۔

"سوری! معاف کر دو۔"

"مگر میرا قصور تھا صرف! جیسی ماں، ویسی بیٹی۔" یہ کہہ کر شہزین پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"لو یو شہزین! آئی ایم سوری یقین کرو میں آج بھی تم سے پہلے دن ہی کی طرح محبت کرتا ہوں۔ تم میرے لیے سب کچھ چھوڑ کر آ گئیں! کبھی خیال ہی نہ کیا اس طرف، میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ مگر جیسی تم حوصلہ مند اور ثابت قدم رہیں میری دعا ہے میری عارفین بھی اپنی ماں جیسی ثابت ہو۔ مجھے تم پر فخر ہے۔"

اتنے میں ہال کمرے سے شور اٹھا تھا۔ "اور ہم سب کا فخر ہے یہ۔"

فراز نے لائف بوائے شیمپو نکال کر عارفین کو تھمایا۔

ہال میں سب کزنز نے "ہُرے" کا نعرہ لگایا اور پھر سب نے شہزین اور شہریار کو گھیر لیا۔

"ماموں! مامی جیسی عارفین ہی میری آئیڈیل تھی۔ مامی جیسے سلکی بالوں والی......"

"ارے لڑکے ہوش کر! یہ کمال لائف بوائے شیمپو کرتا ہے، تیری عارفین پر بھی اُس کا جادو اس شہزین نے چلایا ہے۔" آپا بیگم دھیرے سے بیٹے کی بات پر مسکائیں۔

اتنے میں صدر دروازہ کھلا اور بی بی جان نے کمرے میں قدم رکھے۔

"بی بی جان!" شہزین پر جیسے شادیٔ مرگ جیسی کیفیت طاری تھی۔

"سوئٹی آئی لو یو! اتنی سنگدل ہو گئیں کہ مجھے بھول گئیں۔"

"آپ نے بھی تو......"

"شہزین پلیز!" شہریار نے کچھ بھی کہنے سے اُسے روک دیا۔

"بی بی جان آ جائیں۔ آج کے دن آپ کو ایک کے ساتھ دوسری بیٹی بونس میں مل جائے گی۔" عارفین کو آگے کرتے شہریار نے کہا۔

"ہمیں سب خبر تھی۔ اس لیے ہم اپنی دونوں بیٹیوں کے لیے گفٹ لائے ہیں۔"

بی بی جان نے گفٹ کا ریپر کھولا تو اندر سے لائف بوائے شیمپو نکلے۔

"میرے لیے تم آج بھی چھوٹی سی، کیوٹ سی سوئٹی ہو۔ جسے میرے بعد اس لائف بوائے شیمپو نے Grown Up کیا۔"

"مضبوط بال...... مضبوط رشتے......" شہریار کے کہتے ہی سب نے قہقہہ لگایا۔

☆☆......☆☆

ناول
رفعت سراج

دامِ دل

قسط 13

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں، جو دھڑکنیں
بے ترتیب کردیں گی، رفعت سراج کے جادوگر قلم سے

چمکتی ہوئی روشن سنہری جلد بڑی بڑی غلافی آنکھیں بھرے بھرے نمدار ہونٹ سانچے میں ڈھلا ہوا بدن سرخی مائل براؤن بال کو کمر سے نیچے تک اتے تھے۔ پڑھی لکھی یونیورسٹی میں گولڈ میڈل اور اسکالرشپ لینے والی۔ اتنی خوبیوں والی بہولا کر بانو آپا کے قدم زمین پر نہ ٹکتے تھے ولیمے والے دن انہوں نے ایک ایک مہمان کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

چاند کا ٹکڑا تو ڑ کر لائی ہو بانو...... کسی سہیلی نے تبصرہ کیا تو ان کی گردن میں سریا اٹک گیا تھا۔

اور آج وہ دنیا کی بدصورت ترین بلکہ بدہیبت عورت نظر آ رہی تھی۔ جس نے ان کے بیٹے کو ذلیل کر کے رکھ دیا تھا۔

آپ اپنے بیٹے سے معلوم کریں کہ وہ یہ شادی رکھنا چاہتے ہیں یا مجبوراً یہ رشتہ گھسیٹ رہے ہیں اگر میں آپ کی طرح ان پر بھی بوجھ ہوں تو وہ بیٹھ کر بات کرلیں تا کہ یہ منحوس اور بھاگوان کی بحث تو ختم ہو۔

چمن کے اعصاب شل ہو گئے وہ بانو آپا کے مسلسل بولنے کی وجہ سے ٹھیک سے نورالعین کو بھی سنبھال نہیں پا رہی تھی ایک اور انسانی خطا سے دوچار تھی۔ معنی جواب شکوہ خواہ مخواہ سرزد ہو گیا۔

بہرحال اگر وہ ضبط کا کمال بھی دکھا جاتی تو بانو آپا چھوڑنے والی نہیں تھیں وہ تو اسی دن سے تلی بیٹھی تھیں کہ کوئی بہانہ ملے اور وہ دو دو ہاتھ کریں۔

ہاں...... میرا خیال ہے یہ بحث آج ہی ختم ہو جانا چاہیے۔ بہت ہو گیا۔

اب بانو آپا کا ایجنڈا مکمل ہو گیا تھا چمن کے سامنے دھرنا مار کر بیٹھنے کی افادیت ختم ہو گئی تھی ایک جھٹکے سے اٹھ کر اپنی خواب گاہ کی طرف چل پڑیں چمن نے دیر بعد گہری سانس لے کر اپنے اعصاب کو پرسکون کیا۔

اور بچی کی فیڈر تیار کرنے کچن میں چلی آئی۔ ساتھ ساتھ بچی کو گود میں جھولے بھی دے رہی تھی۔

اتنا تو نورالعین کبھی بھی نہیں روئی تھی۔ شاید آج اسے فرشتوں کے بجائے شیطان نظر آ رہا تھا جو قریب ہی کھڑا انگاروں کے ڈرم خالی کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

یہ کیا کہہ رہی ہیں آنٹی......؟ ندا بھونچکا سی ہو کر اپنی پڑوسن نرگس کو دیکھ رہی تھی۔
بیٹا...... جب سے حکیم صاحب یہ بات کر کے گئے ہیں۔ میرا دماغ پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے تمہارے نانا بات کرنے کے قابل نہیں ہیں اب ان سے کیسے معلوم کریں کہ انہوں نے حکیم صاحب سے کیا عہد و پیمان کیے تھے نرگس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا۔
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... میں...... میں ان حکیم صاحب پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دوں گی۔ ان کی ہمت کیسے ہوئی بڈھے کو ایسی بات آپ سے کرتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ ندا کے خون میں جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا۔
بس بیٹا...... آہستہ بولو...... اسی کا نام دنیا ہے۔ گھر جلتا ہے تو لوگ ہاتھ تاپنے آجاتے ہیں نرگس نے دلاسے کے انداز میں ندا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
کہنے لگے شبیر حسین صاحب اپنی نواسی کی طرف سے بہت پریشان تھے کہتے تھے انجانے لوگوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ حکیم صاحب دیکھے بھالے ہیں برسوں کی جان پہچان ہے برسوں کی دوستی کی لاج رکھیں۔ وغیرہ وغیرہ بولے تو بہت مگر اب مجھے کچھ یاد نہیں۔ نرگس نے پھر اپنی پیشانی انگلیوں سے دبائی۔
دونوں اس وقت ویٹنگ لاؤنج کی سب سے آخری رو کی کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ O.P.D ٹائم آف ہو چکا تھا۔ لاؤنج میں اس وقت معمول کا رش نہیں تھا۔
آنٹی...... جب وہ یہ سب کچھ کہہ رہے تھے تو آپ کو بھی اسی وقت کھری کھری سنا دینی چاہیے تھی۔ ندا کو دکھ ہوا اتنی جان نچھاور کرنے والی آنٹی نے یہ سن کچھ خاموشی سے کیسے سن لیا۔
تم کیا سمجھ رہی ہو وہ میرے گھر میں بیٹھ کر بولے اور میں نے خاموشی سے سن لیا......؟ میں نے وہ سنائی ہیں کہ کم از کم مجھ سے دوبارہ بات نہیں کریں گے۔
کیا کہا آپ نے......؟ ندا کی دلچسپی ہونا عین فطرت تھا۔
میں نے کہا بڑے میاں...... پرانے پڑوسیوں کے سامنے تو کچھ شرم و لحاظ کر لیتے...... پوتی برابر بچی سے نکاح کرنے کا سوچتے ہوئے اپنی پوتیوں اور نواسیوں کی طرف نہیں دیکھا بولے شرعاً کوئی قباحت نہیں۔
خلاف شرع کام کرتے تو ضرور سوچتے...... اور پھر ہم نے یہ بات نہیں چھیڑی...... شبیر حسین کی ایما پر ہمنے بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا تھا...... اب بیٹا خود ہی بتاؤ اس کے بعد میں کیا بولتی۔"
نرگس نے اپنے بے بس ہونے کے مقام کی نشاندہی کی۔
ہوں...... ندا نے لہو کی کھولن کنٹرول کرنے کے لیے گہری سانس لی اور ہنکارا ابھرا۔ تم فکر نہ کرو بیٹا...... ہم سب تمہارے ساتھ ہیں...... ہمارے سامنے پیدا ہوئی جوان ہوئیں سب تمہاری اور تمہارے نانا کی بہت عزت کرتے ہیں سب پیٹھ پیچھے تمہاری تعریف کرتے ہیں کہ بہت نیک شریف اور حیادار بچی ہے۔
نرگس نے ندا کو حوصلہ بھی دیا اور تقویت بھی۔ اور درحقیقت نرگس کے پُرخلوص الفاظ نے لمحوں میں ندا کا حوصلہ اور اعتماد بحال کر دیا۔
تھینک یو آنٹی...... آپ نے ہمیشہ ہمارا بہت خیال رکھا ہے آپ نہ ہوتیں تو میں Job بھی نہیں کر سکتی تھی ندا نے نرگس کا ہاتھ تھام کر چوم لیا یہ شکریہ ادا کرنے کا بڑا بے ساختہ انداز تھا۔

بس تم اپنے نانا کی خدمت کرو...... انشاءاللہ جلد اچھے ہو جائیں گے پھر میں تمہارے لیے کوئی اچھا سا لڑکا دیکھوں گی۔ نانا کی زندگی میں اپنے گھر کی ہو جاؤ تو اچھا ہے نرگس نے ہینڈ بیگ سنبھال کر چلنے کا قصد کیا۔

میں تو کبھی ایسا سوچتی بھی نہیں ہوں...... اگر میں چلی گئی تو نانا جان کو Look After کون کرے گا۔ ندا کے ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

ہم ہیں ہاں...... تمہارے نانا نے بھی تو ہمارا ہمیشہ خیال رکھا ہے تمہارے انکل تو تیس سال سے باہر ہیں۔ شبیر چچا نے سرپرست کی طرح ہمارا خیال رکھا ہے اب ہمیں ان کا خیال کرنا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ دنیا میں خوش نصیبی کی چار علامتیں ہیں۔

☆ کشادہ کھلا گھر

☆ سواری

☆ نیک بیوی

☆ اچھا پڑوس

مجھے تو اپنی خوش قسمتی پر کبھی شک نہیں ہوا...... اور تمہارے نیک نصیب کے لیے دعا کرتی ہوں...... یتیم بچی کے سر پر ہاتھ رکھوں گی تو اپنا ہی بھلا کروں گی۔

ندا خدا حافظ کہنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی نرگس کے بالکل مقابل کھڑی تھی۔ نرگس نے ندا کا چہرہ تھام کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

محبت کے لمس نے رگ و پے میں توانائی دوڑا دی۔ اس وقت اس کے اندر ایک لاکھ حکیموں سے معرکہ آرائی کی اسپرٹ پیدا ہو چکی تھی۔

☆......☆......☆

تم باز نہیں آؤ گی...... میرا بھی کوئی احسان نہیں مانو گی...... اسی وقت چلی جاؤ یہاں سے...... ثمر چمن کا بازو دبوچے اس کی آنکھوں میں گھور رہا تھا۔

بس باہر سے سن کر آنکھوں سے یقین کر کے میری ایسی تیسی کرنے کا سوچنے لگتے ہیں...... آپ کو پتا ہے بات کیسے شروع ہوئی اور کیسے ختم ہوئی...... بازو چھوڑیں میرا...... اور انسانوں کی طرح بات کریں۔

مسلسل بے آرامی، تھکاوٹ اور روح چھلنی کرنے والے رویوں سے نڈھال چمن بھی اس جارحیت کو برداشت نہ کر سکی، بری طرح پھٹ پڑی۔

میں تمہیں چھوڑنے کی بات کر رہا ہوں...... تم بازو چھوڑنے کی بات کرتی ہو...... احسان فراموش عورت......

میں نے ہر طرح سے مارجن دیا...... ہر غلطی معاف کی...... تم نے مجھے میری نظروں میں گرا دیا میں نے پھر بھی آخری فیصلہ نہیں کیا...... رشتے کو نباہنے اور درگزر سے کام لینے کی کوشش کی۔

مگر اب It`s Too Much...... ابھی...... اسی وقت نکل جاؤ میرے گھر سے...... ثمر غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ بانو آپا نے اتنی ذہانت سے مناسب الفاظ تراش کر لگائی بجھائی کی تھی کہ ہر لفظ سیدھا نشانے پر جا کر لگا تھا۔

چمن کے لیے یہ الفاظ نئے نہیں تھے...... یہ شادی میرے صبر و ضبط، قربانیوں، درگزر اور برداشت سے چل رہی تھی...... آپ کا یا آپ کی ماں کا اس میں کوئی کردار نہیں ہے چمن بھی اب فیصلہ کن انداز میں بات کر رہی تھی۔

کوئی مارجن نہیں رکھ رہی تھی۔
کیا قربانیاں دی ہیں تم نے ......؟ لگژری گھر، کار، نوکر چاکر سب کچھ تھا تمہارے پاس ...... Cook کے لیے تم نے خود منع کیا تھا کہ گھر میں مرد نوکر نہیں چاہیے ورنہ میں تمہارے ناشتے کھانے کا بھی احسان نہ لیتا۔
سر پر کفن باندھ کر میرے لیے محاذ پر لڑنے گئی تھیں ......؟ ثمر زور سے دھاڑا باہر بانو آپا نے کلمہ تشکر ادا کیا۔
اپنی انا ...... اپنی Ego کو الٹی چھری سے ذبح کرتی رہی ہوں۔ ماں بننے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ پھر بھی اولاد سے محرومی کو قسمت کا لکھا جان کر سہہ رہی ہوں ......
مت سہو ...... تم نے پیسے دے کر جعلی رپورٹس تیار کرائی ہیں اب سن لو میرے منہ سے ...... میں تمہاری بات رکھ رہا تھا ورنہ پہلے ہی شور کر دیتا I am perfect ......
بس یہی کسر رہ گئی تھی ...... اب ہاتھ کے ہاتھ جعل سازی کا الزام بھی لگ گیا تھا۔ اتنی مضبوط بات ہوئی تھی کہ کوئی گنجائش نظر نہ آتی تھی۔ یہ پوائنٹ بھی بانو آپا نے ہی Raise کیا تھا۔ جو ان کی کسی دانشور سہیلی نے سمجھایا تھا اب وہ کمرے سے باہر رہ کر خاموش شنوائی کی تاب نہ رکھتی تھیں ......
لوہا گرم تھا دھڑ سے دروازہ کھول کر ضرب کاری لگانے آن پہنچیں تین لفظ گن کر بولو اور فارغطی دو میاں ......
کیوں چلا کر زہر اشق کرتے ہو ...... وہ بیٹے کے قریب جا کھڑی ہوئیں۔
جانے دیں اسے ...... طلاق کے پیپر اس کو مل جائیں گے ...... دو تین دن کے اندر اندر ...... آپ فکر نہ کریں امی جان ......
طلاق ...... پہلی بار ثمر نے یہ روح فرسا لفظ اپنی زبان سے نکالا تھا۔
طبل جنگ تھم گیا ...... جارحیت رُک گئی۔
جارحیت ہوتی ہی کمزوروں پر ہے۔ جنگ کے شوق، دل کی بھڑاس، پرانے ادھار، کینہ، بغض ...... فرسٹریشن، ڈپریشن، پوشیدہ احساسِ جرم زنجیروں سے بندھے نڈھال ضمیر کی صرف غراہٹیں ...... کیونکہ جارح سب سے پہلے ضمیر کے ہونٹوں پر ٹانکے بھرتا ہے۔
جارحیت کا شکار ...... کمزوروں کی بے بسی، اڑتی دھول، جلے خیموں کی راکھ، بھوک پیاس، سفر کے بجائے شکستگی سفرِ آخرت چاہے۔
خمارِ گندم اترا تو میزان شروع ہوا ...... نقصان، نقصان اور صرف نقصان حساب تو بالکل واضح تھا۔ آنہ، ماشہ، تولہ کی تو گنجائش ہی نہیں تھی۔ بالکل 2 جمع 2 کا سیدھا سا حساب ...... اس نے گھاٹے کا کھاتہ سنبھالا اور قدم اٹھانے کی کوشش کی۔ ماں دور تھی ...... عرش قریب تھا۔
یا اللہ ...... اس خسارے کے احساس کو میری روح کی قوت بنا دے تا کہ میں اپنی اس دو پل کی زندگی کو یوں گزاروں کہ جو بھی میرے قریب کمزور اور بے بس ہو اُس کی طاقت بن جاؤں۔
دکھ کی قوت سے میرے پیروں کو استقامت دے۔
ذلت کی شدت وانتہا کو میرے صبر کی چادر اوڑھا دے۔
میرے صبر کی وسعت سے زیادہ کچھ نہ ہو۔
میرے اس عظیم نقصان کو دوسروں کے عظیم فائدے سے بدل دے یا رب العالمین ...... آمین ...... ختم

آمین......

ظلم ہوتا ہے تو عرش بھی کانپتا ہے۔

عرش تو یوں سامنے جھلکا...... جیسے ایک ساتھ لاکھوں مظلوموں نے بیک آواز چیخ ماری ہو۔ کروڑوں دلوں نے 'ہائے' کی ہو اس نے یہ قیمتی لمحہ ضائع نہیں جانے دیا۔ ایسی توجہ سے دعا کی جیسے غلاف کعبہ تھام کر کی جاتی ہے۔

شریف گھرانوں میں طلاق کا حادثہ موت کے حادثے سے کم نہیں ہوتا۔ ماں کی آغوش سے محروم بچی کو اپنے بازوؤں میں سمیٹے وہ صرف ایک نکتے پر مرکوز تھی۔

ایک بیٹی کی رحلت وجدائی سے ہلکان ماں باپ کو روح فرسا خبر کیونکر سنائی جائے ماں باپ کے عظیم دکھ اور ان سے بے غرض و بے لوث محبت کی قوت نے اسے آہنی حوصلے کا ادراک دیا۔

خوشی اور غم انسانی جذبات کے دو رخ ہیں دونوں کی قوت بھی مساوی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ خوشی کی قوت میں دباؤ اور وزن نہیں ہوتا جبکہ غم کی قوت میں پہاڑوں جیسا بوجھ ہوتا ہے۔ خوشی میں پاؤں کہیں کے کہیں پڑتے ہیں اور غم کی قوت پاؤں کو زمین میں دھنسا دیتی ہے۔

قوت غم ہے جو یوں سنبھالے ہے مجھے
ورنہ بکھروں کسی لمحے تو سنبھلنا مشکل

قوت غم نے اس کے لرزتے قدموں کو اعلیٰ درجہ کا استحکام بخشا تھا۔ اس لیے کہ محبتوں کی قوت کا شکنجہ بھی بہت مضبوط تھا۔ گود میں بے ماں کی بچی پھر حیران و پریشان معصوم سی دو اُس کی بہنیں، شفیق و مہربان ماں باپ وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتی بیڈ کی طرف بڑھی۔ کسی وقت میں یہ خواب گاہ حجلۂ عروسی بنی تھی۔ بیڈ کے اطراف بیلے اور گلاب کی لڑیاں تھیں۔ ڈریسنگ اور سینٹر ٹیبل پر گلاب کے تازہ پھولوں کے گلدستے تھے۔

آج یہی خواب گاہ سلگتے انگاروں سے دہک اٹھی تھی۔

ایک بیڈ پر دو سرشار روحیں ہزاروں بار بہشتِ بریں کے جلوؤں سے ہمکنار ہوئی تھیں۔ آج وہی بستر سابقہ محبتوں کا مرقد بن چکا تھا۔ ازدواجی زندگی کے نشیب و فراز کی منزل ایک اتھاہ...... اتنا گہرا نشیب جس میں گرنے والے کی آواز کی شنوائی نہیں ہوتی...... ہر صدا...... صدائے بازگشت بن جاتی ہے۔

وہ حتمی فیصلے کی چادر اچھی طرح اوڑھ لپیٹ کر آگے بڑھنے کے لیے زادِ راہ سمیٹنے لگی۔

☆......☆......☆

''بیٹا...... اتنی رات کو بچی گود میں لے کر گھر سے نکل آئیں...... بچیاں آرام سے ہیں...... کیوں خود کو ہلکان کرتی ہو...... صبح سویرے آجاتیں...... عطیہ بیگم آدھی رات کو بیٹی کو دہلیز پر دیکھ کر بری طرح پریشان ہو گئیں۔ ساتھ ہی اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش بھی کر رہی تھیں۔ ماں تھیں، اس کی ازدواجی زندگی کے پیچ خم سے آشنا تھیں۔ خوامخواہ کے وہم ستا رہے تھے اطلاعات جو دل دے رہا تھا وہ تو مصدقہ تھیں مگر وہ انہیں وہم کا نام دے کر خود فریبی میں سہارے ڈھونڈ رہی تھیں۔

''بس...... یونہی دل گھبرا رہا تھا۔ ثمر بھی آج لیٹ تھے۔ امی جان تو عشاء پڑھ کر نو بجنے کے بعد سو جاتی ہیں۔''

’’میں نے سوچا...... آپ بھی تو اکیلی ہیں۔ دیر تک جاگتی ہیں۔‘‘ چمن نے بچی کو لٹانے کے لیے مناسب جگہ نظروں ہی نظروں میں تلاش کی ماں سے نظر چرانے کا اس سے زیادہ مناسب سلیقہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

کچھ بھی صحیح بے وقت گھر سے نکلنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ ساس کو بتا دیا تھا۔ عطیہ بیگم شدت غم کے موسم میں ذرا سی خود فریبی سے بہل جاتی تھیں۔ اب قدرے اطمینان سے گویا ہوئیں۔

’’جی...... ثمر اور امی جان کو پتا ہے کہ اس وقت میں کہاں ہوں۔ جواب میں سو فیصد سچ بولا تھا یہ اور بات کہ سچائی کی تفصیلات سربمہر تھیں۔

’’اچھی بات......‘‘ اب عطیہ بیگم واقعی مطمئن ہوگئیں۔

’’تمہاری ساس نے نور العین کو ساتھ رکھنے پر اعتراض تو نہیں کیا۔ اصولاً کرنا تو نہیں چاہیے کہ یہ تو اب بے ماں کی بچی ہے۔ اتنی انسانیت تو ایرے غیرے بھی دکھا دیتے ہیں۔‘‘

عطیہ بیگم نے اپنے سوال کے ساتھ اندازوں کے پرندے بھی اڑائے...... جی کسی کو کوئی اعتراض نہیں......

’’بچیاں سوگئی ہیں امی......؟ اس نے درد کی ٹیسیں برداشت کرتے ہوئے عطیہ بیگم کی توجہ کا رخ موڑا۔

’’ہاں...... انہیں تو میں جلدی سلا دیتی ہوں۔ صبح اسکول کے لیے اٹھنا ہوتا ہے۔ بچوں کی نیند پوری ہوجائے تو دن بھر بھاگتے پھرتے ہیں۔‘‘ عطیہ بیگم نے چمن کی گود میں سوئی ہوئی نور العین کے گال پر آہستگی سے پیار کیا۔

’’یاور بھائی کا فون وون آیا تھا۔‘‘ چمن ہر صورت عطیہ بیگم کی توجہ اپنی طرف سے ہٹا دینا چاہتی تھی۔ یہ سوال اسی کوشش کی کڑی تھا۔ عطیہ بیگم نے ٹھنڈی سانس بھری۔

آج مشکور صاحب نے بتایا کہ یاور ایک لاکھ کا چیک دے کر گیا تھا۔

’’ایک لاکھ......؟‘‘ چمن واقعی اتنی حیران ہوئی کہ اپنی پریشانی وقتی طور پر بھول گئی۔

’’کس خوشی میں......‘‘ چمن نے حیران حیران نظروں سے عطیہ بیگم کی طرف دیکھا۔

’’ابھی تو غم کے سائے ہلکے نہیں ہوئے...... کیسی خوشی بیٹا......‘‘ عطیہ بیگم کی آواز بھرانے لگی۔ دل بھرا ہوا پیمانہ تھا۔ ذرا سی جنبش سے آنکھوں کے راستے چھلک پڑتا تھا۔

کہہ رہا تھا...... چھوٹی بچی کے دودھ اور بڑی بچیوں کے اسکول کے اخراجات کی مد میں دے رہا ہوں۔ آئندہ بھی دیتا رہوں گا۔

آہ...... بات کے اختتام پر عطیہ بیگم نے پھر ٹھنڈی آہ بھری۔

’’پتا نہیں...... اپنے ضمیر کو بہلا رہے ہیں یا کوئی تاوان دے رہے ہیں چمن کے سلگتے وجود سے ایک انگارا گرا اور بجھ گیا۔ عطیہ بیگم نے ڈبڈباتی آنکھوں سے چمن کی طرف دیکھا۔

’’ایک دو دن رکو گی ناں......؟ یا......‘‘

’’یا سے آگے چمن کی ذمہ داری تھی۔‘‘

’’ایک دو دن...... چمن کے دماغ میں نئے سرے سے جھکڑ چلنے لگے۔ ہوں شاید...... زیادہ دن بھی رک سکتی ہوں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے اب آپ جا کر سو جائیں۔ چمن نے بولتے ہوئے ماں کی طرف سے پشت کرلی۔ کہ دکھ سے نڈھال ماں کے سامنے نہ دل کھولتے ہیں نہ آنکھیں۔

☆......☆......☆

چلی گئی......؟ ہمیشہ کے لیے......نہیں......نہیں......یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' ثمر خالی کمرہ خالی بیڈ متوحش نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

غصے کا شدید ابال بیٹھ رہا تھا۔

میں نے ہی تو اسے ہمیشہ کے لیے جانے کا کہا ہے......طلاق دینے کا فیصلہ سنایا ہے۔کیا آج ہم ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے......محرم' نامحرم بن گیا......اتنی آسانی سے بات ہی تو ہونا تھی۔

دیر سے آنے' موسم کے خراب ہونے' کھانا نہ کھانے' دن بھر کی مصروفیت کے بارے میں......کچھ بھی بات ہوسکتی تھی۔

یہ اچانک طلاق کی بات کہاں سے آ گئی۔ یہ اتنی خوفناک بات کہاں چھپی بیٹھی تھی؟ جیسے گھات میں بیٹھا ہوا شیر......شکار نظر آتے ہی ٹوٹ پڑا۔

یہ باتیں ہمیشہ برمحل نہیں ہوتیں......کبھی کبھی دل کے مقفل زنگ آلود کسی دروازے کے پیچھے کسی روزن سے تاک رہی ہوتی ہیں۔ موقع ملے تو گنواتی نہیں ہیں۔ روزن سے دھواں بن کر نکلتی ہیں، ٹوٹ پڑتی ہیں۔

مرد کا دل شتر کینہ......

بظاہر معاف کرتا رہتا ہے اور کینہ اثاثے کی طرح سنبھالتا ہے۔ایک دن نکالتا ضرور ہے۔

زخم پر زخم آتا رہے تو پہلا زخم ہرا رہتا ہے۔ نئے زخموں پر کھرنڈ آ جاتی ہے مگر پہلا زخم رستا رہتا ہے۔اور یہ یہی زخم ایک دن صدیوں کے حساب برابر کرتا ہے......زخم دینے والے کو وہ چار چوٹ کی لگاتا ہے کہ سارے قرض اُتار دیتا ہے۔

قرض اتر گئے تھے۔

ساتھ ہی رشتے کے لباس بھی......

مصلحتیں برہنہ ہو کر فیصلے کی چادروں سے خود کو ڈھانپ رہی تھیں۔

''ٹھیک ہو گیا......اسے اپنے حسن پر بہت غرور تھا......''

''ہونہہ......پرفیکٹ عورت......''

ایک مرد کے بستر پر آنے کے بعد عورت کے پاس بچتا ہی کیا ہے؟ ہو گی لوگوں کے لیے حسین و خوبصورت......

میں نے تو کھا کر تھوک دی۔

ثمر نے ضمیر کا منہ دبوچ لیا جو چیخنے چلانے کی پوری تیاری کر چکا تھا مرد کو اس کی اپنی نظروں میں گرانے والی عورت......اپنا عیب چھپا کر مرد کو گالی دینے والی عورت......

ایسی عورت کی یہی سزا ہے۔

بے اولاد طلاق یافتہ خوبصورت عورت......سڑک کنارے کڑوے بادام سے لدا ہوا درخت......ڈیکوریشن پیس......

ایسی انا پرست اور چالاک عورت کی یہی سزا ہے......ساری زندگی پرخلوص ساتھی کو ترستی رہے۔

کتنا برداشت کرتا......؟

کب تک برداشت کرتا......؟

کون کرتا ہے بانجھ عورت سے اتنی محبت......؟

ناشکری، احسان فراموش......

کمرے میں دم گھٹنے لگا تو لاؤنج میں چلا آیا۔ مگر یہ دیکھ کر ایک دم خود کو سنبھال لیا کہ بانو آپا بھی کسی گہری سوچ میں مستغرق نظر آئیں۔

ثمر کو اتنی رات تک جاگتا پا کر بدحواس ہو کر کھڑی ہو گئیں۔

''ارے...... ماں صدقے جائے...... ابھی تک سوئے نہیں......انہوں نے قریب آ کر ثمر کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''آپ بھی تو جاگ رہی ہیں...... حالانکہ آپ تو میڈیسن لے کر جلدی سو جاتی ہیں۔ ثمر نے سنبھل کر بات کی۔ اسے اپنی ہی آواز بہت نئی اور اجنبی محسوس ہوئی۔

''بس...... بیٹا...... جس گھر میں طلاق ہوتی ہے اس گھر کی پہلی رات ایسی ہی ہوتی ہے۔ جیسے مرد میت دفن کر کے واپس لوٹے ہوں۔ عورتیں رو رو کر تھک مری ہوں۔

بانو آپا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دوبارہ مخملی صوفے میں دھنس گئیں یہ تو موت سے بھی کچھ بڑھ کر ہے امی جان......

کفن دفن کے بعد صبر بھی آنا شروع ہو جاتا ہے۔

مگر اس کیس میں صبر کرنا...... بہت مشکل ہے...... ثمر بے بسی سے بولتا ہوا ماں کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

''اے ہٹاؤ...... کیا اول فول سوچنے لگے۔

''خبردار...... اس کا غم منانے کی ضرورت نہیں...... تم مرد ہو عدت میں نہیں بیٹھو گے...... کل ہی تمہارا نکاح ہو سکتا ہے۔ تم ہاں تو بولو بانو آپا کے من کی مراد پوری ہو چکی تھی۔ دور تک میدان صاف تھا۔ دادی کہلانے کی خواہش نے تڑپ کا روپ دھار لیا۔ بڑی بے صبری سے گویا ہوئی تھیں۔

ثمر نے ہونقوں کی طرح ماں کی صورت تکی......

''یہ کیا کہہ رہی ہیں امی...... یہ کوئی موقع ہے ایسی باتیں کرنے کا......؟''

''یہی موقع ہے...... خوشی کا انتظار نہیں کرتے...... اہتمام کرتے ہیں۔ میں تو اس منحوس کا نام بھی نہیں لینا چاہتی۔ اور نہ تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں...... گالی دیتی تھی وہ تمہیں......

دوسری شادی ہو گی تو وہ دنیا میں ذلیل ہو گی...... جب لوگوں سے سنے گی کہ ثمر کے بچے بالکل باپ پر ہیں۔ یا دادا دادی پر ہیں۔

منہ دکھانے قابل نہیں رہے گی...... دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے گا تمہیں سوگ منانے کی ضرورت نہیں۔ شکرانہ پڑھنے کی ضرورت ہے۔

ارے تم ہاں تو بولو...... اسی ہفتے تمہاری شادی کر دوں گی اور انشاء اللہ اگلے برس تمہارا بیٹا کھلاؤں گی۔ بانو آپا شدید جذباتی ہو گئیں۔ بہت تاک کر نشانہ لگایا تھا۔

''بیٹا...... وہ بھی اگلے برس...... شریانوں میں جوار بھاٹا اٹھنے لگا۔ کتنی بڑی قربانی دے رہا تھا میں...... مگر

اس عورت کو قدر نہیں تھی۔ شاید دوسری شادی کرنا میرے لیے ایک مرحلہ ہوتا......

مگر اس نے میری مردانگی پر ضرب کاری لگائی ہے۔ اس کا جواب تو دوسری شادی کے ذریعے ہی دیا جا سکتا ہے اور دینا بنتا ہے۔

''امی جان...... آپ فکر نہ کریں...... جو آپ چاہتی ہیں ویسا ہی ہوگا۔ مگر آپ اتنی جلدی بھی نہ کریں...... مجھے کچھ وقت دیں۔

دوسری شادی کرنا تو پہلی شادی کرنے سے زیادہ ضروری ہوگیا ہے امی جان۔'' یہ کہہ کر ثمر ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ مزید بات کرنے کی قوت کھو چکا تھا۔ اعصاب چیخ چیخ کر بے دم ہو رہے تھے۔

وہ آگے بڑھ گیا۔ خوشی کی تیز ہوا میں بانو آپا کے الفاظ اُڑے جا رہے تھے۔ جن کو پکڑنے کے چکر میں ثمر ہاتھ سے نکل گیا۔

وہ پُر مسرت کلمات منہ سے نکالنے کی حسرت لیے ثمر کے نقش قدم دیکھنے لگیں۔

☆......☆......☆

بہن کیا بتاؤں بہت دکھی ہیں ہم لوگ...... جوان جہان بہو داغ مفارقت دے گئی۔ بہو نہیں تھی...... ہماری بیٹی تھی۔ ارے اتنے ارمانوں سے بیاہ کر لائی تھی۔ ہتھیلی کا چھالہ بنا کر رکھا تھا۔ اسے دیکھ دیکھ کر جیتی تھی۔ وہ بھی امی امی کہتی پیچھے پیچھے پھرتی تھی۔ فردوس مگرمچھ کے آنسو دوپٹے سے پونچھتی بڑی رقت بھری آواز میں اظہار غم کر رہی تھیں۔ ان کی عزیز از جان سہیلی گرین سگنل ملتے ہی رشتے کی بھاگ دوڑ میں لگ گئی تھی۔ اور اسی سلسلے میں لڑکی والوں کو یاور کا گھر بار دکھانے لے آئی تھی۔ جو گھر بار دیکھ کر بہت متاثر نظر آ رہے تھے۔ پانچ سو گز کا ڈبل اسٹوری بنگلہ...... کسی لائق آرکیٹیکٹ کے ہنر کا منہ بولتا ثبوت' پورچ میں کھڑی 1976ء کی (فور) وہیل کے ساتھ سی گرین XLI دونوں گاڑیوں نے وسیع پورچ گھیر رکھا تھا۔ لان میں کھلے خوش رنگ پھول، چیکو، آم اور شریفے کے درخت گیٹ پر پھیلی مارننگ گلوری، عقبی دیوار پر بوگن ویلیا، ڈرٹی کچن سے ملحق چھوٹا سا ویجی ٹیبل گارڈن جو مرحومہ ایمن کے شوق و محنت کا ترجمان تھا۔ درحقیقت یہ حصہ اس کے خوابوں کی حسین دنیا تھا اور اس کی جائے پناہ بھی، بچوں کے اسکول جانے کے بعد اس کا زیادہ وقت ادھر ہی گزرتا تھا۔

کچن کا دروازہ کھول کر ڈرٹی کچن میں آتی اور یہاں سے ایک چھوٹا سا دروازہ ویجی ٹیبل گارڈن میں کھلتا تھا۔ اسی دروازے سے وہ اپنے گارڈن میں آ جاتی۔ چٹنی کے لیے ٹماٹر پودینہ' ہری مرچیں توڑتی، بھنڈی تیار ہوئی تو وہ اتارتی، کیاریاں صاف کرتی پانی ڈالتی......

گھر کی دوزخ میں یہ چھوٹی سی جنت تھی۔ فردوس کی گھاگ نظروں نے تاڑ لیا تھا کہ آنے والی خاتون بہت متاثر نظر آ رہی ہیں۔ جھٹ بہانے سے سارے گھر کا Visit کرا دیا اور پہلی مرتبہ بغیر سوچے سچ بھی بول دیا کہ یہ ویجیٹیبل گارڈن ان کی پیاری مرحومہ بہو نے لگایا تھا۔

گھر کے ساتھ ساتھ خاتون فردوس سے بھی از حد متاثر نظر آ رہی تھیں۔ جو بہانے بہانے سے اپنی مرحومہ بہو کو بہت محبت سے یاد کر رہی تھیں اور مارے محبت کے اس کے ہاتھوں لگایا ہوا ویجیٹیبل گارڈن تک دکھا رہی تھیں۔

''ماشاءاللہ...... بہت محنتی اور سلیقہ مند بہو ملی تھی آپ کو...... ان کا یہ بے ساختہ ردِعمل تھا۔

''آہ...... ہا...... چار دن کی چاندنی تھی۔ فردوس نے بھی یوں کہا گویا سینے میں درد کی ٹیس اُٹھ رہی ہوں۔
''خود کو سنبھالو فردوس...... اور صبر سے سہارا پکڑو...... اللہ بہت جلد تمہیں بہت اچھی بہبود دے گا ہونی کو کون ٹال سکتا ہے ہونی ہو کر رہتی ہے۔...... قسمت میں یہی لکھا تھا۔ پیاری سہیلی نے مطلب کی بات کرنے کے بہانے دلاسے دیے۔
''ہاں جانے والے چلے جاتے ہیں۔ یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔ میں تو اپنے جوان جہاں بیٹے کو دیکھتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔
فردوس نے اپنی سوکھی آنکھیں پھر آنچل سے رگڑیں۔ رگڑ سے آنکھوں میں جلن ہوئی تو قدرتی طور پر نمی اتر آئی۔ دیکھنے والوں کو 'شدت گریہ' کا گمان ہوا۔
سہیلی جن کا اسم گرامی غزالہ تھا...... یہ دیکھ کر پھولی نہ سمارہی تھی کہ پروجیکٹ کامیابی کی طرف جاتا نظر آرہا تھا۔
''بس...... میں تو اپنے بچے کی تنہائی دیکھ کر جلد سے جلد اس کا دوسرا نکاح کرنا چاہتی ہوں۔ ورنہ کیسی شادی اور کہاں کا بیاہ...... دل تو غم سے بوجھل ہے۔ مگر اولاد کا منہ دیکھتی ہوں تو دل کو سمجھانا پڑتا ہے۔
اتنا بڑا گھر تو جیسے پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہے۔ فردوس کی آواز پھر گلوگیر ہونے لگی۔
''صبر کرو فردوس...... اللہ تمہارے اس گھر کو پھر خوشیوں سے بھر دے گا۔'' سہیلی نے دل جوئی کا سارا زور مہمان خاتون کو متاثر کرنے کے لیے لگایا تھا۔ ساتھ ہی ان کی طرف کن آنکھیوں سے دیکھ بھی رہی تھیں۔
''آہ...... ہا...... صبر کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔'' فردوس نے پھر آہ بھر کر کہا تھا۔

☆......☆......☆

''چھوڑیں امی...... یہ ڈرامہ پہلے بھی سو مرتبہ ہو چکا ہے۔ آپ ہر بار خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اور وہ ہر مرتبہ منہ اُٹھا کر واپس آجاتی ہیں۔''
افشاں پر اس تھرلنگ نیوز کا مطلق اثر نہ ہوا تھا۔ کوفت بھرے لہجے میں گویا ہوئی تھی ماں کے صبح صبح کے فون کے بعد کہ میاں کام پر چلا جائے تو مجھے فون کرنا بہت دھماکہ خیز خبر سنانا ہے تمہیں...... افشاں سے پل کاٹنا دوبھر ہو گیا تھا۔ آج شوہر نامدار بھی لیٹ گئے تھے اور ان کے جانے کے بعد ساس نے طلب کر لیا تھا جب ان کے پاس پہنچی تو یہ دیکھ کر ماں کا فون ہی بھول گئی کہ ساس صاحبہ سردیوں کے استقبال کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ بلینکٹس، مون لائٹ چائنا شنگھائی کی نادر روزگار رضائیاں، ملتان کی جازم، فیصل آباد کی رنگین دریاں، غالیچے اور جانے کیا کیا...... ساتھ ہی چار پٹ کی وارڈروب کے چاروں پٹ کھلے ہوئے اور آدھے سے زیادہ کپڑے زمین پر ڈھیر تھے۔
بھئی آج ماسی کو آتے ہی اس کام پر لگا دو...... چھت پر پھیلا دے گی۔ پچھلے سال بھی دھوپ لگنے سے رہ گئے تھے۔
افشاں کی شکل دیکھتے ہی انہوں نے پروجیکٹ سمجھا دیا۔
وہ جو دھماکہ خیز خبر سننے کے لیے تڑپ تڑپ کر آدھ موئی ہو جا رہی تھی یوں ہو گئی جیسے مرے پر سو دُرے۔
یہ کمبل احتیاط سے گن لو...... ان ماسیوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ میرا ایک کمبل پہلے بھی گم ہو چکا ہے۔

تمہارے سسر آزاد کشمیر سے لائے تھے۔ آج کل ایسے کمبل دیکھنے کو بھی نہیں ملتے۔

''اماں یہ اتنے سارے بستر کیوں سنبھال رکھے ہیں۔ غریبوں میں بانٹ دیں ثواب ملے گا۔'' افشاں کی جان جل کر خاک ہونے لگی۔ ساس صاحبہ نے افشاں کو یوں گھورا جیسے اس کی گردن ہی دبوچ لیں گی۔

''گھر میں دور پار کے مہمان بھی آتے ہیں۔ آج کل کی لڑکیوں میں گھر گرہستی کا شعور ہی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں رواج نہیں ہے کہ برتنے کی چیزیں ہمسایوں سے مانگتے پھریں۔'' انہوں نے بری طرح لتاڑ دیا۔

افشاں چپ سادھ رہی۔ ماسی آئی اُس کی جان چھوٹی...... اماں نہانے چلی گئیں اور اُس نے سکھ کا سانس بھر کر تڑپتے ہوئے ماں کو فون ملایا۔

شل اعصاب پر ہی گھسی پٹی خبر کا بوجھ پڑا جس نے اس کے غم و غصے میں اتنا اضافہ کر دیا تھا کہ ماں کی طرح آئے دن B.P ہائی رہنے لگا تھا۔

ارے اس نے صاف صاف طلاق دینے کی بات کی ہے۔ بانو آپا نے بڑے جوش و خروش سے خبر کا باکس بنایا اور اپنے حساب سے اخبار کے فرنٹ پیج پر عین درمیان میں پیسٹ کیا۔

''دی تو نہیں......'' افشاں نے برجستہ کہا۔ موڈ بہت خراب ہو چکا تھا۔ ارے اس نے ناشکری کے منہ پر کہا ہے تم ماں کے گھر پہنچو۔ پیچھے پیچھے طلاق کے پیپر پہنچ جائیں گے۔''

''جب پہنچیں گے...... تب دیکھیں گے......'' افشاں میں ہنوز سرگرمی ناپید تھی۔

''ارے تم سمجھ نہیں رہیں...... میں نے خوب پکا کیا ہے اب تو ناک بھی رگڑے گی تو نہیں بسانے کا...... خارخطی ہو گئی۔ سمجھ لو......''

جب طلاق کے پیپر دیکھوں گی تب ہی یقین کروں گی۔ آپ تو بہت سیدھی ہیں۔ بھابی جادو کی چھڑی گھمائیں گی اور بھائی سر پر بٹھا کر لے آئیں گے۔ افشاں نے بے مزہ ہو کر فون بند کرنے کا ارادہ کیا۔

تاریخ ڈال کر میری بات لکھ لو...... اللہ نے ہماری سن لی...... اب تو اس کا باپ بھی آ جائے تو بات نہیں بنے گی۔ بانو آپا کے لہجے میں یقین و وثوق کی وہ کیفیت تھی کہ افشاں بھی سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ ضرور کچھ ایسا ہو گزرا ہے کہ ماں کے اندر اس بلا کا اعتماد ہے۔

''طلاق کے پیپرز دیکھ لیں تو بتایئے گا...... پھر میں بھی وہ پیپرز دیکھوں گی اور پڑھوں گی...... فی الحال تو بری طرح پھنسی ہوئی ہوں۔ ہماری ساس صاحبہ نانی کا جہیز کھول کر بیٹھی ہیں، خدا حافظ امی جان...... موقع ملا تو چکر لگاؤں گی۔''

افشاں نے اپنی طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا کیونکہ ساس صاحبہ کی پکار پڑنا شروع ہو چکی تھی۔

نانی کا جہیز...... بانو آپا...... ذہن پر زور ڈالنے لگیں کہ ان الفاظ کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟'' کڑھن بھی تھی، دل کی دل ہی میں رہ گئی تھی۔

☆......☆......☆

رات بھر نیند ٹوٹی رہی تھی۔ صبح کے اجالے نے تھکا مارا...... جیسے رات بھر میلوں پیدل چل کر گھر پہنچا تھا۔ پختہ عادت کے سبب بایاں بازو بائیں جانب پھیلتا چلا گیا۔ مگر اس پھیلاؤ میں کوئی رکاوٹ نہ آئی۔ بازو جہاں تک جا سکتا تھا چلا گیا۔ دل خالی ہونا مشکل مگر بستر بڑی آسانی سے خالی ہو گیا تھا۔

شعور نے یقین دہانی کرائی اور تمام حواس مکمل بیدار ہو گئے۔ مگر اتنے بوجھل ہو گئے جیسے وقتی طور پر سارا وجود مفلوج ہو گیا ہو۔

میں اس یقین کے ساتھ مارجن دیتا رہا۔ معاف کرتا رہا کہ اس عورت کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد ہوں۔ اس کی خدمت اس کی محبت کا اظہار ہے۔ مگر وہ تو ہر وقت اپنے دل میں زہر چھپائے رہتی ہے ذرا سا وقت ملتا ہے اور مجھے میری نظروں میں گرا دیتی ہے۔ اتنے برس ساتھ رہنے کے بعد بھی اس طرح کی بات کرتی ہے۔ اتنے برسوں میں بھی اسے پتا نہیں چلا میں کتنا قابل ہوں اور کتنا نالائق......

اس طرح سے ساتھ رہنے کا کوئی مزہ...... کوئی فائدہ نہیں...... کہ مجھے ہر وقت اپنی عزت خطرے میں محسوس ہو اور وہ ہر وقت اپنی محرومیوں کی ذمہ داری مجھ پر ڈالتی رہے سب ٹھیک ہو گیا۔ کچھ غلط ہی چل رہا تھا۔

ثمر نے گہری سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔

یوں محسوس ہوا جیسے عرصہ دراز سے سارا وجود زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ کوئی کرامت ہوئی اور ایک چھنا کے سے زنجیریں کٹ گریں۔

بچھڑتے وقت اگرچہ دلوں کو دکھ تو ہوا
کھلی فضا میں سانس لینا مگر اچھا لگا

بعض اوقات اچانک بہت سے بوجھ سر پر آپڑتے ہیں۔ لیکن وہ جگہ میسر نہیں آتی جہاں سر سے بوجھ اتار کر ڈھیر کر دیے جائیں۔

بوجھ تلے دبا وجود آہستہ آہستہ قدم رکھتا آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اچانک لرزیدہ قدم لڑکھڑاتے ہیں۔ اور انسان تمام بوجھ کے ساتھ گر پڑتا ہے۔ بوجھ بھی گر جاتے ہیں۔ اتر جاتے ہیں۔ اس کے باوجود دوبارہ کھڑا ہونے میں وقت لگتا ہے۔

صورت حال یہی تھی۔ بوجھ تو اتر گئے تھے مگر بستر سے اترنا ایک مرحلہ لگ رہا تھا اسی وقت اس کے سیل فون پر بیل ہوئی تھی۔ دل جو ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا یوں اچھلا جیسے کسی ڈوبنے والے نے پانی سے باہر آنے کی آخری کوشش کی ہو۔

دھیان قدرتی طور پر چمن ہی کی طرف گیا۔ گزرے ماہ و سال کی سینت کر رکھی ہوئی خوش فہمیاں عموماً ایسے ہی موقعوں پر کام آتی ہیں۔

شاید اسے نقصان کا احساس ہوا ہو...... شاید اس نے معافی مانگنے کے لیے فون کیا ہو...... سیل تک ہاتھ بڑھاتے ہوئے اتنا سوچ لیا تھا۔

''مگر...... سامنے ندا کا نام بلنک ہو رہا تھا۔

اس وقت اس کا موڈ اس بات کی اجازت نہیں دے رہا تھا کہ وہ اپنے سماجی تعلقات نباہے۔ بےزار کن انداز میں اس نے سائلینٹ کر دیا کاٹنے کی صورت میں اندیشے تھے کہ وہ باز نہیں آئے گی اور پریشان ہو کر دوبارہ ٹرائی کرے گی سیل ایک طرف ڈال کر وہ اپنی توانائی بحال کرنے کی کوشش کرنے لگا تا کہ بستر چھوڑ کر اپنے معمول کے کام انجام دے۔ مگر سیل پر رنگ دوبارہ ہونا شروع ہو گئی۔ وہ آج آفس نہیں گیا تھا ذمہ دارانہ پوسٹ تھی سیل آف بھی نہیں کر سکتا تھا۔ آڈٹ چل رہی تھی کوئی بھی اہم کال آسکتی تھی۔

یہ تو ایک بلا میں نے اپنے پیچھے لگالی ہے۔ اس نے پھر سیل سائلینٹ کرتے ہوئے کوفت کے عالم میں سوچا۔ ناپسندیدگی کے احساس میں بھی بڑی قوت ہوتی ہے۔ فزکس میں فورس کا قانون پڑھانے والے اس اہم نکتے کو آج تک فراموش کیے ہوئے ہیں۔

اس کی شدت کا ادارک بہت کم لوگوں کو ہوا ہوگا۔ وہ اس قوت کے زور پر ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا۔ اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سوفٹی پاؤں میں پھنسائی اور واش روم کی طرف اتنے عجلت بھرے انداز میں بڑھا گویا کسی کونے سے ندا نکلے گی اور اسے دبوچ لے گی۔

واش روم کا دروازہ بند کرتے ہی اسے یوں سکون محسوس ہوا جیسے اپنے تعاقب میں آنے والے لٹیروں سے اس کی جان چھوٹ گئی ہو اور وہ بحفاظت اپنی منزل پر پہنچ گیا ہو۔

ویسے بھی جب سے اٹیچڈ واش روم تخلیق ہوئے ہیں۔ یہ بحران سے دوچار لوگوں کی پناہ گاہیں بن گئے ہیں۔ کیونکہ پرانے زمانے کے واش رومز کی طرح یہاں باریاں نہیں لگتیں اس لیے اندر والے کو باہر آنے کی عجلت نہیں ہوتی۔ بہت سارا رونا ہو تو اس سے بہتر جگہ کوئی نہیں۔

بدزبان بیوی کسی طرح چپ نہ ہو رہی ہو تو بہترین جائے پناہ ہے۔ اندر گھسو شاور کھولو اور اس کے نیچے کھڑے ہو کر دنیا کی فکروں سے آزاد ہو جاؤ میاں مرنے مارنے پر تل جائے تو بھاگ کر واش روم میں جاؤ اور اندر سے دروازہ بند کر کے حالات معمول پر آنے کا انتظار کرو۔ اور اس وقت تک اس پناہ گاہ کا فائدہ لو جب تک میاں کو خود شدید حاجت پیش نہ آئے کیونکہ وہ اس حالت میں مرنے مارنے بلکہ منافع کا سودا بھی ملتوی کر دے گا۔

شاور کی پھوار میں بھیگتے ہوئے ثمر کو یونہی محسوس ہوا جیسے وقتی طور پر اسے بے شمار تفکرات سے نجات مل گئی ہو۔

کیا ضرورت تھی اتنی ہمدردی بگھارنے کی...... یہ گھنٹی تو اپنے گلے میں، میں نے خود ہی ڈالی ہے۔ نیم گرم پانی سر پر پڑ رہا تھا۔ اور وہ سکون سے اپنی غلطی کا اعتراف کر رہا تھا...... فزکس اور کیمسٹری باہم مخلوط ہو چکے تھے۔

☆......☆......☆

جوان بیٹی کی دائمی جدائی سے نڈھال ماں باپ کی طرف دیکھ کر چمن بڑی بے اختیاری کیفیت میں سوچتی کہ اپنا بیگ اُٹھا کر انہی ظالموں کی کچھار میں واپس چلی جائے۔ آخر وہ کس طرح سے ایک اور نئی بری خبر ماں باپ کو سنا پائے گی۔

اگر وہ خود سے یہ خبر نہ بھی سنائے دروازے سے ہر آنے والی کوریئر ڈاک تو زیادہ تر مشکور حسین ہی ریسو کرتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر واقعی طلاق نامہ آ گیا پھر تو کچھ نہیں ہو سکے گا۔ ردِعمل کے طور پر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مشکور حسین تو پہلے ہارٹ پیشنٹ ہیں۔ ان پر تو یہ خبر بجلی بن کر ہی گرے گی۔

اس خیال کے آتے ہی بدحواسی پندار پر غالب آ گئی۔ اس نے بڑی بے ساختگی کے عالم میں ثمر کو فون ملایا تھا۔ مگر کئی مرتبہ کی کوششوں کے باوجود کوئی رسپانس نہیں ملا تھا۔ لینڈ لائن نمبر ملانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک تو یہ کہ بانو آپا ہر آنے والی کال یوں لپک کر ریسیو کرنے کی عادی تھیں جیسے کسی کی انتہائی ضروری کال کا انتظار کرنے والا بے تابی سے ریسور اٹھاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ آفس ٹائم تھا۔

کئی مرتبہ کی مایوسی کے بعد اس نے آفس فون ملایا تو پتا چلا کہ ثمر صاحب آج آفس ہی نہیں آئے۔
طرح طرح کے وسوسوں اور اندیشوں نے دل کو گھیرے میں لے لیا۔
شاید وہ طلاق کے پیپرز تیار کرانے کسی وکیل کے آفس پہنچا ہو۔
''شاید...... یہ...... شاید وہ......'' وہ سخت آزمائشی دورانئے سے گزر رہی تھی۔ معاً قدرت نے اس کیفیت کو ایک فطری پریشانی میں تبدیل کر دیا۔
اُس کی نظر نور العین پر اتفاقاً پڑ گئی تھی جو بالکل سیدھی لیٹی زور زور سے جھٹکے لے رہی تھی ہر جھٹکے کے بعد دوسرے جھٹکے میں اتنا ہی وقفہ تھا جو مسلسل ہچکیوں کے دوران ہوتا ہے۔ اس سے بھی خطرناک بات جو نظر آئی تھی وہ یہ کہ اس کی پتلیاں پپوٹوں کے اندر اوپر چڑھ گئی تھیں صرف آنکھوں کی سفیدی نظر آ رہی تھی۔
اس کے حلق سے بڑی دلدوز چیخ نکلی تھی۔
''امی......؟'' کچن میں بچوں کے لنچ کی تیاری میں مصروف عطیہ بیگم کے ہاتھ سے چھری دور جا کر گری۔ مہ پارہ اور مہ وش تو آج اسکول گئی تھیں۔ ان کی طرف تو ذہن جا ہی نہیں سکتا تھا۔ کانپتی لرزتی چمن کی طرف بھاگیں۔
چمن بچی کو گود میں اٹھا چکی تھی۔ بچی کو چھوتے ہی یوں محسوس ہوا اس نے کوئی انگارہ چھو لیا ہو۔
آناً فاناً اتنا تیز بخار، ایک گھنٹہ پہلے ہی تو اس نے اسے فیڈر دے کر سلایا تھا۔ نیپی بھی Change کی تھی۔ ریشنل لگاتے ہوئے باڈی ٹمپریچر بھی نارمل محسوس ہوا تھا۔
''کک کک...... کیا ہوا چمن......؟'' عطیہ بیگم نے بے تابانہ انداز میں بچی کو گود میں لینے کے لیے ہاتھ بڑھا دیے۔
''امی...... میں نے دیکھا اس کو Fits پڑ رہے تھے۔ اور ہاتھ لگا کر دیکھیے کتنا تیز ٹمپریچر ہے۔ ایک گھنٹہ پہلے تو بالکل نارمل تھی۔ امی...... جلدی سے چلیں...... ڈاکٹر کو دکھائیں۔ چمن جیسے رونے والی ہوگئی۔ Infant سنبھالنے کا پہلا پہلا تجربہ تھا۔ دوسرے یہ کہ یہ بچی اس کے پاس امانت تھی۔ احساسِ ذمہ داری نے بھی حواس باختہ کر دیا تھا۔
''ہاں...... اسے تو واقعی بہت تیز بخار ہے۔'' عطیہ بیگم بھی پریشان نظر آئیں۔ امی اس کو زور زور سے Fits پڑ رہے تھے۔ بات بہت سیریس ہے یہ تو بہت چھوٹی ہے صرف چند دن کی...... بابا جان سے کہیں جلدی سے گاڑی نکالیں۔ چمن نے بولتے ہوئے پھر بچی کے گال اور پیشانی چھوئے...... ہاں تم اس کا ضروری سامان اور پانی کی بوتل رکھو۔ میں تمہارے بابا کو کہتی ہوں وہ باہر لان میں ہی ہیں۔
عطیہ بیگم کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ گرتی پڑتی بھاگیں۔ چمن جلدی جلدی بچی کی ضروری چیزیں مثلاً اس کا دودھ، گرم پانی کا فلاسک' فیڈر نیپیز' بخار کی میڈیسن بیگ میں رکھنے لگی۔ فوراً ہی خیال آیا اسے ایک ڈوز پیناڈول سیرپ تو فوراً ہی دینا چاہیے۔ راستے میں پتا نہیں کتنی دیر لگے۔
اب ذہن صرف اور صرف بچی کی طرف تھا۔ آپ بیتی ایک طرف ہوئی جگ بیتی شروع ہوگئی۔

☆......☆......☆

سات مس کالز...... ثمر کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ قیامت تک پکارتی رہو۔ میں پلٹ کر

دیکھنے والا نہیں۔
زندگی کو تماشہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ میری تو میری، میری ماں کی دل آزاری کرتی ہو۔ تمہاری وجہ سے میں انہیں دکھ دیتا رہا ہوں۔ مگر وہ ماں ہیں میری خوشی پر راضی ہوتی رہی ہیں۔ معاف کرتی رہی ہیں۔
اس عورت نے تو مجھے جہنم کے دہانے پر کھڑا کر دیا ہے۔ وہ بات جو صرف مجھ سے کی جا سکتی ہے۔ ماں سے کرتی ہے۔ مجھے میری ماں کی نظروں میں گراتی ہے۔ کیا گزرتی ہوگی اُن پر...... ثمر کی شریانوں میں جوار بھاٹا اُٹھ رہا تھا۔ اگر چمن اس وقت سامنے ہوتی تو شاید وہ اس پر ہاتھ بھی اٹھا دیتا۔
مگر دیہاتی شوہر فوراً ہی فزیکل ٹارچر پر آ جاتا ہے جبکہ شہری شوہر مینٹلی ٹارچر اس قیامت کا کرتا ہے کہ روح پھوڑے کی طرح دنوں درد کرتی ہے یہی درد لے کر چمن اس گھر سے لے کر نکلی تھی۔
میری دنیا و آخرت میری ماں کے ساتھ وابستہ ہے۔ ماں تو ایک ہی ہوتی ہے۔ عورت تو کبھی بھی کہیں بھی مل جاتی ہے۔
ثمر نے مس کالز Delete کر دیں اور یوں چاق و چوبند ہو کر ایکسرسائز کرنے لگا گویا اکھاڑے میں اترنے کی تیاری کر رہا ہو۔
انتقام کا جذبہ یوں چپکے سے در آیا۔ جیسے بارش کا پانی چھت میں ٹپکنے کی جگہ فوراً ہی تلاش کر لیتا ہے۔
دوسری شادی بھی ہوگی۔ اس آنگن میں بچے بھی کھیلیں گے۔ میری قربانیوں کا بہت اچھا صلہ دیا ہے۔ اب مجھے بھرپور جواب دینا ہے۔
ثمر کی اَنا اس بری طرح زخمی تھی کہ وہ بے تابی سے مرہم تلاش کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

چمن عطیہ بیگم اور مشکور احمد کے ساتھ بچی کو شہر کے بہت بڑے ہاسپٹل میں لے آئی تھی وہ کسی قسم کا بھی رسک لینا نہیں چاہتی تھی۔
چائلڈ اسپیشلسٹ علی عثمان کے روم کے باہر بہت سے لوگ بچوں کو لیے بیٹھے تھے مگر بچی کی حالت کی وجہ سے اسے ایمرجنسی میں دکھایا گیا۔ ڈاکٹر علی عثمان بطور چائلڈ اسپیشلسٹ اپنا ایک خاص مقام بنا چکے تھے۔ OPD میں دیکھے جانے والے بچوں کی حالت کے پیش نظر OPD ڈاکٹرز ڈاکٹر علی عثمان کو ہی Recomendate کرتے تھے۔
ڈاکٹر علی نور العین کا معائنہ کر رہے تھے اور چمن بے تابی سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اچھی صحت کا غماز ترو تازہ نکھرا نکھرا چہرہ گھنی مونچھوں نے اوپری ہونٹ آدھا ڈھانپا ہوا تھا۔ شرٹ کی آستینیں تھوڑی فولڈ کی ہوئی تھیں۔ جن سے جھانکتا بانہوں پر گہرا سیاہ رواں ایک بھرپور مردانگی کا تاثر دے رہا تھا۔
”بچی کو کون سا دودھ دیتی ہیں۔“ ڈاکٹر علی عثمان نے اپنے چہرے پر چمن کی نظروں کی تپش محسوس کرتے ہوئے براہِ راست دیکھنے سے گریز کیا اور دودھ کی بابت پوچھا۔
چمن نے برانڈ بتا دی۔
”آپ کیوں اس معصوم کی حق تلفی کر رہی ہیں۔ بچے کے لیے ماں کے دودھ سے بڑھ کر کوئی غذا نہیں۔ آپ اسے خود فیڈ کرائیں۔ بچی بہت ویک ہے۔ خاص طور پر اس کا برین بہت Effected لگ رہا ہے۔ آپ نے

During Pregnancy شاید منرلز اور اسپیشلی فولک ایسڈ استعمال نہیں کیا۔
ڈاکٹر علی عثمان اپنے پیشہ ورانہ انداز میں بولتے جا رہے تھے۔ چمن گھبرا کر عطیہ بیگم کی طرف دیکھنے لگی تھی۔
اس نے ایک نظر ڈاکٹر علی عثمان کو دیکھا پھر خود کو سنبھال کر بڑے پروقار انداز میں گویا ہوئی۔
''بچی بہت ویک ہے۔ بیمار ہے تب ہی تو آپ کے پاس لے کر آئے ہیں۔'' لہجے میں کچھ خاص تھا ڈاکٹر علی نے چونک کر چمن کی طرف پل بھر کو دیکھا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہے ہوں کہ ہوں...... تو آپ مجھے میرا کام یاد دلا رہی ہیں۔ کیونکہ آپ نے تو اپنے حصے کا کام نہیں کیا۔
یہ ایک دو ضروری ٹیسٹ کرانا ہوں گے۔ ابھی ایک انجکشن لگے گا۔ یہ دو سیرپ آپ لے لیں۔ رات تک دو مرتبہ پلا دیں۔ انشاء اللہ کل صبح سے پہلے بچی کی طبیعت سنبھل جائے گی۔
ڈاکٹر علی عثمان کی عمر 35' 40 کے درمیان کی عمر ظاہر ہو رہی تھی۔ طرزِ کلام میں دھیما پن اور شائستگی نمایاں تھی۔ اندازِ مسیحائی بہت دلفریب تھا۔ پریشان حال کو تو ان کے چند الفاظ سے بھی بہت ڈھارس بندھتی محسوس ہوتی تھی۔
کسی چائلڈ اسپیشلسٹ سے براہِ راست پہلی بار چمن کا سابقہ پڑا تھا۔ بچوں کی مسکراہٹیں واپس لانے والوں کے انداز اسی طرح کے ہونے چاہئیں۔ بچوں سے محبت کا فطری احساس تو اس کائنات اور انسانیت کی روح ہے وہ ڈاکٹر علی عثمان سے نہیں بچوں کے شفیق مسیحا سے متاثر ہوئی تھی۔
ان کا یہ جملہ کہ بچی کی حالت سنبھل جائے گی اپنے اندر اتنی توانائی رکھتا تھا۔ چمن پژمردہ اعصاب جاگ اٹھے۔ گویا مرجھائے سبزے پر پھوار پڑ گئی ہو۔
''تھینک یو ڈاکٹر...... آپ کی طرف سے مزید کوئی ایڈوائز......؟'' چمن نے بچی کو اٹھاتے ہوئے فزیشن سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔
''بچی کو اپنا دودھ پلایئے۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر علی عثمان رکے نہیں۔ اگلے ایمرجنسی پیشنٹ بچے کی طرف احساس ذمہ داری سے بڑھتے چلے گئے۔ چمن نے پھر عطیہ بیگم کی طرف دیکھا۔
پریشان ہونے کی ضرورت نہیں...... اور ڈاکٹر کو یہ بتانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں کہ اس بچی کی ماں اس دنیا میں نہیں ہے۔ بتا بھی دیں تو کیا وہ واپس آ جائے گی۔ عطیہ بیگم نے میڈیسن کی سلپ تہہ کر کے اپنے ہینڈ بیگ میں رکھتے ہوئے بہت آہستہ آواز میں چمن کو خلفشار سے نکالا۔ لہجے میں اولاد کی دائمی جدائی کا درد ہنوز تھا دونوں کا رخ اب میڈیکل اسٹور کی طرف تھا۔

☆......☆......☆

ثمر بیڈ روم سے باہر آ کر نہیں دے رہا تھا اور بانو آپا سے وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ دل بہلانے کے لیے پیاری سہیلی کو فون ملایا ابھی بات شروع ہی کی تھی کہ ثمر آتا نظر آیا جلدی سے لائن کاٹ دی اور بولیں۔
''بس کیا بتاؤں...... میرے دکھ کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا۔ یہ تو میں ہی جانتی ہوں کس طرح برداشت کر رہی تھی۔ ایسی ایسی سناتی تھی کہ میں حلف بھی اٹھا لوں تو کوئی یقین نہ کرے شکل سے بہت بھولی جو لگتی تھی۔''
''ارے یہ ثمر آ گیا ہے ذرا میں ناشتے کا پوچھ لوں...... آج آفس نہیں گیا۔ میرے بچے کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ البتہ دشمن خوب پھل پھول رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے ریسیور رکھ دیا اور بنظرِ غائر ثمر کی طرف دیکھا۔

''میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں امی جان آپ میری خاطر اتنا کچھ برداشت کرتی تھیں ورنہ میں تو یہی سمجھتا تھا کہ وہ خاموش رہتی ہے اور آپ اسے سناتی رہتی ہیں۔'' ثمر نے تھکے تھکے انداز میں ماں کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

''بیٹا...... اولاد کی خاطر بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ تنگ آ کر ہی تو تمہاری دوسری شادی کی بات کرتی تھی۔ ورنہ کون ماں اپنی اولاد کا تماشہ بناتی ہے۔'' بانو آپ نے ثمر کی پیشانی چوم کر بڑے دلار سے کہا۔

رات سے لوہا تپ رہا تھا اور وہ سنبھل سنبھل کر ضربیں لگا رہی تھیں۔ بس امی جان لگتا ہے قسمت میں دوسری شادی ہی لکھی ہے۔ ثمر نے ماں کی خوشی کی خاطر ایسی بات کی جس بات کو سن کر بانو آپا کے خوش ہونے کی مکمل ضمانت دی جاسکتی تھی اور ہوا بھی یونہی...... بانو آپا تو یہ سن کر واقعی ریشہ خطمی ہونے لگیں۔ بابا صاحب کی کرامت کی کھڑے کھڑے معترف ہونے لگیں۔ انہوں نے آخری بار پچاس ہزار لیتے ہوئے کہا تھا اگر تمہارا بیٹا دوسرے شادی نہ کرے تو میرا نام بدل دینا۔ جو چور کی سزا...... وہ میری......''

کھاگ نام نہاد پیر بھانت بھانت کے لوگوں سے ملتا تھا اس نے بانو آپا کی گفتگو سے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ عورت بہو کی ناک میں اس وقت تنکا چلاتی رہے گی جب تک وہ گھر سے نہیں جائے گی۔ ایسی ہی عورتوں سے وہ بڑی رقم لے کر گارنٹی دیتا تھا۔ اس نے بھی غلطی سے کہیں پڑھ لیا ہوگا کہ......

''عادت بدلی جاسکتی ہے فطرت نہیں بدلی جاسکتی۔'' بانو آپا نے شادیٔ مرگ کی کیفیت سے دوچار ہو کر ثمر کو گلے سے لگا لیا۔ آج ہی وجیہہ کے گھر جاؤں گی اور دیکھوں گی وہاں کیا صورتِ حال چل رہی ہے۔ بانو آپا خوشی سے سرشار ہو کر کہہ رہی تھیں۔

''وجیہہ......؟'' ثمر چونکا۔

دس مرتبہ تمہارے سامنے ذکر ہوا ہے۔ مگر تمہارے سر تو اس کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا تمہیں کیا یاد ہوگی۔ بانو آپا نے چمن کی طرف توجہ و اشارہ کر کے بات کی مگر یوں جیسے چمن کے تصور میں اتنا زہر تھا کہ وہ کھڑے کھڑے زہریلی ہوگئیں۔

فی الحال آپ اس ٹاپک پر بات نہ کریں۔ مجھے ذرا سنبھلنے تو دیں۔ مجھے تو ابھی تک یوں لگ رہا ہے جیسے میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔ یقین نہیں آتا کہ......

''اچھا بس......'' بانو آپا نے فوراً ثمر کی بات کاٹ دی مبادا اداسی کی کیفیت پھر سابقہ محبت کو زندہ کردے۔

''ناشتہ کرو...... وکیل کے پاس جاؤ! آج ہی طلاق نامہ تیار کراؤ۔ ایک لاکھ حق مہر کے ساتھ اس کے گھر بھجواؤ۔ اب یہ قصہ لمبا کرنے کی ضرورت نہیں...... جو سوچ لیا ہے کر گزرو۔''

ارے پھر آ کر بیٹھ جائیں گے اس کے ماں باپ اور ترلے منتیں کریں گے اپنی بیٹی کا پتا ہے ناں...... جانتے ہیں کہ یہ ہمارا جگرا تھا جو اتنے دن برداشت کرلیا...... یہ کام...... آج ہی کرنا ہے...... بانو آپا تو جیسے قسم اٹھوانے کے درپے ہونے لگیں۔

''دیکھتا ہوں امی جان...... فی الحال تو ہمت نہیں ہو رہی۔ عجیب سی طبیعت ہو رہی ہے۔ ثمر گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

بانو آپا کی خوشی پھر وہم و اندیشوں کی نذر ہونے لگی۔ درزیدہ نگاہ سے بیٹے کا چہرہ دیکھا۔

میں تو اس لیے جلدی کر رہی ہوں کہ جان چھوٹے تمہاری...... بہت ہی مکار اور چال باز لوگ ہیں وہ......
بانو آپا اندر سے ٹوٹنے لگیں۔
کہیں افشاں کی بات سچ نہ ہو جائے۔ منحوس دندناتی ہوئی واپس نہ آ جائے۔ وہم ایک جن تھا جس کی ٹانگیں زمین پر اور سر آسمان کو چھو رہا تھا۔
اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ میں گارڈ سے کہہ دیتا ہوں کہ چمن یا اس کے پیرنٹس آئیں تو ہمیں اطلاع کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ صاف صاف کہہ دے گیٹ کھولنے کا آرڈر نہیں ہے۔ ثمر کے لہجے میں سرد مہری اور سخت بے زاری کی کیفیت تھی۔
بانو آپا کی جان میں جان آنے لگی۔
ارے میں اپنے بچے کے لیے ناشتہ تو لے آؤں۔ کل سے نہ کچھ کھایا نہ پیا...... آپ تکلیف نہ کریں امی جان...... میں تھوڑا سا سیریل اور کافی لوں گا۔ اور دونوں چیزیں میں خود تیار کر سکتا ہوں۔
''آپ بھی تو رات سے ٹینس ہوں گی۔ آپ کے لیے بھی کافی بناؤں؟'' وہ مجبوری کے انداز میں اٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔
''ارے میں ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ...... یہ کافی وافی تو چھوٹ گئی۔ اب تو مٹھی بھر گولیاں ہیں صبح شام کی......''
سالوں کی کڑھی رہی...... روگ لگ گئے...... آئے...... ہائے...... قسمت میں یہی لکھا تھا۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اور باریک ترین سوئی والی سرنج سے فائنل انجکشن ثمر کے مغز میں لگایا۔ اس کے ساتھ ہی بانو آپا نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر شکر ادا کیا۔
بچی کی حالت پھر بگڑ گئی تھی۔ دونوں بڑی بچیاں اسکول گئی ہوئی تھیں۔ لامحالہ عطیہ بیگم کو گھر رُکنا پڑا۔ چمن نور العین کو لے کر ہاسپٹل بھاگی۔ نور العین بالکل ڈھیلی ہو کر بازوؤں میں آ رہی تھی۔ چمن نے راستے میں یاور کو بھی فون کر دیا تھا۔ حفظِ ماتقدم کے تحت کہ بعد میں یہ بحث نہ چھڑ جائے باپ کو بچی کی حالت سے باخبر کیوں نہیں کیا گیا۔
دوسرے یہ کہ یاور کی ہاسپٹل میں موجودگی سے ایک ڈھارس بندھتی، بہت سے کام بھاگ دوڑ مانگتے ہیں جن میں سے کسی مریض کو ایمرجنسی حالت میں ہاسپٹل لے جانا بھی ہے۔ ڈاکٹر' نرس' مختلف ٹیسٹ کے مراحل' میڈیکل اسٹور وغیرہ مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب یاور نے بڑے عام سے انداز میں جواب دیا۔ کوئی بات نہیں Infants کے ساتھ ایسی صورتِ حال پیش آتی رہتی ہے۔ آپ اس کی ٹریٹمنٹ کرائیں میں Bill ادا کر دوں گا۔
کم از کم اتنا ہی پوچھ لیا ہوتا کہ بچی کو ہوا کیا ہے؟ کب سے طبیعت خراب ہے؟ دکھ کی کیفیت نے اسے گو مگو کر دیا۔ بمشکل اس نے ہمت مجتمع کی اور بچی کو لے کر ایمرجنسی میں داخل ہو گئی۔
ڈیوٹی ڈاکٹر نے بچی کا صرف سرسری معائنہ کیا اور اسے فوراً ایڈمٹ کرانے کے لیے کہا۔
بچی کی حالت خطرے میں ہے آپ فوراً اسے ایڈمٹ کرائیں۔ یہ کہہ کر وہ ایک اور مریض کی طرف بڑھ گیا۔
''خ...... خطرے میں......'' چمن کے دل کی دھڑکنیں رُکنے لگیں۔ اس نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ وہ تو اس

کے ساتھ راتوں کو جاگتی رہی ہے کبھی دودھ کی ٹائمنگ اِدھر اُدھر نہیں ہونے دی۔ گھڑی دیکھ کر اُسے دودھ دیا ہے۔ گیلی نیپی فوراً چینج کی۔ فیڈر ہر بار استعمال کے بعد فوراً Boil کی ہے۔ صبح سے رات تک تین چار مرتبہ کپڑے چینج کیے۔ پھر...... پھر...... یہ اتنی سیریس بیمار کیوں ہوگئی؟ ایک بے بنیاد سا احساس جرم دل میں یوں اترا گویا خشک مٹی میں پانی کا قطرہ...... وہ منتشر ذہن کے ساتھ ایڈمشن سے پہلے کی تمام ضروری کارروائی نمٹانے لگی۔

روم میں پہنچتے ہی سب سے پہلے اس نے عطیہ بیگم کو فون کر کے ایڈمیشن کی اطلاع دی۔ نورالعین کی ضروری چیزیں ہاسپٹل لانے کے لیے کہا۔

عطیہ بیگم تو سنتے ہی حواس باختہ ہوگئی تھیں۔ انہوں نے بھی گھبرا کر سب سے پہلے اپنی دانست میں یاور کو اس نئی اُفتاد سے مطلع کیا۔ کیونکہ اس کے پاس پہلے ہی چمن کا فون جا چکا تھا۔ اس لیے اس نے بڑے اطمینان سے پہلے تو یہ بتایا کہ چمن اسے مطلع کر چکی ہے۔ آپ لوگ ٹریٹمنٹ کرائیں میں Pay کر دوں گا۔ یاور کا جواب سُن کر عطیہ بیگم کو شدت سے احساس ہوا کہ انہوں نے یاور کو فون کر کے غلطی بھی کی اور اپنا قیمتی وقت بھی ضائع کیا۔

دکھ سے وہ خود کو نہایت سن رسیدہ اور ضعیف محسوس کر رہی تھیں۔ بچیاں اسکول سے آنے والی تھیں۔ مشکور احمد اپنا چیک اپ کرانے صبح سے گئے ہوئے تھے۔ احتمال تھا کہ آتے ہی ہوں گے مگر وہ آ بھی جاتے تو فوراً گھر سے نہیں نکلا جا سکتا تھا۔

بیٹی کا غم اوڑھے پہنے دن گزر رہے تھے۔ اب آناً فاناً دکھ شدید پریشانی سے بدل گیا تھا س۔ پریشانی بھی ایسی جو حیرت کی انتہا پر جا کر سب کا منہ تکتی ہے۔ وہ شکستہ نڈھال کیفیت میں نورالعین کی ضروری اشیا یاد کر کر کے ایک بیگ میں رکھنے لگیں۔ وجود سراپا دعا تھا۔ اور دعا میں صرف رحم کی بھیک تھی۔

☆......☆......☆

''سر...... اللہ نے بچا لیا...... وہ جو بڈھے پھونس حکیم صاحب ہیں ناں''۔ بس ان سے میری شادی ہوتے ہوئے رہ گئی۔''

ندا سامنے بیٹھی کلمہ تشکر ادا کر رہی تھی۔ ثمر آنکھیں پھاڑے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں ہاسپٹل کے بڑے سے ویٹنگ لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ثمر کو گھر کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔ خیالات اتنے منتشر تھے کہ وہ کوئی معقول کام کرنے کا مستحکم ارادہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ یونہی گاڑی نکال کر روڈ پر آ گیا تھا۔ سوچا تھا کسی اچھے مال میں جا کر اپنی ضروری چیزوں کی شاپنگ ہی کر لے...... مگر موڈ نہیں بنا...... اتنے بکھرے ذہن کے ساتھ شاپنگ کرنے کے مطلب بعد کا پچھتاوا ہی تھا۔ کوئی چیز مہنگی آ جاتی کوئی فضول......''

آفس جانے کا تو سرے سے موڈ نہیں تھا۔ ندا کی کال پھر آ گئی تو اس نے فون پر بات کرنے کے بجائے گاڑی کا رُخ ہاسپٹل کی طرف موڑ دیا۔ کیونکہ فی الحال اسے خود پتا نہیں تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

یوں جیسے کچھ رکھ کر بھول گیا ہو۔ اور ڈھونڈ رہا ہو۔

اسی غائب دماغی کی کیفیت میں ہاسپٹل پہنچا تھا۔ سوچا تھا اس بے وقوف لڑکی کی منافقت سے پاک گفتگو سے دل کچھ بہلے گا۔ سچائیاں راہ اُجال دیتی ہیں۔ وہ اندھیروں سے نکل کر روشنی میں بیٹھنا چاہتا تھا۔

مگر ندا نے تو ایسی بریکنگ نیوز نشر کی کہ اسے سمجھ ہی نہ آئی کہ ردِعمل کیا کرے؟ آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی، یا آپ کو سننے میں مغالطہ ہوا یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ حکیم صاحب کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو۔

آج ...... اس سٹیلائٹ کے دور میں ایسی عجیب وغریب سوچ صرف اسی شخص کی ہوسکتی ہے۔ جس نے ذہنی توازن کھودیا ہو۔

میں تو آپ کو جونیئر موسٹ کے طور پر ٹریٹ کرتا ہوں۔ حالانکہ آپ شاید مجھ سے پندرہ سولہ سال ہی چھوٹی ہوں گی۔ حکیم صاحب کی تو پوتی نواسی آپ کی عمر کی ہوگی۔ کچھ تو عقل سے کام لیں۔

ثمر نے اس بریکنگ نیوز کو غیر ذمہ دارانہ نیوز سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ سر میں خدا کی قسم کھا کر کہہ رہی ہوں۔ نرگس آنٹی نے خود مجھے بتایا۔ ندا کو ثمر کی بے یقینی کی کیفیت نے مزید پُر جوش کردیا۔

''نرگس آنٹی ...... یہ کون ہیں؟'' ثمر ایک نیا نام سن کر چونک پڑا۔

''اوہ فوہ ...... ہماری Neigbour آپ ملے تو ہیں ان سے ...... ہمارے لیے تو رشتے داروں سے بڑھ کر ہیں۔ جب میں جاب کرتی تھی وہی تو نانا جان کا خیال رکھتی تھیں۔ ورنہ میں تو جاب ہی نہیں کرسکتی تھی۔ ندا نے ثمر کی یادداشت پر ماتم کرتے ہوئے نرگس آنٹی کے پرٹیکولرز بھی بیان کیے۔

''اوہ ...... ثمر کے ذہن کے پردے پر ایک لپک جھپک اِدھر اُدھر دوڑتی بھاگتی خاتون کا سراپا ابھرا، وہی نرگس آنٹی ہوں گی۔ اس نے خود کو باور کرایا اور پریشان کن کیفیت میں ندا کی طرف دیکھا۔

شادی کرنے کا کہہ رہے ہیں۔ کڈنیپ کرنے کی بات تو نہیں کررہے ناں بڑے میاں ...... اگر انہیں شرم و لحاظ نہیں تو آپ نے تکلف کرنے کی کیا قسم کمائی ہے۔ ثمر اپنی ساری کوفت بھول کر ناگواری کی زہریلی فضا سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرنے لگا۔

''میں سمجھی نہیں سر ...... ندا ہونق ہوگئی۔

اگر آپ سے بزرگوار ڈائریکٹ بات کریں تو آپ پولیس اسٹیشن جاکر F.I.R کٹوادیں۔ گھر پہنچ کر چلے جائیں گے مگر آپ کو پھر اپنی شکل نہیں دکھائیں گے۔ ثمر نے ارجنٹ قسم کے مشورے سے نواز دیا۔

''اوہ ...... گڈ ...... ایسا پاسیبل ہے۔ تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں۔''

''مگر ...... سر ...... F.I.R تو قتل کی کٹتی ہے؟''

وہ بدحواسی میں کیسے غور وخوض کرسکتی تھی جبکہ اسے تو معمول کے حالات میں غور وخوض کرنے کی عادت نہیں تھی۔

F.I.R کا مطلب ہے فرسٹ انفارمیشن رپورٹ ...... جو کسی بھی کرائم کی ہوسکتی ہے۔ ثمر کے پاس آج بہت وقت تھا اس لیے پرسکون ہوکر سمجھا رہا تھا۔

بوڑھے آدمی کا کسی لڑکی سے شادی کرنا کرائم ہے سر ...... وہ تو مجھے پہلے ہی پتا تھا یہ بہت غلط بات ہوتی ہے۔ ندا نے گویا سکون کا سانس لیا تھا۔

بالکل ...... یہ کرائم ہے۔ سیکسوئل ہراسمنٹ اس پر بڑے میاں کو سزا ہوسکتی ہے۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ثمر نے اس کو پر اعتماد بنانے کی پورے خلوص کے ساتھ سعی کی۔

ان کی اتنی ہمت ہوئی کیسے ...... الحمدللہ ابھی آپ کے نانا جان حیات ہیں ثمر کو حیران ہونے میں خاصی دیر لگی۔ کیونکہ پریشانی کی کیفیت پہلے غالب آگئی تھی۔

''ارے ...... سب نانا جان ہی کا تو کیا دھرا ہے ...... ندا نے آزردہ انداز میں اور بہت آہستگی سے کہا۔

''کیا دھرا ...... ؟ کیا مطلب ...... ؟'' ثمر کی حیرت سوا ہوگئی۔

بھئی حکیم صاحب تو آنٹی سے یہی کہہ رہے ہیں کہ نانا جان کی خواہش ہے کہ ان کی بے وقوف ترین نواسی کا رشتہ حکیم صاحب سے ہی ہو۔ کیونکہ وہ دیکھے بھالے ہیں۔ نانا جان کے دوست ہیں۔ وہ کسی اجنبی پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ ندا نے وضاحت سے بتایا۔

''ہوں......'' ثمر نے سوچتے ہوئے ہنکارا ابھرا۔

''کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ...... یہ تو نانا جان کی طبیعت ٹھیک ہونے کے بعد ہی پتا چل سکے گا۔ لیکن سچویشن کیسی بھی ہو آپ اپنا کونفیڈینس بالکل Loose نہ کریں۔ زبردستی کوئی بھی شادی نہیں کرا سکتا۔ قانون اور مذہب دونوں اس معاملے میں عورت مرد کو برابر حق دیتے ہیں۔ ثمر نے اسے قوتِ اعتماد سے حالات کا مقابلہ کرنے کا جذبہ دیا۔ اور ایک دم ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ یونہی خیال آیا تھا کہ وہ انجانے میں ناپسندیدہ حالات سے دوچار ہونے جا رہا ہے۔ یہ لڑکی کہیں اسے کسی مشکل میں نہ پھنسا دے۔

''سر آپ جا رہے ہیں؟ اتنی جلدی......'' ندا اسے اٹھتا دیکھ کر اُداس ہونے لگی۔

''آپ کے نانا جان کی خیریت معلوم کرنا آیا تھا۔ بہت خوشی ہوئی یہ جان کر کہ وہ اب پہلے سے بہتر ہیں۔'' ثمر نے یوں پینترا بدلا کہ ندا ہکا بکا رہ گئی۔

کتنی ہمدردی واپنائیت سے بات کرتے کرتے ایک دم اجنبی سا بن رہا تھا اس ناتجربہ کار، غیر تربیت یافتہ معصوم سی لڑکی کو کیا پتا تھا کہ انسان اپنا Stress شفٹ کرنے کے لیے کسی بھی وقت کسی بھی جان پہچان والے کو استعمال کر سکتے ہیں۔

☆......☆......☆

آپ کے ہزبینڈ شاید ملک سے باہر ہیں؟'' آپ نے ان کو بچی کو طبیعت کے بارے میں انفارم کر دیا۔ V.V Critical Stiuation ہے۔ ڈاکٹر علی عمران I.C.U سے باہر آ کر بڑی پریشانی کی کیفیت میں چمن سے مخاطب تھے۔

چمن اتنی زیادہ پریشان تھی کہ ہونقوں کی طرح ڈاکٹر علی عثمان کی شکل دیکھنے لگی کچھ سمجھ نہیں آئی کہ ڈاکٹر علی اس کے ہزبینڈ کو کیوں یاد فرما رہے ہیں؟'' بچی کا برین آپریشن بھی پاسیبل ہے۔

''اتنی سی بچی کا...... یہ تو ابھی ایک ماہ کی بھی نہیں ہے۔ چمن کا دل ڈوبنے لگا۔

چند گھنٹے کے بچے کا اپنڈکس آپریشن بھی ہو جاتا ہے۔ زندگی بچانے کی آخری کوشش تو کی جاتی ہے ناں؟ بہتر ہے آپ اپنے ہزبینڈ سے مشورہ کر لیں...... کیونکہ ہمیں کسی بھی وقت Decision لینا ہوگا۔ فی الحال اپنی تمام تر کوشش کر رہے ہیں کہ ایسی نوبت نہ آئے۔ ڈاکٹر علی عثمان بڑی فکرمندی اور ہمدردی کے جذبے سے لبریز آواز میں کہہ رہے تھے۔

میں اس بچی کی ماں نہیں ہوں...... خالہ ہوں...... اس کی مدر کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ چمن نے سر جھکا کر رُندھی ہوئی آواز میں اطلاع بہم پہنچائی تھی۔

''اوہ......'' ڈاکٹر علی عثمان کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔ اُن کی نظریں اب چمن کے چہرے پر جم گئی تھیں۔

(رشتوں کی نزاکت اور سفا کی دکھاتے اس سحر انگیز ناول کی اگلی قسط انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

افسانہ

شہناز انور شفا

زہریلی

اُس کے سامنے کوئی شریف النفس انسان، کبھی، منہ کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔
سب کو نوکری تو کرنا تھی۔ سبھی اس وقت یہ سوچ رہے تھے، کہ اب زبیر بے چارہ بھی کیا
بولے گا۔ باس بات کدھر کی کدھر لے جا رہی تھی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ......

دوشیزہ کی ہر دلعزیز مصنفہ کے قلم سے اچھوتی تحریر

رِدا سر جھکائے بیٹھی تھی۔

سر اس نے جھکایا نہیں تھا، جھک گیا تھا! جب ، انسان کی عزتِ نفس کو، بوٹی والی ہڈی کی طرح بھنبھوڑا جائے تو اس کے کاندھے، اُس کے غیور سر کا بوجھ اُٹھانے سے قاصر ہو جاتے ہیں۔

اس نے اپنے دفاع میں منہ کھولنے کے لیے، سر اٹھایا ہی تھا، کہ، اس کی باس نے دوبارہ، چیخنا شروع کر دیا۔ بالکل جیسے کوئی پاگل کتیا، لوگوں کو جمع ہوتے دیکھ کر، منہ سے جھاگ نکالتے ہوئے، زور زور سے بھونکنا شروع کر دیتی ہے، کیونکہ، اس کا ناکارہ ہوتا ہوا ذہن، اور اس سے بھی ناکارہ ہوتے ہوئے اعصاب، اسے ہر شے سے خوفزدہ کر دیتے ہیں۔

رِدا کو کچھ کچھ، توقع تھی کہ، باس، اپنے، دفتری خرچے پر، نجی غیر ملکی دورے سے واپسی پر، ایسا ایک، ڈرامہ ضرور رچائے گی۔ مگر اس طرح رچائے گی، سارے دفتر کے ساتھیوں کے سامنے، یہ بات اس کے لاشعور کی ننھی سی آواز نے اسے نہیں بتائی تھی۔ بے چارہ لاشعور، اور چھٹی حِس، دونوں مل کر بھی، باس کے اور اس کے شب خون کے ارادے کے بارے میں، پیش گوئی نہیں کر سکے تھے۔

چھٹی پر کینیڈا اور امریکہ جاتے ہوئے، بے چاری چالباز باس صاحبہ نے، تو یہ سوچ کر کہ رِدا بے وقوفی کی حد تک ایماندار ہے، اِس سے شب خون مارنے یا تختہ اُلٹنانے کا کوئی خطرہ نہیں' اُس کو قائم مقام ڈائیریکٹر بنا کر، اپنے سارے اختیارات، سونپ کے گئی تھی۔ جاتے وقت وہ احتیاطاً اُس کو کوئی بھی ضروری ہدایات اور معلومات نہ دے کر گئی تھی۔ اس نے یہ سوچا تھا کہ میرے پیچھے یہ، خوب غلطیاں اور مسئلے کھڑے کرے گی، تو خود ہی، سارے افسرانِ بالا کو اس کی نااہلی کا پتا لگ جائے گا۔ سب بڑی تعریفیں کیا کرتے ہیں اس کے حسنِ کارکردگی، اخلاق، اور شخصیت کی! سارے ادارے میں، یہاں تک کہ، سوئٹزرلینڈ ہیڈ کوارٹر تک رِدا کی قابلیت کے

چرچے ہو رہے تھے۔

اب یہ رِدا کی سراسر حماقت نہیں تھی تو اور کیا تھی، کہ اس نے، اپنی، نسبتاً جونیئر پوزیشن، پر رہتے ہوئے بھی، نہایت خوش اسلوبی سے، نہ صرف اپنی، بلکہ اپنی غیر حاضر باس کی، بھی تمام ذمہ داریاں نبھا دی تھیں۔ اور اس پر جلتی پر تیل یوں پڑا کہ اِدارے کے چیف ایگزیکٹیو جناب سراج حسین صاحب نے، جو کہ، باس کے باس تھے، قائم مقام ڈائیریکٹر کی اعلیٰ پرفارمنس سے متاثر ہو کر، بہت سی ایسی اہم میٹنگوں میں رِدا کو اپنے ادارے کی نمائندگی کرنے کے لیے بھیج دیا

تھا، جہاں 'باس ڈائیریکٹرز خسانہ' خود کبھی نہ بھیجی گئی تھی۔ کیوں؟ اس کی وجہ تو، صرف باس کا باس ہی جانتا تھا! چھٹی سے واپسی پر، کانوں کی کچی، باس کے، ناکارہ اور 'ٹائم پاس تنخواہ خاص' قسم کے خاص چمچوں نے، فوراً سے پیش تر، باس کے کان، رِدا کے خلاف، حفظِ ماتقدم کے تحت بھر دیے۔ موبائیل فون ٹیکنالوجی، اسی کام کی آسانی کے لیے تو بنائی گئی ہے۔ دفتر پہنچ کر، چارج سنبھالنے سے پہلے ہی، باس جی کے دماغ نے، سارے 'ساس بہو' کے رشتے کو رگید نے' کی خاطر بنائے گئے کیبل چینلز ڈراموں سے حاصل کردہ، معلومات،

اور گونہ گوں ترکیباتِ عزتِ نفس کُشی، رات بھر، ذہن میں جگالی کیے اور، صبح تک لائحہ عمل تیار کرلیا۔ باس بی بی نے، سارا دن، رِدا کو نظر انداز کیا، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ اسے اپنی احسن کارکردگی کی رپورٹ دینے کے لیے بے چین ہوگی۔ ویسے بھی، رِدا باس سے، اپنے آپ کو تا بہ مقدور بچانے کی کوشش کرتی تھی۔ اپنا کام اتنی اچھی طرح کرتی تھی کہ شکایت کا کوئی موقعہ باس بی بی کو کبھی نہیں ملا۔ سارے کولیگز، گیٹ کے چوکیدار، مہترانی، آفس بوائے سے لے کر، ساتھ کے اور سینئر کولیگز تک رِدا کا احترام کرتے تھے۔

جاسوس پارٹی نے تو یہاں تک بتایا تھا، کہ وہ لوگ اپنے گھریلو اور ذاتی مسائل تک رِدا کو بتاتے تھے، (وہ خود بھی بتاتے تھے، مگر یہ بات باس بی بی کو بتانے والی نہیں تھی) اور رِدا اگر ان کے مسائل حل نہیں کرسکتی تھی تو کم از کم، ہمدردی سے سن ہی لیتی تھی۔ باس بی بی کو اس امر پہ کوئی خاص اعتراض کبھی نہیں رہا تھا، کیونکہ، اس سے، تو دراصل، اسی کا کام آسان ہو رہا تھا۔ وہ ان چھوٹے لوگوں کے بے کار اور ذلیل قسم کے مسائل حل کرنے میں اپنا قیمتی وقت برباد نہیں کر سکتی تھی۔ اسے، اپنے کیریئر کو شارٹ کٹ کے ذریعے آگے بڑھانے کے لیے، طاقتور، اور کام کے لوگوں سے تعلقات بڑھانے، اور ان کو خوش رکھنے کے لیئے یہ وقت درکار تھا۔

مگر کچھ عرصے سے وہ، دیکھ رہی تھی، کہ، ہر چند کہ وہ رِدا کو کبھی کسی کام کا کریڈٹ نہیں لینے دیتی، اور، اِس سے اپنے تمام کام کروا کر، اپنا نام بڑھاتی تھی، پھر، بھی، وہ ادارے کے اونچے ایوانوں میں طاقتور کرتا دھرتا لوگوں سے اِس کی تعریفیں اور کام کے بارے میں واہ واہ مسلسل سُن رہی تھی۔ یہ بات باس بی بی کی، موجودہ 'بے خوابی'، کو مزید مہمیز کرنے میں ایک، آخری کیل ثابت ہوئی تھی۔ اس کی انتہائی خفیہ ذہنی معالج دوست نے بھی اسے، خبردار کردیا تھا، کہ 'رُخی اب اس سے زیادہ مسکن اور خواب آور دوا نہیں دے سکتی۔ تجھ کو ہسپتال میں داخل ہو جانا چاہیے۔ تُو کچھ ریسٹ بھی کرلے'۔ مگر، ایک، ناکام بزنس مین کی، طاقت اور دولت کی لالچی بیوی؛ جنابہ باس بی بی ایسا خطرہ کہاں مول لے سکتی تھی۔

رِدا کو، اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے اس نوکری کی اشد ضرورت تھی۔ اور ادارے میں عصبیت زدہ ماحول کے پیشِ نظر وہ، جانتی تھی کہ، اگر اس نے، حرفِ شکایت زبان پر لایا، تو، نتیجہ اُسی کے خلاف نکلے گا۔ اس لیے پھلوں سے لدی شاخ کی طرح وہ تو جھکی رہتی تھی۔

اس وقت بھی، باس بی بی کے جملے اُس کے کانوں کے ذریعے، روح کو چھیدتے جا رہے تھے۔ باس بی بی کی لحہ بہ لحہ اونچی ہوتی آواز، اور منہ سے نکلتا کف، دیگر اہل کاروں کی موجودگی، اور احساسِ ذلت سے، رِدا کے اعصاب شل سے ہوئے جا رہے تھے۔ مگر وہ اپنے آپ پر۔ ہر صورت میں قابو رکھتے ہوئے، صبر کے بند باندھے بیٹھی تھی۔ کچھ دیر تو وہ باس بی بی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، اپنی پاکیزگیِ قلب، اُس کے خباثت بھری روح تک پہنچانے کی کوشش کرتی رہی، مگر، اُس نے محسوس کرلیا تھا، کہ وہاں ایک شیطانی پردہ پڑا ہوا ہے۔ باس کی چیختی ہوئی آواز اُس کے سُن ہوتے ہوئے اعصاب کو جھنجھوڑ گئی:

''یہ میں کیا سُن رہی ہوں!۔ میرا دیا ہوا اسائنمنٹ (Assingment) زبیر اس لیے،

پورا نہیں کرسکا، کیونکہ، تم نے، رِدا تم نے اس کو اپنا ہی اتنا کام دے دیا تھا کہ بے چارہ، راتوں کو بارہ بارہ بجے تک، دفتر میں رُک کر بھی، میرا کام پورا نہیں کرسکا۔۔؟ یہ تم کر کیا رہی ہو؟

رِدا نے ایک سوالیہ نظر سے زُبیر کی طرف دیکھا، تو اُس نے، نہایت غیر محسوس طریقے سے، نفی میں اشارہ کیا، کہ 'میں نے تو باس سے ایسا نہیں کہا'۔ اُس کی سہمی ہوئی آنکھیں، اور ماتھے کا پسینا بول رہا تھا۔ باس کے سامنے، زبان کھولنے کی ہمت، کسی میں نہ تھی۔ اور زُبیر بے چارہ تو کچھ بولنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھا۔ اُس کو ہفتے میں ایک دو بار دفتر سے جلدی جانا ہوتا تھا۔ زبیر، شام کے وقت ایم۔بی۔اے کر رہا تھا، اور، اس کا یہ آخری سیمسٹر تھا۔ باس کو یہ معلوم تھا۔ اور اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ، وہی، رِدا کی سب سے زیادہ عزت کرتا ہے، اور، ان دونوں کا ٹیم ورک تو مثالی تھا۔ وہ دونوں دن رات محنت کر کے، ایک ڈیڑھ دو سو صفحے کی کتاب، بہت جلدی مگر عمدگی سے تیار کر لیتے تھے۔ باس بی بی کی دانست میں، ''ایسا ٹیم ورک، کسی نالائق، اور بُدھو باس کو تو پسند ہو سکتا تھا، مگر، خود اُس کو۔۔ ہر گز نہیں! ایسی ٹیمیں ہی تو، نااہل باسوں کے لیے دردِ سر ہوتی ہیں۔ ان کو توڑنا انتہائی ضروری ہوتا ہے''۔ اور ایسے حربے اس نے نہایت عرق ریزی سے، اپنے بوسیدہ کیریئر کے دوران خاص توجہ سے سیکھے تھے۔

باس زبانی لتاڑنے اور دوسروں کی عزت اتار کر ہاتھ میں تھما دینے کے فن میں جو مہارت رکھتی تھی سبھی اس کی مثالیں دیکھ چکے تھے۔ اسی لیے تو دفتر کی مہترانی اور میونسپلٹی کا خاکروب اُس گاڑی کو دور سے آتا دیکھ کر، ایک دوسرے کو، سگنل کے طور پر کہتے تھے، ''او جگا آگیا، جگا آ گیا، ہوشیار ہو جاؤ!' دفتر کا چوکیدار پھر خاص اشارہ کر کے اندر پیشگی اطلاع دے دیتا تھا جسے اندر، ریسپشن کاؤنٹر پر لگے، کلوز سرکٹ کیمرے کی اطلاعی اسکرین پر دیکھ کر، گل رُخ سب کو ہوشیار کر دیتی تھی۔ صبح صبح سب لوگ 'باس بی بی رُخسانہ جلال الدین' کے سائے سے بھی سب بچتے تھے۔ جانے کس موڈ میں گھر سے آئی ہے؟ اُس کی زبان اور بوسیدہ ظرف سے سب ڈرتے تھے۔ سب جانتے تھے کہ وہ، تو، ہر شام بلا ناغہ، کیبل ٹی وی کے وہ چینل انتہائی ذوق و شوق سے دیکھتی تھی، جن میں گندی ہندوانہ سیاست، رشتوں کی حُرمتوں اور انسانیت کو پامال کرنے کے گُر، ڈراموں کے ذریعے سکھائے جاتے ہیں۔ سب کو معلوم تھا کہ اگر کسی شام وہ، دفتر کے کسی کام کی وجہ سے، سیریل کی قسط کے وقت گھر پر نہ ہوتی، تو فوراً فون کر کے شوہر نامدار کو حکم سناتی کے، 'یار، آج اپنے کو آفس میں کام کرنا ہے، آج ذرا ڈرامے کی قسط ریکارڈ کر کے رکھ دینا، میں آکر دیکھوں گی۔' فون بند کر کے بغیر کھسیائے ہوئے کہتی، ''آج بڑا امپورٹنٹ ایپیسوڈ ہے، وہ چاندنی پر اُس کے میاں نے، بوائے فرینڈ سے، افیئر چلانے کا الزام لگانا ہے۔ اور اس کی جیٹھانی، پُشپا اپنی ساس کے ساتھ مل کر، اس سچوئیشن کو کیسے کیش کراتی ہے، وہ آج پتا چلے گا!' باس بی بی اپنے زبان چٹخاتے ہوئے ایسے بولتی جیسے بارہ مسالوں کی چاٹ کھا رہی ہو۔

اُسے دو وقت ایک ہی سالن کھانا پسند نہیں تھا۔ اور، اس ادارے میں، وہ ابھی جس پوزیشن پر تھی، اسی کی تنخواہ، اس طرح کے چونچلے پورے کرنے کا بھار اُٹھا سکتی تھی۔ اور وہ کوئی ایسے ہی تو، اتنے اونچے اور طاقتور عہدے پر نہیں پہنچ گئی تھی۔

اُس نے، کتنے تلوے چاٹے، کتنی باصلاحیت عورتوں کو، اپنی چالبازیوں سے، ادارے سے رُخصت کیا، یا کروایا، اور کتنوں کے ذہنی توازن اور اعصاب کو وہ، نسوار کی طرح چبا کر تھوک چکی تھی، یہ تو، پچیس چھبیس برسوں پر محیط داستان ہے۔ پھر سہی! لُبِ لُباب یہ ہے۔ لوگوں کو، کس طرح سے زیرِ نگیں، زیرِ بارِ منتِ احساں کرتے ہیں، یہ گر اُس نے کسی نوآبادیاتی نظام کے ماہر سے تو نہیں سیکھے تھے، مگر، ان ہی کے بھیجے ہوئے وُرشہ اور ہرکاروں کو، عمل درآمد کرتے ہوئے دیکھ کر ازبر کر لئے تھے۔ وہ بے چارے، روٹی روزی کی تلاش میں، اپنا وطن چھوڑ کر، یہاں دور دیس میں، انجانے لوگوں میں کام کرنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ ماہرین بنا کر۔ اب کام آئے نہ آئے، ماہر ہونا یا کہلانا اصل میں بڑی بات ہے۔ بڑی طاقتور پوزیشن ہے۔ آپ کے پاس گویا، غلطیاں کرنے کا لائسنس آجاتا ہے۔ اور غلطیاں بھی وہ جو، لاکھوں اربوں کی ہوں۔ اس سے کم کی غلطی کرنا اُن کے شایانِ شان نہیں۔ اب وہ اپنے ملک میں سے کیوں آجاتے ہیں، بے چارے، ان، ترقی پذیر ملکوں کے نااہل، بے عقل، کم فہم لوگوں کی مشکلات حل کرنے؟ کیا اُن کے اپنے ملک میں اُن کے لیے کوئی کام کاج نہیں ہوتا۔ اس کا جواب تو وہ شاید نہ ہی دیں، مگر یہ طے ہے، کہ وہ اپنے ملک میں، دھیلے کی غلطی کے بھی مرتکب ہوں، تو بڑی سخت پکڑ ہوتی ہے۔ وہاں کے محنت کرنے والے، اپنے ٹیکسوں کے بارے میں، بڑے حساس ہوتے ہیں۔ ہماری طرح دریا دل نہیں، کہ اربوں کھربوں روپوں سے نیا نیا تعمیر شدہ، فری وے پُل، ایک دو بھاری بھرکم ٹرکوں کے بوجھ سے، بیٹھ جائے، اور اپنے ساتھ، ہزاروں افراد کے گھروں کی خوشیاں بھی لے بیٹھے، اور ہم، محترم حاتم طائی کی گور کو لات مارتے ہوئے، تھوڑی سی ڈانٹ ڈپٹ کر کے، اور، ایک انکوئری کمیٹی بٹھا کے، کہہ دیں کہ، چلو جی مٹی ڈالو، ہُوا سو ہُوا!۔۔۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ وہ تو، پچیس تیس سال پہلے، گرائے گئے کسی ہوائی جہاز، کا الزام اور سزا جب تک کسی کے سر نہ مڑھ دیں، انہیں چین نہیں آتا۔ اپنی اور ہماری راتوں کی نیندیں حرام کر دیتے ہیں۔ مگر کسی کو سزا دلوا کر ہی چین سے بیٹھتے ہیں۔

باس بی بی کو معلوم تھا، کہ، وہ سارے ایکسپرٹ، جو اعلیٰ ملکوں سے آتے ہیں، ہمارے ادنیٰ مُلکوں میں، آ کر رعب جما جاتے ہیں، دراصل خود کبھی کسی نوآبادی، میں محکوم نہیں رہے۔ تھوڑی سی خوشامد کر لینا، وقت پڑنے پر گدھے کو باپ بنا لینا، بھلا کیا بُری بات ہے۔ ترقی کا تیز ترین اور یقینی زینہ تو یہی ہے۔ کیا گدھے انسان نہیں ہوتے، کہ کیا۔۔! باس صاحبہ، کو، یہ بھی معلوم تھا، کہ، اس کو کوئی فارن کی ڈِگری ضرور حاصل کر لینا چاہیے۔ ترقی کے لیے یہ بھی ازحد ضروری ہے۔ اب ڈگری فارن ہونا چاہیے، کہاں سے حاصل کی، اور کتنے جتنوں اور کیسے اوچھے حیلوں سے حاصل کی، یہ سب پوچھنے کی کسی کو ہمت ہی نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کوئی، احمق ایسی، بے کار ہمت کر بھی لے، تو، اُس کے سوال کا گلا، اپنے تابڑ توڑ جملوں، طعنوں اور اونچی آواز کے شور میں دبا دینا ہی اصل ہنر ہے۔ ''لو! یہ روٹی کمانے میں دین ایمان کی بات کہاں سے آگئی۔ بھائی ایسے چھوٹے موٹے گناہ بخشوانا کونسی مشکل بات ہے۔ کوئی وسیلہ وہاں بھی بنالیں گے۔ یہ ضمیر ومیر کیا چیز ہے۔ بھائی اس دھندے میں سب چلتا

ہے۔ بس اصل بات ہے، پاور، طاقت، ڈھیر ساری طاقت، ڈکٹیٹروں جیسی!'' اسی لیے اس سے پہلے کہ کوئی بولے، اپنے تواتر سے بولے ہوئے جھوٹوں سے اس کی آواز ہی دبا دو! کوئی تیسرا آدمی سن ہی نہ سکے۔ اور اپنے بے سُرے راگ اتنی اونچی آواز میں گاؤ کہ، فہم اور ادراک، اور خاص طور پر سچ کی آواز بالکل دب جائے۔ ایسا شور مچاؤ کہ لوگوں کے ذہن کام کرنا چھوڑ دیں۔ گدھے کی طرح ایسا بے ہنگم غلغلا پیدا کرو، کہ لوگ 'لاحول ولاقوۃ الا باللہ' پڑھنا بھی بھول جائیں۔

اُس کے سامنے کوئی شریف النفس انسان، کبھی، منہ کھولنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ سب کو نوکری تو کرنا تھی۔ سبھی اس وقت یہ سوچ رہے تھے، کہ اب زبیر بے چارہ بھی کیا بولے گا۔ باس بات کدھر کی کدھر لے جارہی تھی۔ صاف معلوم ہورہا تھا کہ باس کو، صرف رِدا کی کلاس لینا مقصود تھا، اور، گرچہ وہ یہ کام تنہائی اور پردے سے' قاعدے قوانین کے مطابق بھی کرسکتی تھی، مگر وہ تو، پبلک ہیومیلیشن (PUBLIC HUMILIATION) 'یعنی سرِ عام بے عزتی کر کے، اُس کو توڑنا چاہتی تھی۔ اُس کے اعتماد کی دھجیاں بکھیر کر، اُسے، ادابِ محکومیت، سکھانا چاہتی تھی۔ کارپریٹ کلچر، بھی تو پدر شاہی نظام کی ایک شاخ ہی ہے! اِس وقت بھی، باس نے یہی وطیرہ اپنایا ہوا تھا۔

رِدا اِس بوچھاڑ میں، فقط اتنا ہی کہہ پائی: ''مگر میں نے تو، زبیر کو کوئی کام نہیں دیا، کیوں زُبے......

کہ باس چیخی: ''بیچ میں مت بولو! چپ کر کے میری بات سنو! 'اپنے سینئر کی بات کاٹ رہی ہو! ڈونٹ انٹرپٹ می (Don't interrupt me)! اپنے سینئر سے بات کرنے کی تمیز نہیں تمھیں، رِدا! کہاں سے تمیز سیکھی ہے تم نے؟ تمیز سیکھو! تمیز سیکھو پہلے، پھر مجھ سے بات کرنا۔۔۔

اس ذاتی حملے، پر، رِدا، تلملا اُٹھی۔۔ اُس کی آواز میں ایک عجیب سی، ہولا دینے والی، خنکی آگئی: 'میڈیم میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ۔۔۔

''تمھاری ہمت کیسے ہوئی، رِدا، میری بات جھٹلانے کی۔ کیا یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔''

ردا نے لمحے کی ہزاروہیں حصے میں، ایک نظر سب کولیگز کے چہروں پر ڈالی۔ وہاں تو آبادیاتی، غلامانہ، مصلحت پسندی، سہل پسندی، سسٹم میں رہ کر، مل بانٹ کر کھانے، 'چائے پانی' والا خول در خول مڑھا، ہر چہرہ نامانوس دکھائی دیا۔ پیاز میں اتنے پرت نہ ہوں گے، جتنے ان چہروں پر، تہہ در تہہ نقاب ڈلے تھے۔ کس سچوئشن میں کون سا نقاب سامنے لانا ہے، ہی سب سے بڑا گر ہے۔ اس وقت اس ڈرامے کے سین کی ڈیمانڈ یہ تھی، کہ سچ جھوٹ کی اس بحث میں مت ٹانگ اڑاؤ، ویسے بھی لنچ بریک کا آدھا ٹائم تو یہیں گذر گیا ہے۔ بے زاری چہرے پر، پیٹ کی بھوک نے پیدا کی تھی' شاید۔ اُن میں سے آدھے تو یہ سوچ کر، رِدا کی بے وقوفی پر، اُسے دل ہی دل میں ملامت کررہے تھے۔ ''یار! اِسے پتہ ہے کہ، باس یہ سارا ڈرامہ کیوں کررہی ہے۔ کس نے بولا تھا کہ، ایکسٹرا افیشنٹ (Extra-Efficient) ہو جاؤ۔ باس کو اپنی پوزیشن کی فکر پڑ گئی ہے۔ اب پروفیشنل جیلیسی (professional jealousy) کا سارا کھیل ہے۔ سمجھ جا بھائی!، چپ کر کے، دو

منٹ باس کی بکواس سن لے۔ بات ختم۔ کل خود ہی باس مکھن لگا رہی ہوگی۔ آخر وہ بھی تو نوکر ہے۔ یہ رِدا بھی نا۔ بالکل 'مس فِٹ' ہے!'' اور کچھ، اُسی شام مارکیٹنگ ڈپارٹمنٹ کی جانب سے ہونے والی، بار بی کیو Barbeque) پارٹی اور محفلِ موسیقی کے بارے میں، سوچ کر، اس بے موسم کی سونامی سی کیچڑ کی برسات سے پناہ تلاش رہے تھے۔ ہر چہرہ، ایک بوسیدہ، بودیتے، ناکارہ سسٹم، کا مکروہ ساڈھانچہ نظر آرہا تھا۔ سب اُسے جانتے تھے، مگر، اِس وقت سبھی، ابن الوقت بنے ہوئے تھے۔ کوئی سچا نہیں تھا۔ جھوٹ کا شیطان ہر کندھے پر بیٹھا، اُس مفلوج اور غیر صحت مند ذہن کو، اپنے، بھیانک چابک سے، اور اپنے وسوسوں سے لبریز قبیح ناخنوں سے، کنٹرول کیئے ہوئے بیٹھا تھا۔ اور شاید اس کنٹرول کو وہ کبھی بھی اپنے ہاتھ سے نہ جانے دے گا۔ یہی قرنوں سے اُس کی رِیت چلی آرہی ہے، اور رہے گی۔ انسان خود ہی اپنے درجے کو نہ پہچانے تو، اس میں شیطان کا کیا قصور۔

یکا یک، رِدا کو یوں محسوس ہوا، جیسے دنیا سے سچ اُٹھ گیا ہے۔ صرف جھوٹ ہی جھوٹ ہر طرف، دم گھونٹنے والے تیزابی، زہریلے دھوئیں کی طرح ہر ذی روح کو، اپنے خونی پنجوں سے، نیست ونابود کررہا ہے۔ کہیں کوئی انسان نہیں بچا ہے۔ کوئی بشر بھی شاذ ونادر ہی کہیں رہ گیا ہے۔ صرف دوٹانگوں والے، حیواں، جو، روٹی کے لیئے، اپنے ضمیر ایک غیر فطری موت کی نیند سُلا چکے ہوں۔ ایسی موت جو، کسی، لافانی زندگی کی رہ گذر نہیں۔ جیسے علم، اور علم بیچنے والے سب کے سب کوئی بہت ہی، بنیادی سا، سبق، یا تو پڑھنا ہی بھول گئے، یا پھر، پڑھ کر، ہمیشہ کے لیے بھلا چکے ہوں۔ جیسے، ان دوٹانگوں والے، حیوانوں کے صرف، پیٹ ہوں، اندھے کنوئیں جیسے۔ حرص، طمع، لالچ، اور نفسانی خواہشات، کے متعفن لوتھڑوں سے بھرے، جو، 'اور زیادہ' کی بازگشتوں کو جنم دیتے ہیں۔ مگر یہ 'اور زیادہ' بے ضمیری، جھوٹ اور منافقت کی طلب ہے۔ سچ اور انسانی بلندیوں تک پہنچنے کی نہیں۔ اُس کو کچھ سجھائی نہ دیا۔ وہ تو سب کے سامنے، اُن کی مصلحت پسندانہ خاموشی، اور، خود غرضی کی وجہ سے جھوٹی بنادی گئی تھی۔ اور، باس بی بی صاحبہ کا جھوٹ، سچ بن گیا تھا۔ رِدا کی ہستی سچ پہ قائم تھی۔ اور آج 'سچ'، معلوم نہیں کیا ہوا تھا۔

اُسے لگا جیسے وہ چھ سال کی بچی، ماں کے ساتھ، عید کی شام کو، بہت ضروری سامان خریدنے چلی آئی ہے۔ اُس کی ماں، اُسے، چوک میں کھڑا کر کے انتظار کرنے کا کہہ کر، دکان کے رش میں چلی گئی ہے۔ اور کسی ہجوم میں گم ہوگئی ہے۔ وہ، اپنی ننھی ننھی ٹانگوں پر کھڑی، اجنبیوں کے ہجوم میں بالکل تنہا رہ گئی ہے۔ اور اب اُسے گھر کا رستہ کبھی نہیں ملے گا۔ وہ یہیں کھو جائے گی۔ نیست ونابود ہوجائے گی۔ وہ روزِ محشر تنہا رہ گئی ہے۔ وہ سچ بول کر، ایماندار ہوکر بھی، جہنم رسید کردی گئی ہے۔ وہ تو صرف، اپنے گھر والوں کا پیٹ عزت سے پالنے کے لیے نوکری کررہی ہے۔ کسی پر اضافی بوجھ بننے، اور ہاتھ پھیلانے کی ذلت سے اپنا آپ اور اپنے خاندان کو محفوظ رکھنا چاہ رہی ہے۔ اور، اُجرت کے ہر ہر پیسے کو حلال کرنے کے لیئے وہ، اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کو، اپنی بہترین محنت اور انتھک لگن سے، انجام دیتی رہی۔ بغیر کسی عہدے یا مراعات کی لالچ کے۔ صرف اپنے اللہ کی رضا کے لیے۔ صرف

رزقِ حلال کی عبادت کے لیے۔ اور آج اُسے ہی ایک زہریلی مثال بنایا جا رہا ہے۔ یا اللہ میں کہاں جاؤں؟

اور پھر، نہ جانے کون سا بند ٹوٹا اور، کہاں کے ذخیرہ کئے ہوئے آنسو، ایک سیل رواں کی طرح، اس کے چہرے کو بھگوتے ہوئے، اُس کے دامن کو، دھونے لگے۔ کسی کو اُس سے یہ توقع نہیں تھی۔ وہ تو ہمیشہ سب کا جذباتی اور رُوحانی سہارا بنتی تھی، اور آج وہ، اتنی سی بات پر، ایسا روئی! سب کھسیانے لگے۔ اپنے سر جھکا کر، اِدھر اُدھر کچھ تلاش کرنے لگے۔ شاید اپنا ظرف تلاش کر رہے تھے۔ باس بی بی، اُس کے بہتے آنسو دیکھ کر، ہتھے سے اکھڑ گئی۔ اس کی آواز مزید کئی درجہ تیز ہوگئی، اور، اس کی تیزابی تلخی میں یکلخت، ہزاروں گنا اضافہ ہوگیا۔ ایک، رِنگ ماسٹر جیسے لہجے میں وہ چلائی:

''اپنے آپ پر ترس کھانا چھوڑو رِدا! رونا بند کرو! اپنے آپ کو اب مظلوم ثابت کرنے کے لیئے، رونے کا سہارا مت لو! سٹاپ اِٹ (Stop it)۔

نہ جانے ذات کے کونسے نہاں خانے سے، رِدا، کے قلب پر تسکین کا ایک نرم و لطیف سا احساس، آیا اور چھا گیا۔ اُس کے چہرے پر ایک صبر کی حد پر ترو تیج پائی، مسکراہٹ اور چہرے پر طمانیت چھا گئی۔ مگر آنسو اُسی طرح رواں رہے۔ مجروع جذبات، اتنی جلدی قابو میں آنے والے نہ تھے۔ کسی نے باس کے اشارے پر، ایک گلاس پانی رِدا کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جسے وہ ہاتھ میں تھامے، ساکت بیٹھی رہی۔ روتے ہوؤں کو سنبھالنا سب کو کہاں آتا ہے۔ سب اپنی کلائیوں پر بندھی گھڑیوں کی طرف دیکھنے لگے۔ باس نے موقعہ غنیمت جانا اور سب کو لنچ بریک پہ جانے کی اجازت دے دی۔ ویسے بھی لنچ کے بجائے، اب تو چائے کے وقفے کا ٹائم ہو چلا تھا۔

رِدا، بھی خاموشی سے اُٹھ کر اپنی سیٹ پر آ گئی۔ پھر، اُٹھی جا،نماز بچھایا، اور نماز ادا کی۔ آنسو، رُکے، اور پھر، بہنے لگے۔ کمرے میں اور کوئی نہیں تھا، اس لئے ردا کی ہچکیاں بندھ گئیں، یہاں اُس کے صبر و ضبط میں نکلے آنسوؤں کو، 'خود ترسی' کا طعنہ دینے والا کوئی نہیں تھا۔ شاید اُسکا لاشعور بھی یہ جانتا تھا! نماز سے فارغ ہوکر، اچانک اُس کا دل، بہت گھبرایا، وہ بے قراری میں اپنی سیٹ سے اُٹھی اور، دفتر کی عمارت سے باہر نکل کر، لان میں تیز قدموں سے چلنے لگی۔ آنسو سوکھ جاتے، پھر رہ رہ کر، اُمڈ آتے۔ وہ ایک ستائی ہوئی ہرنی کی طرح، کافی دیر تک یونہی چکر لگاتی رہی۔ پھر، واپس اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ یکبارگی تو اُس کا جی چاہا، کہ، دفتر سے نکلے اور پیدل ہی، میلوں کا سفر طے کر کے، اپنے گھر کی پناہ گاہ میں پہنچ جائے۔ پھر خیال آیا، کہ ایسا کرنے سے، اُس کی پیشہ ورانہ ساکھ کم ہو جائے گی۔ باس کو، یہ گمان گذرے گا کہ، وہ اپنے گھناؤنے مقاصد میں کامیاب ہو گئی ہے۔ کام کرنا، اور برسرِ روزگار رہنا، اُس کا حق ہے، اور وہ یہ حق، باس کی، اس سازشی حملے کے نتیجے کے طور پر کھونا نہیں چاہتی۔ اُس کا بیٹا، ایک طویل المیعاد بیماری کے علاج کے لئے ہسپتال میں داخل تھا۔ ابھی چند مہینے باقی تھے۔ اُس کا شوہر، دس برس پہلے اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔ وہ اپنے کنبے کی واحد کفیل تھی۔ ابھی بچوں کو، خود کفیل اور خود مختار بنانے میں وقت درکار تھا۔ پھر، شام کو، دفتر میں پارٹی بھی تھی۔ جس میں شامل ہونے کی وہ ہامی بھر چکی تھی۔

مارکیٹنگ کی پوری ٹیم اُس کی بہت عزت کرتی تھی۔اُس کے نہ جانے پہ لوگ ایک دوسرے سے وجہ پوچھیں گے۔اور پھر، بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔اُس کے جذباتی ہونے کے چرچے کئے جائیں گے۔اور آج کے دور میں، جذبات کو ایک منفی شے مانا جاتا ہے۔لوگ جذبات دبا کر، دل کا دورہ تو پڑوا لیتے ہیں، لیکن، اظہار کرنے کا کو خطرہ مول نہیں لیتے!

وہ اپنا کمپیوٹر چلا کر، بیٹھ گئی اور کام کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں اُسے احساس ہوا، کہ زُبیر والے کمرے میں غیر معمولی خاموشی ہے۔ورنہ روز تو وہاں سے گاہے بہ گاہے، قہقہوں، اور ہلکے پھلکے مزاح والے جملوں کے تبادلوں کی آواز یہاں تک بھی آتی تھی۔آج تو ایسا لگ رہا تھا، کہ جیسے، وہاں کوئی نہ ہو۔ پھر وہ سر جھٹک کر، کمپیوٹر اسکرین کی طرف متوجہ ہوگئی۔پانچ منٹ گذرے تھے کہ اُس کی آنکھوں سے پھر آنسو رواں ہو گئے۔کمپیوٹر کے مانیٹر سے نظر ہٹا کر، اُس نے، ایک کاغذ پر قلم لے کر لکھنا شروع کر دیا۔ایک آزاد نظم ہوگئی۔

"آج دفتری میٹنگ میں،
جب تم مجھ پہ چڑھ چڑھ کے،
بلا وجہ چلاتی تھیں،
میرے پندار کی چادر کو
سرِ عام دریدہ کرتی تھیں!!
میں بس اتنا سوچ رہی تھی،
تم نے یہ شیطانی شرر،
یہ فرعونوں سا لہجہ،
دِلا ورروح کچلنے والا،۔۔
یہ کڑوی، چبھتی باتیں،
(ذہن میں گڑی رہ جانے والی)
تیزاب صفت وزہریلی،
کب اور کہاں سے سیکھیں؟
وہ کیسا عالم تھا،
جس نے تم کو،
ایسا درندہ بنا دیا؟
پھر بھی تم کو میں معاف کرتی ہوں
چلو زہریلی عورت! تم کو بھی
ٹوٹے مگر بڑے دِل سے،
سلام و دُعا شفا پہنچے"

اُس نے کاغذ کا وہ پرزہ اُٹھایا، اور زُبیر کے کمرے میں چلی گئی۔سب نے اُس کی طرف چور نظروں سے دیکھا اور اپنے اپنے کام میں بظاہر مشغول نظر آنے لگے۔ رِدا نے کاغذ، زبیر کے سامنے کیا۔زبیر اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ لوگ اپنے اپنے کیوبیکلز سے، زبیر کی سیٹ کی طرف متوجہ ہوگئے۔زبیر نے کچھ اچھنبے سے کاغذ لیا اور پڑھنا شروع کیا۔سب اُس کا چہرہ پڑھنے میں مصروف تھے۔ زُبیر کے چہرے پر ایک مئودبانہ مگر پُرتسکین مسکراہٹ آتا دیکھ کر سب نے ایک ساتھ گہری سانس لی، تو، کمرے کے سناٹے میں ارتعاش پیدا ہوا۔رِدا انہی قدموں پر مڑی اور واپس آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔اپنے ذہن کو کام میں مرکوز کرنے کی سعی کرتی رہی۔چھٹی ہوئی تو سب لوگ جلدی جلدی اپنے گھروں کو روانہ ہوئے، کہ خود بھی رات کے ڈنر اور محفلِ غزل کے لیے تیاری کرنا تھی اور اپنی بیویوں کو بھی ساتھ لے کر آنا تھا۔ دفتری خرچے پر ایسے پروگرام تو شاذونادر ہی ہوتے تھے۔مارکیٹنگ ڈیپارٹمینٹ کے پاس، کامیابیوں کے جشن منانے کے لیے بجٹ تھا۔ باقی سب ڈیپارٹمنٹ صرف زبانی تعریف (جو کہ اس سے بھی شاذونادر ہوتی تھی) سے کام چلا لیتے تھے۔ رِدا اپنی سیٹ پر بیٹھی کام

کرتی رہی۔ اُسے یہ ڈر تھا کہ اگر وہ گھر گئی تو پھر، وہ یقیناً واپس نہیں آ پائے گی۔ اُسے تو ویسے بھی ایسی پارٹیوں سے کوئی غرض نہیں ہوتی تھی۔ چند لوگ جو بحالتِ مجبوری، یا گھروں کی دوری کی وجہ سے، دفتر رُکے ہوئے تھے، انھوں نے رِدا کی موجودگی کے بارے میں کچھ بھی کہنے سے گریز کیا۔ پیون محمود نے جس اخلاق سے چائے اور بسکٹ لاکر رِدا کو دیئے، اُسی سے اندازہ ہوگیا کہ، آج دفتر میں رِدا کی بے عزتی، موضوعِ گفتگو رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد محمود، دو گرم گرم سموسے اور ایسپرین کی گولیوں کا پتا لاکر، کافی (coffee) کے، بھاپ دیتے مگ کے ساتھ رِدا کے پاس، رکھ کر خاموشی سے چلا گیا۔ اُن کو پارٹی کے بہت سے کام کرنا تھے۔

رِدا کے چہرے پر ایک افسردہ سی مسکان آگئی۔ نہ جانے کیوں اُسے وہ، دن یاد آیا، جب، اُس کو ابا نے، شادی کے بعد بھی اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کرنے پر، اُسکی ستائیسویں سالگرہ کے روز، پانچ سو گز کے بنگلے کی چابی دی تھی! شاید، زندگی کے سارے ہی تمغے، پُل صراط سے گذر کر ملتے ہیں۔ مگر وہ تو اسکا ترکہ میں حصہ بھی تھا۔ سب جانتے تھے، کہ باس بی بی، کے حکم کے مطابق، 'کافی' (coffee) صرف 'سینیر مینجمینٹ' کے لیے اور خاص الخاص، مہمانوں کے لئے وقف تھی! محمود کو معلوم تھا کہ رِدا کو کافی پسند ہے۔ اور وہ جب بھی دیر تک کام کرتی تھی، اپنے گھر سے کافی کا ڈبا لاکر، کافی بنواتی تھی۔ مغرب کی نماز کے بعد، رِدا نے اپنا آفس بیگ، دراز کے بڑے خانے میں لاک کیا۔ بال درست کیے اور، اپنی تسبیح ہاتھ میں لیے، وہ لان میں آگئی۔ واک کرتے کرتے وہ اپنے روزانہ کے معمولات والی

تسبیحات کرتی رہی۔ آنسو کہیں، آنکھوں کے آس پاس، چوکیداری کو کھڑے تھے۔ لان میں فرشی نشست تیار کی جارہی تھی۔ شامیانے لگانے والے، اپنا کام کررہے تھے۔ وہ اُن کے کام میں مخل ہوئے بغیر، لان اور برآمدے کے کنارے کنارے، واک کرتی رہی۔ بھولی بسری یادیں اس کی تسبیح میں دراندازی ہوتی جاتی تھیں۔ جو بنگلہ ابا نے اسے دیا تھا، اور جو پلاٹ مرحوم شوہر نے، خرید کر، رکھا تھا، اُس پر تو دیور اور دیورانی نے، بوڑھے سُسر کو، مجبور کرکے، اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ رِدا نے بڑی مشکل سے، کورٹ کچہریاں بھٹک کر، ایک فلیٹ جتنا حصہ حاصل کرلیا تھا۔ جو کہ وکیلوں کے مطابق، اس کی خوش نصیبی تھی۔ رشوت دے کر، جعلی کاغذات بنا کر، دیور نے، ماں جیسی بھابی کا حق اپنے طور سے ادا کیا تھا۔ اگر وہ اُس کے گھناؤنے، اشاروں پر ناچنے کے لیئے تیار ہوجاتی، تو، پھر تو شاید وہ اپنا بھی آبائی مکان اس کے سپرد کر دیتا۔ رِدا اپنے بچوں کو لے کر، خاموشی اور بُردباری سے الگ ہوکر، شہر بدل کر، ایک معقول سے علاقے میں اپنے فلیٹ میں آن بسی۔ سترہ سال اسی طرح گذر گئے تھے۔ نوکریوں میں اپنی عزت محفوظ رکھنا، کتنے ہی گندے ذہنوں اور بھوکی نظروں کا سامنا کرتے ہوئے، اپنی روزی عزت سے کمانا، اور اکثر شیطانیت سے بچنے کے لیئے، نوکری ہی بدل لینا، کم تنخواہ پر، بے تحاشا کام کرنا، اور صبر سے کرتے ہی جانا، کوئی اوچھا ہتھکنڈہ استعمال نہ کرنے پر قائم رہنا، وہ جو شیر لانا تھا، جس سے، اللہ راضی ہوتا تھا۔ اسی لئے تو ترقی کے دروازے اس کے لیئے کم کم یہ کھلتے تھے۔ جنسی حراسانی کے حربے بہت سارے ہیں اور، جب شیطان کو، ہم

اپنی اعمال سازی کا ٹھیکہ دے دیتے ہیں تو، فرعون ہر دفتر، ہر محلے میں ٹکراتے یہ رہتے ہیں۔ یہ نوکری اس نے یہ سوچ کر کی تھی، کہ پیسے کم یہ سہی، باس تو عورت ہے! اس خیال کے ساتھ ہی، آنسو پھر، مچلے۔ رِدا نے فوراً اپنا دھیان تسبیح کے معانی کی طرف کر کے، جذبات کو قابو میں کیا۔ پارٹی کے شروع ہونے کا وقت تو کب کا گذر چکا تھا۔ میزبان، ہنوز، موبائل پر فون کر کے، اپنے پہنچنے کی اطلاعات دفتر کے نچلے عملے کو دے رہے تھے۔ فنکار آ چکے تھے۔ ایک طرف گھاس میں بیٹھے ستا رہے تھے اور بار بار اپنی گھڑیاں دیکھ رہے تھے، کہ شاید کوئی اشارہ سمجھے اور پروگرام شروع کرنے کا عندیہ دے دیں۔ دفتری محمود دو تین بار، خاصی رعونت سے ان سے کہہ چکا تھا، کہ 'ایسی پارٹیوں میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔ دیر سویر تو ہو یہ جاتی ہے۔' محمود بھی خود کو، اِن ہوائی روزی والوں سے بہت اونچا محسوس کر رہا تھا۔ ویسے بھی اسے تو 'اوور ٹائم' ملنا تھا! رِدا، نے تسبیح مکمل کر لی، تو اس نے جا کر، ان فنکاروں سے، ادارے کی طرف سے، ناپابندیِ وقت کی تہہ دل سے معذرت کی۔ ان کو اپنے ہاتھ سے پانی پلایا۔ اور انتہائی عاجزی سے بتایا کہ 'کالج کے زمانے میں، میں نے بھی کلاسیکل گانا سیکھا تھا۔ تھوڑا ہی سیکھا تھا۔ اور اب تو سالوں بیت گئے کہ، ریاض کرنا تو در کنار، راگ سننا بھی یاد نہیں رہتا۔'

گلوکار صاحب نے، ہنس کر مئودبانہ عرض کیا کہ،

'محترمہ ہم کو تو اس بات کی خوشی ہے کہ کوئی سُر شناس، ہمیں سنے گا۔ اور آپ سے داد ملے گی تو، ہمارا سیروں خون بڑھ جائے گا۔ ہم آپ کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ آپ نے ہمیں اتنی عزت دی، پانی کو پوچھا بلکہ خود پانی کی بوتل اٹھا کر لائیں، یہ بہت بڑی بات ہے۔ ہم تو ویسے بھی تیس کلومیٹر کا سفر کر کے آئے ہیں اور دو گھنٹے تو انتظار کرتے ہی ہو گئے۔ آپ نے معذرت کی، ورنہ کون ہم ایسوں کو پوچھتا ہے۔ آج کے دور میں تو، لوگ ہمیں ذلت نہ دیں تو ہی ہم غنیمت جانتے ہیں، جی، عزت دینا تو لوگ بھول ہی گئے۔' رِدا کے آنسو پھر بے پردہ ہونے کی کوشش میں تھے، اور وہ وہاں سے جلد ہٹ جانا چاہتی تھی۔

وائلن نواز نے، خاصے، بے زار انداز میں، رِدا سے درخواست کی کہ وہ اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے، ذرا پروگرام شروع کروا دے۔ رِدا، کسمسا کے رہ گئی۔ اس نے سوچا کہ اگر، یہ میرا قائم مقام ڈائریکٹر ہونے کا دور ہوتا تو یہ فنکشن اب تک شروع ہو کر ختم ہو چکا ہوتا، کیونکہ کل بھی کام کا دن ہے چھٹی نہیں ہے۔ مگر آج میں قائم مقام باس نہیں۔ اصلی باس تو ابھی تک خود بھی نہیں آئی ہیں۔ پھر بھی وہ انہیں تسلی دے کر چلی آئی، کہ میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔ اس نے دیکھا کہ مارکیٹنگ مینیجر تو آ چکے ہیں۔ وہ ان کے پاس گئی۔ اور سلام کر کے، کہنے لگی،

"سر، پروگرام ارینج کرنے پر بہت مبارک ہو۔ بہت خوشی ہوئی۔ آفس کے جو لوگ، گھر نہیں گئے تھے، وہ پریشان ہو گئے ہیں کیونکہ، جو ٹائم دیا گیا تھا، اُس سے بھی دو گھنٹے اوپر ہو چکے ہیں، اور، ابھی تو بہت کم لوگ آئے ہیں۔ کل ورکنگ ڈے ہے۔ اگر لوگ بہت دیر سے گئے تو، صبح کیسے وقت کی پابندی کریں گے۔ اور آپ کا ڈیپارٹمنٹ تو، ویسے بھی پابندیِ وقت کے لئے مشعل راہ ہے!

مارکیٹنگ مینیجر صاحب نے، فوراً جوابی کاروائی کی،
'ہاں میں دیکھ رہا ہوں کہ، ابھی تک آپ کی باس، ڈائریکٹر صاحبہ بھی نہیں پہنچی ہیں۔ اُن کے بغیر پروگرام کیسے شروع کر سکتے ہیں۔ پروٹوکال کا خیال تو رکھنا پڑتا ہے۔ ویسے میں چیک کرتا ہوں کہ لوگ ابھی تک کیوں نہیں پہنچے۔
اور یہ کہہ کر انھوں نے اپنا چالیس ہزار والا موبائل سیٹ، ایک شانِ بے نیازی سے، کھولا، اور، بظاہر نمبر تلاشنے لگے۔
رِدا نے یہ بتانا مناسب نہیں سمجھ کہ، سبھی گھر پر بیٹھے بیٹھے ایک دوسرے کو فون کر کے، پوچھ رہے ہیں کہ کتنے لوگ پہنچے ہیں، تا کہ ان کو انتظار کی زحمت نہ اٹھانہ پڑے۔ اور مینیجر صاحب بھی یہ ہرگز بتانا نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنی اس منظورِ نظر کا انتظار کر رہے ہیں جسے ادارے نے ان کے ساتھ، ایک ہوٹل کے کمرے میں، رات گذارنے کی، عملے کی طرف سے کی گئی شکایت پر، انکوائری کے بعد برخاست کیا گیا تھا۔ مینجر صاحب کے روابط چونکہ سب سے اعلیٰ افسر کے ساتھ تھے اس لیے ان کا بال بھی بانکا نہ ہوا تھا۔ مگر، منظورِ نظر کو اس کی بظاہر کھوئی ہوئی ساکھ واپس دلانے کا اس سے اچھا اور کوئی موقعہ نہ تھا۔ یا شاید یہ موقعہ ہی اس لیے فراہم کیا گیا تھا۔ وہ آنے سے، کترا رہی تھی اور روایتی، نخرے دکھا رہی تھی۔ اسی کو فون کر کر کے وہ منا رہے تھے۔ آخرِ کار، اس کی ضد کے آگے گھٹنے ٹیک کر، انھوں نے اپنی دفتر کی گاڑی بمعہ دفتر کے ڈرائیور کے، اسے لینے کے لیے بھیجی۔ شومیٔ قسمت سے، باس رخسانہ اور وہ دونوں استقبالیہ گیٹ پر آگے پیچھے پہنچے۔ مینیجر صاحب، تو اپنا دل ہاتھوں میں لیے، آنکھیں فرشِ راہ کیے، اپنی منظورِ نظر کو پوری پروٹوکال سے، گاڑی کا دروازہ کھول کر، ریسیو کر رہے تھے۔ اور باس صاحبہ کو سرسری، طور پر ہلو ہائے کر کے اندر آنے کا اشارہ کرتے وہ، اپنی نازنین کے پیچھے پیچھے اندر آئے۔ باس نے راندۂ درگاہ کو یوں وی آئی پی استقبال ہوتے دیکھا، تو ایک لمحے کے لیے بھنا ہی گئی۔ مگر دوسرے لمحے ابھی کچھ دیر پہلے دیکھے ڈرامے کا سبق یاد آ گیا۔ مینیجر کے تعلقات بہت اوپر تک تھے۔ 'سب چلتا ہے یار' کہہ کر، وہ آنکھ مار کر، تیز قدموں سے آگے نکل گئی اور ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر، بڑے نوابی انداز میں بیٹھ گئی۔ اور ادھر ادھر دیکھنے لگی، کہ میری پوری ٹیم ٹائم پہ پہنچی یا نہیں ورنہ صبح کے لیے دوسرا قربانی کا بکرا تو تیار رملے گا۔ رِدا کو سب سے آگے، یوگیوں کی طرح آلتی پالتی مارے، خاموش بیٹھے، تسبیح کے دانوں سے کھیلتا دیکھ کر، باس کو ایک چار ہزار وولٹ کا جھٹکا ہی تو لگا۔
'یہ ...... یہاں، ارے باپ رے...... میں نے تو سوچا تھا کہ یہ اب دو تین دن تک دفتر میں منہ نہیں دکھائے گی، مگر...... یہ کیا چکر ہے؟
اُس نے فوراً مارکیٹنگ مینیجر کو آواز لگائی:
'فرحان، بھئی آج کس کس کو بلایا ہے، کچھ ہمیں بھی تو پتا پڑے!
فرحان نے وہیں سے جواب دیا،
''ابھی معلوم ہوجائے گا میڈیم، سرپرائز ہے۔ بڑے بڑے لوگ آنے والے ہیں۔ اور پلیز یہ بات نوٹ کریں کہ، ہم نے یہ پارٹی آپ کے آنے تک، ملتوی کر کے رکھی تھی! بڑا پریشر تھا ہم پر، کہ جلدی کریں، مگر، ہم نے۔ آپ کا انتظار کیا۔ یادر کھیئے گا...... ہاں۔
باس بی بی کی تو جان ہی نکل گئی۔ ان دیکھا

خطرہ سر پر منڈلانے لگا: جل کر سوچنے لگی:
''یہ ہی وجہ ہے، کہ یہ اسٹوپڈ (Stupid) ردا اتنی بے عزتی کے بعد بھی پارٹی میں آئی ہے۔ اب سمجھی۔ مگر میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ یہ کل کی ادارے میں آئی، اپنے آپ کو منوانے چلی ہے۔ ذلیل کہیں کی، صبح کی ڈوز سے کام نہیں بنا۔ دیکھ لوں گی میں بھی۔ مجھ سے پنگا لیتی ہے ویسے اس نے کپڑے تو وہی صبح والے پہنے ہیں۔'' باس نے نخوت سے اپنے، شاندار بوتیک والے جوڑے کو دیکھا۔ مگر پھر بھی تسلی نہ ہوئی، ''یہ ایڈیٹ (IDIOT) فرحان پہلے سے ذرا سی ہنٹ (HINT) ہی دے دیتا تو، میں بھی ذرا اچھی طرح تیار ہو کر آتی۔ یہ اتنی دفعہ پہنا ہوا جوڑا، پھر تو نہ پہنتی۔ ماں کہتی ہے۔'' انسان کے لباس کی طاقت سو میں نوے اور باقی شخصیت کی طاقت ہوتی ہے!'' چلو، میں نے اس ردا سے تو اچھا ڈریس اپ کیا ہے۔ مگر اس نے کپڑے کیوں نہیں چینج کیے۔ کہیں ہمدردیاں سمیٹنے کا کوئی داؤ تو نہیں چل رہی، یا۔۔۔ ایسا تو نہیں کہ دفتر میں بیٹھ کر اپنی کارکردگی کا رعب ڈال رہی ہے، کہ اس سے زیادہ کام کسی کے پاس نہیں۔۔

باس میڈیم نے، پاس سے گذرتے ہوئے، رفاقت علی سے پوچھا:
''اے رفاقت علی، آج دفتر میں کس کس نے لیٹ سٹنگ (LATE SITTING) کی تھی؟
''میڈیم، لیٹ سٹنگ کی تو نہیں تھی، کرنی پڑ گئی تھی! جن کا گھر دور ہے، وہ سب نہیں گئے، جانے آنے میں ہی ٹائم ہو جاتا، اور ڈبل کرایا الگ خرچنا پڑتا۔
''اچھا! اچھا! اپنی حد میں رہو، او کے! میں نے صرف یہ پوچھا ہے، کہ کون کون رُکا تھا۔ جتنی بات پوچھ رہی ہوں، بس اتنا جواب دو۔
''جونیر اسٹاف رُکا تھا۔ اُن کو تو اوور ٹائم ملے گا۔ کچھ اور لوگ بھی رُکے تھے۔ میں تو رُکا ہی تھا، آپکو تو معلوم ہے میں تو ایک گھنٹے کا فاصلے پر رہتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ چلنے لگا، پھر نہایت ڈرامائی انداز میں، گردن پلٹا کر بولا۔
''اوہ ہاں، وہ ردا میڈیم بھی رُکی تھیں۔
یہ کہہ کر وہ، باس سے محفوظ فاصلے پر بیٹھے ہوئے ایک گروپ کے پاس جا کر براجمان ہو گیا۔
''تو یہ کمینی بھی رُکی تھی! کیوں رکی تھی بھلا! سب جانتی ہوں۔ ٹھیک کر کے نہ رکھ دیا تو، میرا بھی نام رخسانہ نہیں۔ ایکسٹرا سمارٹ بنتی ہے یہ۔۔۔ اوہ۔۔۔'' مسلسل گیٹ پر نظریں جمائے بیٹھی تھی، کہ اب سراج صاحب کی گاڑی آئے اور اب وہ جا کر، اُن کو سلام کر کے ایسے گھیر لے کہ کسی اور سے بات کرنے کا موقعہ ہی نہ ملے۔ بیرا آنے والی گاڑی پر، وہ لپک کر اٹھنے کا پوز بناتی مگر پھر، پینترا بدل کر یوں تاثر دیتی جیسے، کہ وہ بہت ہی بے آرام بیٹھی ہے، اور، لان کی امپورٹیڈ دبیز دوب والی مخملیں گھاس اُسے، بچھی ہوئی موٹی چاندنی میں سے چبھ رہی ہو! جیسے، ساٹن کا نرم گاؤ تکیہ اُس کے، آسائیشوں کے عادی جسم کو چبھ رہا ہو۔

باس کی سوچ کا عکس اس کے چہرے پر لہرا رہا تھا، مگر اس کی سوچ کی تان، مائیک پر فنکار کے تمہیدی کلمات نے توڑ دی۔
گلوکار نے، راگ بہاگ میں مرزا غالب کی غزل شروع کی۔ وائلن نواز نے بھی اپنے دل کا درد سمو کر، سنگت کی۔ ردا کا دل اور گداز ہو چلا۔ جب وہ مقطع پر پہنچے:

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے!

تو رِدا کی آنکھوں سے پھر آنسو رواں ہوگئے۔ عجیب بات تھی کہ آج جذبات قابو ہی میں نہ آرہے تھے۔ اُس نے شکر کیا کہ، وہ سب سے اگلی صف میں، تنہا تھی، ورنہ، آنسوؤں کی داستانِ اذیت اوروں پر بھی عیاں ہوجاتی۔ فنکار، غزلیں سناتا جارہا تھا، اور، رِدا کی آنکھیں، اشک بہاتی جاتی تھیں، جنھیں وہ، نہایت، سلیقے سے، اپنے آنچل کے کونے میں، سموتی جاتی۔ جہاں آنسو آتے وہ، آنچل کا کونا تھام کر، ہاتھ پیشانی تک لے جا کر، داد دینے کا سا انداز اختیار کرتی، اور، اسی عمل میں آنسو بھی، سمیٹ لیتی، اور پھر، مُسکرا کر، جھوم کر، سر ہلا کر، گردن جھکا کر۔ فنکاروں کی انکساری سے پذیرائی کرتی۔

تھوڑی دیر گذری تھی، کہ رِدا نے دیکھا، کہ زبیر اور اکاؤنٹ آفیسر سلمان آکر، یہ کہتے ہوئے اُس کے پاس بیٹھ گئے، کہ، 'غزلوں سے تو دراصل صرف رِدا، تم کو ہی کو لطف اندوز ہونا آتا ہے، اور، ہم بھی ذرا تم سے سیکھیں کہ کہاں کہاں داد دینی ہے!'

سراج صاحب بھی نہ جانے کب آکر، پچھلی صف میں بیٹھ گئے تھے۔ اور اچھے شاعروں کے کلام سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ فرحان اپنی منظورِ نظر کو ساتھ لیئے اُن کے نزدیک بیٹھ گیا تھا۔

باس بی بی کے دل پر سانپ لوٹ گئے، جب وہ بھی سراج صاحب کی نظر پا کر، اُن کو، اشارے سے وِش کرتے ہوئے اُٹھ کر اُن کے پاس آنے کو تھیں، مگر اُنھوں نے، جلدی سے ہاتھ سے روک دیا کہ وہیں بیٹھی رہو، یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ سکون سے موسیقی سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔

رات بہت بیت گئی تھی۔ اور کوئی دفتری سیاستی بڑھوتری کا چانس بھی نہیں بنتا دکھائی دے رہا تھا۔ بے زار ہوکر، باس بی بی نے فرحان کو اشارہ کیا کہ کھانا لگوادو دیر ہوگئی ہے۔ فرحان نے واپسی اشارہ کیا کہ، 'ذرا اُدھر تو دیکھیں، 'بگ باس' موسیقی سے کتنا لُطف اندوز ہورہے ہیں۔ ایسے میں کیسے رکوا سکتا ہوں۔ وہ اپنی منظورِ نظر، کے قُرب سے، اور رُخسانہ کے چیں بہ چیں ہونے سے، بہت ہی خوشی محسوس کررہا تھا۔ ایسے موقعے بار بار تھوڑا ہی ملتے ہیں۔

اُدھر سراج صاحب دیکھ رہے تھے، کہ، دھیرے دھیرے تمام، اسٹاف، رِدا کے قریب قریب جمع ہوگیا ہے۔ سوائے فرحان کے، جو اپنی ہی مصروفیت میں مگن تھا۔ وہ زیرِ لب مُسکرائے۔ اسی لیے اپنی بیوی کو ساتھ لے کر نہیں آیا یہ اور رِدا تو اپنے ڈیپارٹمنٹ کی رول ماڈل ہے۔ ایک بہترین مثال۔ انھوں نے گھڑی دیکھی اور، فرحان کو دیکھا۔ فرحان، جلدی سے اُٹھا اور، برامدے میں کھڑے اسٹاف کو کھانا لگوانے کی ہدایت کی۔ کوئلے پنکھوں کی ہوا سے دھکنے لگے، اور، بھنتے ہوئے گوشت اور کبابوں کی خوشبو فضا میں پھیلنے لگی۔ حساس فنکاروں نے بھی، آخری غزل، راگ بھیرویں میں شروع کی، اور سماں بندھ گیا۔ بہت ہی خوبصورت اختتام تھا شام غزل کا۔ چاند، جو آسمان کی پیشانی سے بیچوں بیچ ایک نقرئی ٹیکے کی طرح، اس محفل کے آغاز میں تھا، اب ایک جھومر کی طرح، ایک طرف کو ڈھلک آیا تھا۔ رِدا کی پہلی تالی سے، تالیوں اور داد و تحسین کا ایک سیلاب سا اٹھا۔ فنکاروں کے چہرے، خوشی سے، دمک اٹھے۔ رِدا اُن کے

احترام میں، اُٹھ کھڑی ہوئی اور پُر جوش اور عقیدت مندانہ انداز میں تالیاں بجاتی، داد دیتی رہی۔ سراج صاحب دیکھ رہے تھے، کہ اُس کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے، تمام اسٹاف، کھڑا ہو کر، داد دے رہا تھا۔ ماسوائے، ڈائیریکٹر رخسانہ کے!

کھانے کے دوران، رُخسانہ، سائے کی طرح رِدا کے ساتھ ساتھ لگی رہی۔ ردا کو گمان گذرا کہ، شاید اپنے صبح کے ناروا رویئے کی وجہ سے، شرمندہ ہے اور تلافی کر رہی ہے۔ باس رُخسانہ، پوری کوشش میں تھی کہ رِدا کو تنہائی میں سراج صاحب سے بات کرنے کا موقع نہ مل جائے۔ اور وہ اُس کی متورم آنکھیں نہ دیکھ سکیں۔

ابھی سب، نان اور تکے کبابوں سے اُلجھے ہوئے تھے، کہ، فرحان کی آواز مائیک سے گونجی اور، سب کو اطلاع دی گئی کہ، سب لوگ اپنے کھانے کی پلیٹیں لے کر، لان میں اپنی فرشی نشستوں پر آکر، براجمان ہو جائیں کیونکہ سراج صاحب ایک بہت مختصر سی بات سب سے کرنا چاہیں گے۔ باس بی بی تو کھول کر رہ گئی۔

'اب آدھی رات کے بعد اِس بڈھے کو کیا بات کرنی ہے۔ تقریر اور تصویریں اتروانے کا بڑا شوق ہے ایڈیئٹ کو۔

چند منٹوں میں سب اپنی اپنی پلیٹیں بھر کر، لان پر آ کر براجمان ہو گئے۔ رُخسانہ بی بی، سب سے پچھلی جگہ پر، بُرا سا منہ بنائے بیٹھ گئی۔ گاؤ تکیئے سے ٹیک لگاتے ہوئے اُس نے دیکھا کہ زُبیر، ردا کے قریب بیٹھا ہے۔ اور تو اور، سارے کا سارا اسٹاف ہی ردا کے ساتھ اگلی نشستوں پر براجمان ہے، اور کچھ اُس کے پیچھے والی نشست میں بیٹھ گئے ہیں۔

'ان کی تو کل میں ایسی کلاس لوں گی کہ نانی مرجائے گی ان کی۔ اور اِس زُبیر کو تو اگلے دو ہفتوں تک، اگر میں نے ایک بھی کلاس اٹینڈ کر لینے دی، تو اپنے باپ کی بیٹی نہیں۔ جب اٹینڈنیس شارٹ ہو گی، تو دیکھتی ہوں کیسے اِس سال ایم۔ بی۔ اے کرتا ہے۔ یہ سمیسٹر تو گیا اِس غدار کا! کل آؤ نہ سب دفتر، طبیعت ایسی صاف کروں گی، کہ، آئندہ اِس کمینی رِدا سے بات کرتے ہوئے بھی سو دفعہ سوچیں گے!'

سراج صاحب مائیک پر آئے اور، گھڑی پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالتے ہوئے بسم اللہ کی۔

'آپ سب کا شکر گذار ہوں کہ، آپ نے کھانے کھاتے ہوئے بھی میری تقریر سُننے کے لیئے خود کو بخوشی تیار کر لیا۔ فرحان، شاباشی کا مستحق ہے، کہ اُس نے اِتنا اچھا پروگرام خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ اُمید ہے کہ آئندہ بھی وہ، ساری ٹیم کا حوصلہ بُلند رکھنے کے لئے ایسے پروگرام ترتیب دیتا رہے گا۔ اور اپنی، بیگم کو بھی ضرور ہم سب کی طرف سے آنے کی دعوت دے گا۔

مختصراً، مجھے آج دو باتیں کرنا ہیں تا کہ، آپ لوگ جلد گھر جا سکیں اور، کل صرف ایک گھنٹے کی رعایت سے، دفتر کام پر آسکیں، کیونکہ میں تو کہہ چکا تھا کہ پروگرام ٹائم پر شروع کریں، میں میٹنگ سے فارغ ہو کر، شامل ہو جاؤں گا۔ پابندیِ وقت تو ہمارے ادارے کا خاصہ ہے۔ تو، پہلی بات یہ ہے، کہ، آض کی بورڈ آف ڈائیریکٹرز اور گورنرز کی مشترکہ میٹنگ میں، میری، سفارشات، اور خود سارے ممبران کی متفقہ رائے سے، محترمہ رِدا کو اُن کی کارکردگی کی بنیاد پر پروموشن دے کر، فوری طور پر آپ کے ڈیپارمنٹ کی ڈائیریکٹر بنا دِیا گیا ہے۔ آفس آرڈر تیار ہو چکا ہے، اور، کل صبح جب آپ دفتر آئیں گے تو، آپ کی میزوں پر اس کی کاپی رکھی

ہوگی۔ ردا نے، جس طرح، گذشتہ ڈائیریکٹر کی، بیرونِ ملک نجی دورے کی وجہ سے غیر حاضری کے دوران، نہ صرف اپنی ذمہ داریوں کو نبھایا، بلکہ، بغیر کسی مدد کے، غیر موجود ڈائیریکٹر، کی ذمہ داریاں عالی شان طریقے سے نبھائیں۔ ساری سینئر مینجمنٹ اور بورڈ آف گورنرز، اس سے بہت مرعوب اور خوش ہوئے۔ اُن کی ہدایت پر، اُن کی اور ہم سب کی نیک خواہشات، محترمہ ردا احمد کے ساتھ ہیں۔ رُخسانہ جلالدین کو دوسرے ڈیپارٹمنٹ میں بھیجا جارہا ہے۔ اُس کے بارے میں آپ کو جلد معلومات ہوجائیں گی۔

'آج میں نے دیکھا ہے، کہ محترمہ ردا میں، خالص قائدانہ صلاحیتیں، اوراخلاقی خوبیاں بدرجہ اُتم موجود ہیں۔ اسی لیے سارا اسٹاف، اس کے کہے بنا، اس کی عزت کرتے ہوئے، اُسکی خوبیوں کو لاشعوری طور پر اپنانا چاہتا ہے۔۔۔'

پہلے تو ایک بلند و بانگ سناٹا سا چھایا، پھر، سب نے پلیٹیں چاندنی پر رکھیں، کھڑے ہوئے اور تالیوں کا ایک سازینہ ساگھن گرج کے ساتھ بج اُٹھا۔ سراج صاحب کا ہاتھ اشارتاً اُٹھا کہ ابھی تقریر باقی ہے، تو سب، تالیاں روک کر پھر متوجہ ہوئے۔

'آپ سے اور ردا سے، صرف اتنا کہنا ہے، کہ، ہم سب کے اوپر ایک ایسا منصف بیٹھا ہے، جو، مناسب وقت پر، اپنے انصاف کو لاگو کرتا ہے، اور، سب صبر کرنے والوں کے ساتھ وہی ہے۔ ادارہ زُبیر کا بھی مشکور ہے، کہ اُس نے، ہم سب کو، بروقت، اس ڈیپارٹمینٹ میں ہونے والی ناانصافیوں کے بارے میں، آگاہ کیا، اپنے ساتھ معتبر ساتھیوں کو بھی، لے کر آیا، تاکہ شُبے کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی۔ اسی لیئے ہم نے یہی ہنگامی میٹنگ طلب کی، اور اسی لیے میں، اس خوبصورت محفلِ غزل کی شروعات سے محروم رہ گیا۔

اُسی وقت گیٹ کی طرف کچھ غلغلہ سا مچا۔ سب نے مڑ کر دیکھا تو، رُخسانہ بی بی، ایکس باس تیزی سے گاڑی میں بیٹھ کر بھاگ رہی تھی۔

سراج صاحب کی آواز نے سب کو پھر سے متوجہ کیا۔

'اب آپ لوگ اطمینان سے، کھانا کھائیں۔ میں تو جلدی کھاتا ہوں اور اب میں آپ سب کو، آپکی نئی ڈائیڑیکٹر، محترمہ ردا احمد کے زیرِ نگرانی، لطف اندوز ہونے کے لیے چھوڑے جاتا ہوں۔ فی امان اللہ۔

سب لوگ اپنے اپنے علاقائی انداز میں رقص کرتے، سراج صاحب کو انکی گاڑی تک رخصت کرنے آئے۔

ایک تاریک کونے میں کھڑے، مہتروں نے، آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر، شکر کیا کہ چڑیل ڈاکو' نجات ملی، اور، ردا کے اشارے پر، وہ بھی، میزوں کی طرف بڑھے، ردا نے، اُن کو اپنے ہاتھوں سے، کبابوں کی قابیں پیش کیں تو، رانی مہترانی بولی، ردا بی بی، تسی اتنا تکلف نہ کرو، ہم تو آج رج کے کھائیں گے، ککّو پھاڑیں گے۔ سچّی کہا ہے بڑوں نے، کہ رب کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔

ردا سر جھکا کر مسکرادی۔ زبیر نے ہنس کر کہا، 'میڈیم یہ آج آپ کی پہلی مسکراہٹ ہے۔ اللہ اس کو ہمیشہ قائم رکھے! آمین۔

گیٹ پہ کھڑا چوکیدار، اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیر کر، ٹھنڈی سانس بھر کر بولا، شکر ہے اللہ تیرا، آج تو نے ہماری دُعا سُنی اور، 'زہریلی' عورت یہاں سے گئی! چاند بھی دھیرے سی مسکرا کر بادل کی ردا میں چُھپ گیا۔

☆☆......☆☆

محبت روٹھ جائے تو...

خوبصورت جذبوں سے متعارف کراتی تحریر کی آخری قسط

بلال نے فوراً ہی ہاتھ پکڑ کر روکا تھا۔

''نہیں یار وہ پریشان ہوں گی۔''

''اسفند یہ غیروں والی بات نہ کیا کر۔ ہم سب ایک گھر میں رہتے ہیں ایک دوسرے کے چھوٹے چھوٹے کام بھی نہیں کر سکتے۔ پہلے ہم کچن میں خود کام کرتے تھے ہماری مجبوری تھی مگر اب جبکہ خاتون ہے کچن سنبھالنے کے لیے، پھر کیوں کریں......؟''

''اسفند بھائی میں بنالاتی ہوں۔'' مریم نے جلدی سے کہا اور کچن کی جانب چل دی۔''

وہ اپنے کمرے میں آ گیا چائے پی کر بھی اسے سکون نہیں آیا، سر میں جیسے جھکڑ چل رہے تھے اور یہ رات پھر اس نے کرسی پر بیٹھ کر گزارنی تھی۔

قریباً تین بجے درید کی آنکھ کھلی تھی اسے چیئر پر بیٹھا دیکھ کر وہ بہت حیران سا اس کے پاس آیا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتا۔ اسفند نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے سر پر رکھ دیا۔

''تجھے قسم ہے میری، کچھ پوچھنا مت، کیونکہ تیرے آگے کمزور پڑ جاؤں گا اور میں نے کسی سے وعدہ کیا تھا کچھ نہ کہنے کا۔''

درید اس کی سرخ ہوتی آنکھیں دیکھتا رہ گیا وہ شروع سے کم بولتا تھا ان سب میں مگر اس نے آج سے پہلے اسفند کو اتنا پریشان اتنا بکھرا ہوا نہیں دیکھا تھا۔

''اچھا، نہیں پوچھتا مگر تو سو جا، ورنہ مجھے بھی نیند نہیں آئے گی۔

لیٹ جاتا ہوں مگر نیند نہیں آئے گی اور وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

صبح وہ تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔ یہ صورتحال درید کے لیے پریشان کن تھی۔ اس پریشانی میں ناشتہ بھی بڑی خاموشی میں کیا جا رہا تھا تب ہی وہ اٹھ کر آ گیا۔

''کہاں؟؟ ریسٹ کر، میں نے تیرے آفس فون کر دیا ہے......؟''

اس نے اسفند کو روکا۔

آفس نہیں جا رہا کچھ ضروری کام ہے جلدی آ جاؤں گا۔

''اسفند تجھے اتنا تیز بخار ہے کہ تیرا چہرہ بھی سرخ ہو رہا ہے بخار سے اور تو کہتا ہے جانا ضروری ہے۔''

''درید پلیز میں میڈیسن لے لوں گا۔''

اس نے فٹ سے کہا تھا درید بے بسی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

اس کی فکر ان سب کو ہو رہی تھی جسے آج کل اپنی تو فکر تھی ہی نہیں۔''

دو دن بخار رہا مگر اسے جیسے پروا نہیں تھی۔

''کہاں ہے تو......!!''

''میں آؤٹ آف سٹی ہوں، کل آؤں گا۔''

درید کے لیے یہ خبر کسی جھٹکے سے کم نہ تھی اسفند فون کاٹ چکا تھا۔ وہ حریم کو لے کر جس در پر آیا تھا وہاں اسے یقین تھا کہ حریم کو مکمل محفوظ پناہ ملی تھی۔ امی اور یاسر اس کی اچانک آمد اور اس کے ساتھ لڑکی دیکھ کر حیران ہوئے تھے مگر اس نے حریم کے سامنے کوئی بات نہیں کی۔ اسے ڈاکٹرز کی تجویز کردہ میڈیسن دی تھی۔ جب وہ پرسکون نیند میں چلی گئی تو وہ امی کے پاس آیا تھا۔

''امی حریم بے سہارا ہے اس کے والدین اس دنیا میں نہیں رہے ہیں گھر کے پیچھے اس کے رشتے داروں نے حریم کی جان لینے کی کوشش کی ہے یہ وہاں بالکل محفوظ نہیں تھی اس لیے میں یہاں لے کر آیا ہوں۔''

''اس کی حالت دیکھ کر میں سمجھ گئی تھی کہ بچی کسی صدمے کے زیر اثر ہے۔''

''جی بہت گہرا اثر لیا ہے حریم نے۔''

اس نے جھوٹ کہا تھا۔ مگر اللہ سے معافی بھی مانگی تھی۔ امی نے اسے یقین دلایا تھا وہ حریم کا بہت خیال رکھیں گی۔ آتے وقت حریم رو پڑی تھی۔

''پلیز حریم...... تم یہاں بالکل محفوظ ہو اور

ہاں پلیز اتنا خیال رکھنا۔

''میں بوجھ بن گئی ہوں آپ پر بھی اور میری وجہ سے آپ بھی مشکل میں آ گئے۔''

''یہ کیا فضول سوچ ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ تم مجھ پر بوجھ نہیں۔ میری ذمہ داری ہو۔''

وہ کہہ تو گیا...... مگر آخر کیا رشتہ تھا ان میں کہ وہ اس کی ذمہ داری بن گئی تھی۔ محض انسانیت کے ناطے وہ اتنا کچھ کر رہا تھا۔

''یہ ساتھ میں میرب رہتی ہے۔ امی تمہیں اس سے ملوا دیں گی۔ وہ بھی ماسٹرز کر رہی ہے۔''

''مجھے نہیں پڑھنا، مجھ میں دنیا کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔''

''مت سوچا کرو ایسا...... تم معصوم ہو، پاک ہو۔''

''ایسا صرف آپ سوچتے ہیں یا پھر محض مجھے تسلی دیتے ہیں...... مجھ سے پوچھیں کہ مجھے اپنے وجود سے کتنی گھن آتی ہے۔'' وہ ایک بار پھر رو پڑی۔

''نہیں حریم میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں اپنے دل سے تمہیں معصوم اور پاکیزہ مانتا ہوں۔ تمہارے ساتھ جو ہوا، اس میں تم بے قصور ہو۔ ایسا کبھی نہ سوچنا کہ میں صرف تمہیں تسلی دیتا ہوں۔''

''آپ کو دیکھ کر رب کی قدرت پر یقین پختہ ہوتا ہے کہ ابھی بھی اس دنیا میں اچھے لوگ ہیں۔''

''تم صرف اپنا خیال رکھنا حریم۔'' وہ آخری وقت تک اسے سمجھا کر واپس آیا تھا مگر روز اس سے بات کرنا اس کے معلوم میں شامل ہو گیا تھا۔

جو چینج درید عباس کو اس میں نظر آیا تھا وہ بہت پوزیٹو تھا۔ اسفند واپس آ کر درید کو بتا رہا تھا کہ وہ حریم کو فیصل آباد چھوڑ آیا ہے۔ یہ خبر درید کے لیے حیران کن تھی مگر وہ خوش تھا کہ اسفند نے اس گھر کو اور وہاں رہنے والوں کو واقعی اپنا مانا۔

☆......☆......☆

چار ماہ گزر گئے تھے درید اور یاسر کی شادی سر پر آ گئی تھی۔ اور رات ہی حریم نے اسے کہا تھا کہ آنٹی ناراض ہو رہی ہیں کہ اتنے کام ہیں یاسر اکیلے کیسے کرے گا۔ اس نے درید کو بتا دیا تھا۔ سو طے یہ پایا تھا کہ وہ سب اکٹھے جائیں گے۔ یوں بھی درید عباس کی شادی کو لے کر سب بہت ایکسائیٹڈ تھے خاص طلال اور نہال، وہ لوگ ایک ہفتہ پہلے ہی فیصل آباد پہنچ گئے تھے۔ امی ان سب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں مریم کو بھی بہت پیار سے گلے لگا کر پیشانی چومی تھی۔ رہی بات اسفند کی تو اسفند سے انہیں محبت بالکل درید کی طرح تھی۔ اسے دیکھ کر انہیں دل میں ٹھنڈک اترتی محسوس ہوتی تھی۔

''اب قدرے فکر کم ہوئی ہے ورنہ اتنے کام باقی ہیں کہ دل ہول رہا تھا۔'' انہوں نے پیار سے اسفند کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ بس ریلیکس ہو جائیں کام یوں ختم ہوں گے کہ آپ کو پتا بھی نہیں چلے گا۔'' اسفند نے انہیں ساتھ لگا کر کہا تھا اور اسفند کی بات پر انہیں بھروسہ بھی تھا۔ وہ مسکرا دیں تھیں۔

''حریم کا سنائیں...... خوف کی کیفیت سے نکلی۔'' وہ سب اپنی باتوں میں مصروف تھے اور اسفند نے بہت ہولے سے ان سے دریافت کیا تھا کیونکہ جب سے وہ آئے تھے حریم محض سلام کرنے آئی تھی۔ اس کے بعد سے دوبارہ نہیں نظر آئی۔

''اللہ کا شکر ہے بچے اب بہت نارمل ہیں۔ پہلے تو گیٹ کی آہٹ پر یوں سہم جاتی تھی جیسے سفید لٹھا

ہو۔ مگر اب یقین کرو۔ پورے اعتماد سے گھر کے سارے کام میرے ساتھ کرواتی ہے تمہارے ابو اور یاسر سے پہلے بات تک نہیں کرتی تھی۔ مگر اب اکثر شام کا وقت ابو کے پاس بیٹھ کر گزارتی ہے۔ کبھی میرب کے پاس چلی جاتی ہے۔'' انہوں نے تفصیلاً بتایا تو اس نے گہری سانس لی اور دل میں رب العزت کا شکر ادا کیا۔

''مگر اسفند...... گھر سے باہر نکلتے اب بھی گھبراتی ہے۔ لوگوں کو فیس نہیں کرتی۔'' یاسر بھی اس کے ساتھ ہی آ بیٹھا تھا۔

''کئی بار بازار جانا پڑا بلیو می اتنی خوفزدہ رہتی تھی۔ سارے وقت کہ امی کا ہاتھ نہیں چھوڑتی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اس کے اندر کا اعتماد لوٹے......''

''وقت لگے گا یاسر...... جہاں اتنا کور کیا ہے انشاء اللہ یہ بھی دور ہو جائے گی۔'' اسے اللہ پر بھروسا ہے۔

شادی کے اتنے کام تھے کچھ وہ لوگوں کے باعث گھر کے کسی کونے میں گھسی رہتی تھی۔ اسفند اب تک اس سے بات نہیں کر پایا تھا۔ درید اور یاسر کی مہندی والے دن بھی یاسر زبردستی اسے باہر لایا تھا۔

''ایک ہی بہن ہو تم ہماری، اور تم ہی مہمانوں کی طرح چھپی بیٹھی ہو، ہمارے ساتھ بیٹھو۔''

وہ آج بھی معمول کے حلیے میں تھی۔ ڈریس ضرور نیا تھا مگر چہرہ ہمیشہ کی طرح سادہ اور شفاف تھا بلیک اسکارف اسی طرح سر اور پیشانی تک لپٹا ہوا تھا۔ اتنے دن میں آج وہ دکھائی دی تھی۔ یہ بات خوشگوار تھی کہ وہ کم از کم گھر کے افراد سے بہت اٹیچ ہو گئی تھی۔

یاسر نے تمام وقت اسے اپنے ساتھ بٹھا کر رکھا تھا۔ مگر رسم کے فوراً بعد وہ ہٹ گئی۔

''آپی پلیز ایک فوٹو تو بنوالیں۔'' طلال نے پکارا تھا مگر اسفند نے اس کے کندھے پر ہاتھ دھر کے روک دیا۔

''وہ نہیں بنوائے گی۔'' طلال نے بڑی حیرت سے دیکھا تھا اسفند کو کیونکہ وہ ہرگز نہیں جانتا تھا اسفند حریم کو یہاں لایا ہے۔

شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی ویسے کے بعد جب تمام کام ختم ہو گئے اور وہ لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے تو وہ اچانک سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

''مجھے آپ کے ساتھ واپس جانا ہے۔'' اس نے سیدھا اسفند کو مخاطب کیا تھا۔

''بیٹھو!'' اسفند نے سکون سے کہا وہ درید کے ساتھ ہی چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔

''یہاں تمہیں کوئی پرابلم ہے۔'' اس نے حریم کی طرف دیکھ کر سوال کیا تھا۔ وہ جز بز سی ہاتھوں کی انگلیاں مروڑنے لگی۔ درید اُٹھ کھڑا ہوا۔

''میں آتا ہوں۔''

اُسے لگا کہ شاید اُس کی موجودگی میں وہ کھل کے بات نہ کرے اس کے جانے کے بعد اسفند نے سوال پھر دہرایا تو اس نے پانی سے بھری آنکھوں سے اسفند کو دیکھا تھا۔

''میں مزید کسی پر بوجھ بننا نہیں چاہتی۔ میرے اکاؤنٹ میں اتنا پیسہ ہے کہ میں اپنا خرچ بخوبی چلا سکتی ہوں۔''

''تم نے خود کو بوجھ کیوں کہا۔'' ساری بات نظر انداز کر کے اسفند نے سوال کیا تھا۔

''سر...... برا وقت جو تھا بیت گیا۔ اب میں ٹھیک ہوں پھر مجھے جہاں جو پرابلم ہوئی میں آپ

سے کانٹیکٹ کرلیا کروں گی۔ پہلے آنٹی تنہا تھیں مگر اب یاسر بھائی درید بھائی دونوں کی وائف ہیں مجھے مزید یہاں نہیں رہنا پلیز......''

''وہاں جا کر کیا کرو گی حریم، اکیلے رہنا تمہارے لیے ٹھیک نہیں۔''

''اکیلا پن عمر بھر کا ہے۔ میں عارضی سہاروں کی عادی ہوگئی تو پھر کیسے رہ پاؤں گی۔''

''مگر ابھی میں تمہیں وہاں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔''

''پلیز......'' وہ گڑگڑائی۔

وہ مزید بات کرتے مگر امی آگئیں اور انہوں نے بات کو وہیں چھوڑ دیا مگر اس کے چہرے پر جو پریشانی اُتر آئی تھی وہ درید دیکھ چکا تھا۔

''کب تک...... اسفند ضیاء، کب تک خود کو کسی کی بے وفائی کی آگ میں جھلساؤ گے جس نے کبھی تمہیں چاہا ہی نہیں۔ اس کے لیے اپنا آپ برباد کر رہے ہو۔ اور جو تمہیں چاہتی ہے......!''

اُس کی آخری بات پر اسفند نے بے یقینی سے دیکھا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔ بھلا تمہیں کسی اور کی آنکھوں میں محبت نظر کب آتی ہے۔ تمہیں تو وہ ہی آنکھیں سچ لگتیں ہیں جو دھوکہ تھیں وہ میری عزت کرتی ہے بہت احترام ہے اُس کی نظروں میں میرے لیے۔''

''تو......! جہاں عزت کی جائے وہاں محبت نہیں ہوسکتی۔ کب تک خود کو دھوکہ دو گے اسفند ......صرف عزت اور احترام کے لیے وہ آنکھیں بند کر کے تمہارے ساتھ آگئی تھی۔ کیوں کرتی ہے وہ تم پر اتنا اندھا اعتماد، میں بتاتا ہوں۔ پیار کرتی ہے وہ تم سے، تبھی اپنی زندگی کے ہر فیصلے کا اختیار تمہیں سونپ دیا ہے۔ مگر تم ...... تمہاری طرف

سے اسے کیا ہمیشہ کا انتظار ملے گا۔

''یہ فقط تمہاری سوچ ہے درید۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھاما تھا اور خود کو ریلیکس کرنے کے لیے کچھ دیر طلال اور نہال کے پاس جا بیٹھا۔

کل ان سب کی واپسی تھی سوائے درید کے جس نے چند دن بعد آنا تھا۔

''مریم بھابی انجوائے کیا آپ نے......؟'' درید نے پوچھا۔

''جی بہت انجوائے کیا......''

''بھابی درید بھیا دوسرے لفظوں میں پوچھنا چاہ رہے ہیں کہ آپ کو میرب بھابی کیسی لگیں؟'' طلال نے اسے چھیڑا تھا۔ درید ہنس دیا۔

''جی نہیں...... مجھے پتا ہے کہ میرب بہت اچھی ہے۔''

''ہاں واقعی میرب بہت اچھی ہے۔'' مریم نے مسکرا کے کہا تھا۔ حریم سب کے لیے چائے اور ناشتہ لے کر آئی تھی اور سب کو سرو کر کے خود بھاگنے کے چکر میں تھی کہ درید نے ٹوک دیا۔

''بیٹھو سب کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیو۔''

''بھیا مجھے امی کے ساتھ کام کرانا ہے۔''

''ہو جائیں گے کام بھی...... یو نو ڈیئر سسٹر مہمانوں کو ٹائم دینا بھی آپ کے فرائض میں شامل ہے اور بعد میں آپ ہمیں یاد کریں گی۔'' طلال نے اسٹائل مارتے ہوئے کہا تھا وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی۔

''حریم یہ سب ہماری فیملی کا حصہ ہیں۔ ان کے ساتھ وقت گزارو بلیو می تمہیں اچھا لگے گا۔''

''میں جانتی ہوں......'' وہ کچھ کہتے لب بھینچ کر اسفند کو دیکھنے لگی۔ بس پل بھر کو دونوں کی نگاہیں ملی تھی۔ پھر حریم ہی سر جھکا گئی۔

''کیوں کر رہی ہو تم اس طرح سے۔''

''کیونکہ میں واپس جانا چاہتی ہوں۔ میں مزید احسان کا بوجھ نہیں سہہ پاؤں گی۔'' موقع ملتے ہی وہ پھر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

''تمہیں یہاں کوئی مسئلہ ہے؟'' اسفند نے گھور کر اُس کو دیکھا۔

''نہیں...... مگر مجھے اچھا نہیں لگتا، میں ساری عمر بوجھ نہیں بن سکتی۔''

''حریم پھر وہی بات تم بوجھ نہیں ہو کسی کے لیے بھی اور میں نے تمہیں یہاں اس لیے بھیجا تھا تاکہ تمہیں تنہا نہ رہنا پڑے۔ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی، کس بات پر تمہیں اعتراض ہے؟''

''آپ کو نہیں لگتا کہ میرے یہاں رہنے پر سب کو اعتراض ہو سکتا ہے امی کب تک جھوٹ بولیں گی اور اب تو رشتہ داری بڑھ گئی یاسر بھائی کے سسرال والے آئیں گے ہر شخص جانتا ہے کہ اس گھر میں لڑکی نہیں ہے پھر میرا وجود؟ آخر کب تک چپ رہ سکیں گے سب......'' وہ چیخ پڑی۔

''پاگل ہو گئی ہو تم......'' پہلی بار اسے حریم پر غصہ آیا تھا۔

''ہاں...... شاید مگر میں کل آپ کے ساتھ جا رہی ہوں۔'' وہ حتمی فیصلہ سنا کر مڑ گئی تھی۔

''تم نہیں جاؤ گی۔''

''کیوں؟ آپ مجھے عمر بھر سوالیہ نشان بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ میں مانتی ہوں کہ آپ کا بہت بڑا احسان ہے مجھ پر......''

''میں نے جو کیا اپنا فرض اپنی ذمہ داری سمجھ کر کیا۔ کبھی بھی تم پر احسان جتانے کو نہیں کیا۔''

''کس حق سے ذمہ داری ہوں میں آپ کی؟'' کس قدر غیر متوقعہ سوال تھا وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے لگا۔

''آج یہ سوال صرف میں نے کیا۔ آنے والے وقت میں سب کریں گے اس دور میں انسانیت کے ناطے کی جانے والی نیکی کوئی تسلیم نہیں کرتا۔'' وہ آج پھٹ پڑی تھی۔ اسفند ضیاء اس کے چہرے پر ضبط اور غصے سے پھیلنے والی سرخی دیکھ رہا تھا۔ بس ایک لمحہ لگا تھا اسے سوچنے میں، اس کے بعد وہ مطمئن تھا۔

''تمہیں اور لوگوں دونوں کو تمہارے سوال کا جواب مل جائے گا کل تک...... اوکے!'' اتنے سخت لہجے میں پہلی بار مخاطب ہوا تھا وہ حریم فاطمہ سے مگر جو لفظ حریم نے اُسے کہے تھے وہ اس کے دل پر لگے تھے۔ وہ واقعی اب تک حقیقت سے نگاہیں چرا رہا تھا۔ سو فیصلہ ہو گیا اور فیصلہ ہوا تو...... دیر بھی نہ لگی تھی۔ اگلے دن بہت سادگی سے بالکل شرعی انداز میں اس نے حریم فاطمہ سے نکاح کر لیا تھا۔ یہ بات سب کے لیے باعث حیرت تھی۔ مگر درید تو منتظر تھا اسے یقین تھا جلد یا بدیر یہ ہی ہونا تھا۔

نکاح کے دو گھنٹے کے بعد انہیں واپس جانا تھا تب ہی وہ اس سے مل کر بات کرنا چاہتا تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ آج کے بعد تم خود کو بوجھ نہیں سمجھو گی۔ تم میری ذمہ داری ہو کس حق سے؟ اب تمہیں یہ بھی خود یا لوگوں کو بتانا نہیں پڑے گا۔'' وہ بہت سنجیدہ تھا۔ آج بھی اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ جیسے اکثر وہ حریم سے بات کرتے وقت کرتا تھا مگر حریم کو لگا وہ غصہ میں ہے۔

''آپ میرے لفظوں سے ہرٹ ہوئے تھے۔'' اُس کی بہت دھیمی سی آواز آئی تھی۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی تعلیم مکمل کرو۔ تمہارے والدین کا خواب تھا کہ تم اسلامک

ہسٹری میں ماسٹرز کرو اور مجھے بھی خوشی ہوگی اگر تم ایسا کرو گی۔ میرب بھائی تمہیں ایڈمیشن وغیرہ میں ہیلپ کر دیں گی۔ اور تم کو کوئی بھی پرابلم ہو کسی بھی قسم کی مجھے فون کر دینا مجھے یقین ہے کہ اب تمہیں مجھ سے کچھ کہتے اپنا وجود بوجھ محسوس نہیں ہوگا۔''

وہ اپنی بات مکمل کر کے اٹھ گیا تھا مگر کمرے سے باہر نکلنے لگا تو اُس کی آواز پر قدم رک گئے۔

''آئی ایم ریئلی سوری! میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میں اسی شخص کو ہرٹ کرنے کا باعث بنوں گی جو میرا محسن ہے۔ میرے لفظوں سے آپ کو تکلیف ہوئی اس کے لیے میں سخت شرمندہ ہوں۔''

اس کے لفظوں پر اسفند نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔ جس کی ساری توجہ اس کی طرف ہی تھی مگر اس کے لیے حریم فاطمہ بالکل نئی تھی۔ اس نے آج تک اس کو بنا اسکارف کے نہیں دیکھا تھا مگر اس وقت وہ سر پر صرف دوپٹہ لیے ہوئے تھی یقیناً نکاح کے وقت اسے تیار کیا گیا تھا۔ وہ ڈریس چینج کر چکی تھی مگر چہرے پر میک اپ اب بھی موجود تھا۔ کئی لمحہ وہ نگاہ نہیں ہٹا سکا تھا۔ اس کے پاکیزہ اور معصوم حسن کو دیکھ کر......

''میں ناراض نہیں ہوں۔ اس بات کو لے کر پریشان نہ ہونا۔ ہاں جو کچھ ہوا یہ میرے اور یقیناً تمہارے لیے بھی غیر متوقع تھا۔ مگر میرا ایمان ہے کہ بنا اللہ کی مرضی کے کچھ بھی ممکن نہیں۔'' اسفند نے نظریں اس کے چہرے پر ہی جمائیں ہوئی تھیں اور اپنی بات مکمل کرتے ہی وہ باہر چلا گیا۔

☆......☆......☆

''اگر تیری یہ ہی حالت رہی تو تیرے آفس والے تجھے فارغ کر دیں گے۔'' محض پندرہ دن بعد پھر وہ فیصل آباد کے لیے تیاری کر رہا تھا۔ جب اسفند نے ٹوکا تھا۔

''کیا کروں...... دل نہیں لگتا اب......'' اس کے لہجے میں سچائی تھی محبت تھی۔ اسفند کئی لمحے اسے دیکھتا رہا۔

''میری مان میرب کو یہیں لے آؤ۔''

''کہا تھا میں نے اُسے وہ نہیں مانی۔ کہتی ہے کہ امی کے پاس رہے گی۔'' اس نے بیگ بند کرتے ہوئے اسفند کو جواب دیا تھا۔

''اس نے ایم ایڈ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ محترمہ کی شادی ہوگئی ہے مگر پڑھائی کا جنون نیں گیا۔''

''اچھا ہے ناں۔''

''تو بھی چل ناں...... حریم خوش ہو جائے گی۔ پچھلی بار میں گیا تو اُس کی نظریں کتنی دیر گیٹ کی طرف رہیں کہ شاید تم بھی آئے ہو۔''

''تم پاگل ہو درید عباس۔'' وہ آنکھیں چرا کر بولا۔

''تو کیا تم نے صرف ذمہ داری نبھانی ہے تمہیں مریم سے محبت نہیں ہے۔ بول...... چپ کیوں ہے۔ درید پوچھ رہا تھا۔''

ٹھیک ہی تو سوچ رہا تھا کیونکہ وہ جس دن سے آیا تھا مڑ کر اس نے نہیں دیکھا تھا حتیٰ کہ پہلے خود روز فون کرتا تھا اور اب کبھی حریم ہی کال کر لیتی تو ٹھیک ورنہ اس نے کال تک کرنا چھوڑ دی تھی۔

''تجھے دیر ہو رہی ہے...... جا......'' وہ سنجیدگی سے اُس کا کاندھا تھپک کر اُٹھ گیا تھا۔

''موڑ لو...... سچائی سے جب تک منہ موڑ سکتے ہو موڑ لو اسفند ضیاء مگر ایک دن تمہیں احساس ہوگا۔'' دو ماہ گزر گئے تھے اسے ائے ان دو ماہ میں درید کا تیسرا چکر تھا اور وہ جیسے بھول گیا تھا کہ کسی

کی آنکھوں میں اپنے نام کے دیے جلا کر آیا تھا۔
''تقریر کرتا رہا تو ٹرین مس ہو جائے گی تیری۔'' اس نے مسکرا کے مزید جلایا تھا اسے۔
''تجھے تو واپس آ کر پوچھوں گا میں۔''
اس نے بیگ کاندھے پر ڈالا اور اسفند نے بائیک کی چابی اٹھائی تاکہ اسے اسٹیشن چھوڑ آئے۔
ٹرین چلنے سے پہلے اس نے کچھ رقم درید عباس کو تھمائی تھی۔
''میرب سے کہنا اسے ایڈمیشن میں ہیلپ کردے مزید کسی بھی طرح کی ضرورت ہوئی تو مجھے بتا دینا۔''
''اسفند اسے صرف ان روپوں کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے سنہری کانچ سی آنکھوں میں دیکھا تھا جن میں یکدم ہی بے چینیاں تیرنے لگیں تھیں۔
''خیانت کر رہا تھا تو حریم کے ساتھ...... جس دل میں جن نظروں میں اسے ہونا چاہیے وہاں اب تک کسی بے وفا ہرجائی یادیں ہیں اور اس کے ٹوٹے وعدوں کی کرچیاں نگاہوں میں لیے بیٹھا ہے تو...... مجھ سے زیادہ تجھے علم ہے اسفند کہ حریم کے کتنے حقوق تم پر واجب ہیں۔''
''دعا کیا کر درید، اللہ پاک میری مشکل آسان کرے۔'' درید کے پہنچتے ہی حریم کی کال آ گئی۔
''تھینکس...... آپ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔'' وہ دھیمی سی آواز میں کہہ رہی تھی۔
''مزید ضرورت ہو تو بتا دینا اور تھینکس کی کیا بات ہے یہ تو میرا فرض ہے۔''
''مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں...... جس کی ضرورت ہے وہ تو شاید بھول ہی گیا۔'' مگر وہ ایسا کچھ بھی نہ کہہ سکی۔
اس سے کہیں بہتر وقت تو وہ تھا جب ان میں کوئی رشتہ نہیں تھا مگر وہ اس کی ہر خوشی کی کیئر کرتا تھا۔ روز فون کرتا تھا اور اب...... وہ خود کبھی دل کو کڑا کر کے اسے فون کرتی تھی۔ کیونکہ اب اس کا لہجہ بھی ویسا نہیں تھا۔ اکثر ہی وہ اس انداز میں بات کرتا جیسے زبردستی کر رہا ہو اور یہ بات حریم کو شدید تکلیف دیتی تھی۔
''آپ سے بات کرنی ہے۔'' کئی لمحے خاموشی کے بعد اس کی آواز گونجی تھی۔
''کہو سن رہا ہوں۔''
''میرے تمام ڈاکومنٹس تمام پیپرز وغیرہ تو وہیں ہیں...... مجھے ایک بار تو اپنے گھر آنا ہوگا ناں۔'' اُس کی بات پر کئی لمحے وہ چپ رہا تھا۔
''حریم میں خود تمہیں رات میں فون کروں گا۔ اس وقت میں تھوڑا بزی ہوں۔'' وہ کتنی دیر منتظر رہی تھی اس کے جواب کی اور اس نے جواب دیا بھی تو کیا۔ حریم نے بنا کچھ کہے لائن کاٹ دی تھی۔
وہ رات بھر انتظار کرتی رہی لیکن کال نہیں آئی تھی۔ اس کی بے جا چپ میرب سے چھپ نہ سکی۔
''اتنی اُداس کیوں ہو۔''
''نہیں تو...... بس یوں ہی۔'' وہ گھٹنوں میں سر دیے سوچوں میں گم بولی تھی مگر میرب کو لگا اس کی آواز بھیگ رہی تھی۔
''تم رو رہی ہو حریم......!'' مگر جواب میں وہ بولی نہیں تھی جس سے میرب کا شک یقین میں بدل گیا تھا، وہ اُٹھ کر اس کے پاس آ گئی۔ خاموش تو کل دوپہر سے ہی تھی مگر صبح سے تو چہرہ بہت اترا ہوا تھا۔

''حریم کیا ہوا ہے؟'' اس نے حریم کو کندھوں سے تھام کر ساتھ لگایا وہ حقیقتاً رو رہی تھی۔ میرب نے اس کے آنسو صاف کیے۔

''کیا بات ہوئی...... گھر میں کسی نے کچھ کہا۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''پھر اسفند بھائی نے کچھ کہا ہے۔''

''اوں ہوں۔''

''بس آج مما بہت یاد آ رہی ہیں میرب...... میری مما نے میرے لیے کتنی جدوجہد کی کہ میں معاشرے میں کمزور عورت بن کر زندگی نہ گزاروں بلکہ ان کی طرح ڈٹ کر حالات سے مقابلہ کروں اور کامیاب زندگی گزاروں۔ لیکن شاید میرے نصیب میں کمی تھی۔ یا میں ان کی طرح بہادر نہیں تھی۔

''پاگل ہو تم بالکل اچھے برے حالات زندگی کا حصہ ہیں اور اسفند بھائی بھی تو یہ ہی چاہتے ہیں کہ تم خود میں اعتماد پیدا کرو۔ پھر سے وہی زندگی جیو......'' اس نے ہولے سے اس کا سر تھپکا تھا۔

''مگر زندگی اب وہ نہیں رہی میرب...... سب کچھ بدل گیا۔'' وہ بہت دل شکستہ اور ٹوٹی ہوئی تھی۔

''کچھ بھی نہیں بدلا۔ انشاء اللہ پہلے کی طرح ہو جائے گا سب کچھ۔'' درید جانے کہاں سے ٹپک پڑا تھا۔

''آنسو صاف کرو اور پیکنگ کرو جا کے اپنی، سیاں جی کی کال آئی تھی رات آپ کے، آپ کو ساتھ لانے کا حکم دیا ہے۔'' وہ رات بھر منتظر رہی اور اس نے درید بھیا کو فون کر دیا تھا۔ مگر اتنے عرصے بعد اپنے شہر جانے کا سُن کر ہی اُس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ درید اور میرب دونوں مسکرا دیے۔

''مجھے تو لگتا ہے میرب...... حریم کو سیاں جی ہی یاد آ رہے تھے۔''

''جی نہیں۔'' اس کا چہرہ گل رنگ ہوا تھا۔ مگر بس اک پل کو اور اُس کی وجہ درد عباس جانتا تھا۔

اگلے دن وہ دونوں شام میں ملتان پہنچ گئے تھے۔ اسفند اب تک نہیں لوٹا تھا مگر باقی سب نے پرتپاک استقبال کیا تھا حریم فاطمہ کا، وہ عشاء پڑھ کر لوٹا تھا...... مگر اس وقت وہ نماز ادا کر رہی تھی۔ اسفند سب کے ساتھ لیونگ روم میں بیٹھ گیا تھا۔

''کیسے تھے سب...... امی ابو ٹھیک تھے۔''

''ایک دم زبردست امی تجھے یاد کر رہی تھیں۔'' وہ سر ہلا کے مسکرا دیا تھا۔

''میرب ٹھیک تھی اسے بھی لے آتے۔'' سوچا تو تھا چلو پھر کبھی سہی۔ درید ہولے سے مسکرا کر بولا۔

''السلام علیکم!'' وہ اندر داخل ہوئی تھی اسفند نے اس کے سلام کا جواب بہت اچھے موڈ میں دیا تھا اس کی خیریت دریافت کی تھی۔ حریم کے دل پر جو بوجھ تھا کہ شاید وہ اب تک ناراض سا ہے۔ کم ہوا تھا۔

''چلو گی ابھی اپنے گھر......!''

''اسفند ساڑھے نو ہو رہے ہیں صبح چلے جانا۔'' درید نے فوراً ٹوکا تھا۔

''صبح یار میں بہت بزی ہوں۔'' اس نے درید کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر ناگوار سے تاثر تھے۔

''چلیں حریم!''

''جی......'' وہ تبھی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

بہت خاموشی کے ساتھ سفر گزرا تھا۔ نہ اس نے کچھ کہا اور نہ ہی حریم کو کوئی بات ملی تھی، بائیک گھر کے عین سامنے روکی تھی اس نے۔

اپنے گھر کا لاک کھول کر قدم اندر رکھتے ہی

اس کا دل بری طرح لرز اتھا۔ ایک خوفناک حادثہ اُس کی ساری زندگی پر محیط ہو گیا تھا۔ وہ اس گھر سے جڑی ساری خوشگوار یادیں جیسے بھول گئی تھی۔ بس وہ ہی دل دہلانے والا منظر یاد رہتا تھا۔

اسفند نے یقیناً اس کی حالت نوٹس کی تھی تب ہی تو اس کا نخ ہوتا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں تھام کر قدم آگے بڑھائے تھے۔

حریم کا یہاں آتے ہی جیسے دم گھٹنے لگا تھا جانے کیوں وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ حتیٰ کہ اسفند جیسے گھنے سایہ سے بھی یکدم ہی خوف آنے لگا۔ بمشکل اس نے اپنی ضرورت کا سامان نکالا تھا اور چھوٹے سے بیگ میں ڈالا تھا۔

''اور کچھ چاہیے۔'' اسفند کی آواز پر وہ جیسے چونک گئی۔ اُس کا پسینے میں شرابور چہرہ اسفند کی نگاہ سے اوجھل نہیں تھا۔ حریم نے نفی میں سر ہلایا۔

''او کے چلو......'' اس نے حریم کا ہاتھ تھاما دوسرے ہاتھ میں بیگ اٹھایا تھا۔ رستے میں اس نے حریم کی حالت کے پیش نظر اسے کولڈ ڈرنک پلائی تھی۔

''ناؤ ریلیکس پلیز...... تمہارے چہرے پر جو آثار ہیں اگر گھر جا کر بھی رہے تو سب کے سوالوں کی زد میں آجائیں گے ہم......''

''اور خاص کر میں...... درید نے تو میری بات پر یقین بھی نہیں کرنا۔ اس نے فوراً کہہ دینا ہے کہ میں نے تمہیں کچھ کہا ہوگا۔''

گھر پہنچے تو سب ہی سونے جا چکے تھے۔ درید لیونگ روم میں لیٹا تھا۔ حریم بیگ لے کر اندر چلی گئی۔

''تُو یہاں سوئے گا......؟'' وہ درید کے پاس آگیا۔

''تو کیا تمہارا حریم کو یہاں سلانے کا ارادہ ہے تاکہ ساری دنیا کے سامنے اپنا اور اس کا تماشا بنوا سکو۔''

درید نے پلٹ کر بولا تو اسفند کو گنگ کر گیا۔

''اگر تم میرے اچھے دوست ہو تو وہ مجھے بہنوں کی طرح عزیز ہے اسفند...... مجھے کم از کم اس طرح کے بی ہیویئر کی امید نہیں تھی۔''

''کیا کیا ہے میں نے؟''

''ایک شخص اپنی وائف کو دیکھ کر اتنا روڈ کیسے ہو سکتا ہے۔ حریم کی آنکھوں کے سارے خواب بکھر گئے ہوں گے۔'' وہ تو جیسے تلا ہی بیٹھا تھا کہ اسفند کو خوب سنائے گا۔

''فار گاڈ سیک درید میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے اُسے......''

''ابھی عصر کے بعد ہم یہاں پہنچے تھے۔ تم صبح بھی تو لے جا سکتے تھے اُسے...... کیا ہو جاتا اگر تمہاری ایک چھٹی ہو جاتی وہ بیوی ہے تمہاری اُس کا تم پر اتنا بھی حق نہیں ہے۔''

اندازہ تھا اسے کہ درید بھڑ کا بیٹھا ہوگا۔ سو وہ بھی موڈ آف کیے وہاں سے اٹھ کر کمرے میں آگیا جہاں حریم شاید اس کی منتظر بیٹھی تھی۔

''بیٹھی کیوں ہو...... سو جاؤ۔ سفر کی تھکن ہے...... ریسٹ کرو۔'' وہ نہیں چاہتا تھا کہ درید کے غصہ کا ذرا سا بھی تاثر حریم پر ہو سو بہت نارمل لہجے میں مخاطب ہوا تھا وہ۔

مگر شاید وہ اس کی جھجک نہیں سمجھ پایا تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ ان کا نکاح ہو چکا تھا۔ مگر یوں ایک روم میں سونا......

اسفند اسے کہہ کر چینج کر کے سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ اور اسے جانے کیسے آج نیند بھی جلدی آگئی تھی۔ مگر رات کے دوسرے پہر جب اس کی آنکھ کھلی تو بھک سے اُس کی ساری نیند اڑ گئی تھی۔

حریم نیچے چادر بچھا کر سوئی ہوئی تھی۔ وہ

یکدم اُٹھ بیٹھا تھا اسے جگانے لگا مگر پھر رُک گیا۔
اس کی نیند خراب ہونے کے خیال سے۔''
لیکن اس کے بعد وہ رات بھر سونہ سکا تھا۔

☆......☆......☆

''دو سال ہونے کو ہے ہمیں یہاں آئے انہوں نے پلٹ کر خبر نہ لی ہماری، پھر ہم کیسے جائیں کیا ضمانت ہے کہ وہ ہمیں ہاتھ پکڑ کر باہر نہیں نکالیں گے گھر سے۔'' بلال صبح صبح بول رہا تھا اسفند فجر کی نماز کے بعد لوٹا تو وہ درید کے ساتھ بیٹھا تھا۔
''اینی پرابلم......''
''اس کے بڑے بھائی کا فون آیا ہے۔ ان کے اباجی کی طبیعت خراب ہے اور انہوں نے ان تینوں کو بلایا ہے۔''
''رئیلی...... یہ تو اچھی بات ہے تمہیں جانا چاہیے۔''
کیا گارنٹی ہے اسفند کہ جمال بھائی نے جو کہا وہ سچ ہے۔ اباجی کبھی ہمیں نہیں بلا سکتے۔ جمال بھائی نے اپنے پاس سے آنے کا کہا ہوگا؟'' بلال کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔
''دیکھو بلال اگر جمال بھائی نے اپنے پاس سے بھی کہا ہے تو تمہیں جانا چاہیے۔ میں نے مانا کہ تمہارے اباجی نے غلط فیصلہ کیا تھا مگر وہ تمہارے بڑے ہیں۔ ان کا مان اُن کا وقار قائم رکھنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ ضروری ہے وہ بلائیں تب ہی تم جاؤ۔ وہ بیمار ہیں تمہیں یہ خبر مل گئی ہے۔ تمہارا فرض ہے اُن کی عیادت کے لیے جانا...... بے شک وہ ناراض بھی ہوں۔ مگر ان کے دل میں یہ خواہش ضرور ہوگی کہ ان کے بیٹے اُن سے ملنے آئیں۔'' اسفند نے بہت خلوص سے اُسے سمجھایا تھا۔

''اور اگر اب پھر انہوں نے ہمیں گھر سے باہر کھڑا کر دیا۔''
''سو واٹ...... تمہاری عزت تمہارے وقار میں کمی نہیں آئے گی بلال وہ بڑے ہیں...... ناراض ہوسکتے ہیں، لیکن تمہارا فرض ہے جانا۔''
''مجھے مریم کی فکر ہے کہیں وہ مریم کے ساتھ زیادتی نہ کریں۔''
''نہیں کریں گے کیونکہ اب وہ صرف ان کی بھتیجی نہیں ہے ان کی بہو ہے ان کے گھر اور بیٹے کی عزت ہے۔''
''نہال کو تو میں منالوں گا مگر طلال تو بہت ناراض ہے وہ کبھی نہیں مانے گا۔''
''میری گارنٹی ہے۔ وہ کچھ نہیں کہے گا۔ تم تیاری کرو۔'' بلال سر ہلا کر اُٹھ گیا تھا اور واقعی اسفند نے جانے کیسے منایا تھا طلال کو وہ خاموشی سے ان کے ساتھ جانے کو تیار بیٹھا تھا۔
''مجھے یقین ہے بلال کہ تم ہر حالات میں برداشت سے کام لوگے۔'' بلال سے گلے ملتے ہوئے وہ بولا تھا بلال نے مسکرا کے سر ہلایا۔
''اور طلال یہ ہی امید تم سے بھی ہے۔''
''آپ دعا کیجیے بگ بی...... اباجی ٹھیک ہوں۔'' اسفند نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے انشاء اللہ کہا تھا۔ اُن کو رخصت کر کے وہ دونوں لاؤنج میں ہی بیٹھ گئے تھے۔
''اب تک خفا ہے۔'' اسفند نے بڑے لاڈ سے پوچھا تھا۔
درید کو اس کی یہ خوبی بھاتی تھی کہ اس کا غصہ ہمیشہ وقتی ہوتا تھا۔
''کیا ملے گا تجھ سے خفا ہو کر......'' وہ بھی مسکرا دیا تھا۔

☆......☆......☆

صبح وہ اتنی جلدی میں گھر سے نکلا تھا کہ بھول گیا کہ حریم گھر پر اکیلی ہے اور وہ اب تک تنہا رہنے سے گھبراتی ہے۔ مگر لنچ ٹائم میں جیسے ہی خیال آیا وہ فوراً ہی گھر پہنچا کئی بار دروازہ ناک کرنے پر نہیں کھلا تو اپنے پاس موجود کی سے لاک کھول کر اندر آیا تھا لاؤنج میں سناٹا تھا۔

''حریم......'' اس نے آواز دی۔ مگر ایک کیا کئی بار پکارنے پر بھی کوئی رسپانس نہ پا کر اس کے دل میں انجانی سی فکر ابھری۔ وہ کمرے میں دیکھنے کے لیے آیا تھا اور حیران رہ گیا۔ وہ دیوار کے ساتھ کمرے کے کونے میں دبکی بیٹھی تھی۔ اور ہچکیوں سے اُس کا سارا وجود ہل رہا تھا۔

''حریم......'' اس نے پکارا تھا اور وہ یکدم چیخ مار کر اسے دیکھ کر اس سے لپٹ گئی تھی۔ اسفند کو شدت سے افسوس ہوا کہ وہ فراموش کیسے کر گیا۔ حالانکہ رات اپنے گھر جا کر اس کی حالت دیکھ چکا تھا۔ وہ اب تک مکمل طور پر اس حادثے کو نہیں بھولی تھی۔

اسفند نے اس کے گرد بازو پھیلا کر اس کو سمیٹ لیا۔

''بس حریم ریلیکس......!'' دھیرے دھیرے اس کا سر تھپک کر اس نے تسلی دی۔

''دیکھو تم تنہا نہیں ہو میں آ گیا ہوں ناں......'' اس نے حریم کو خود سے الگ کر کے اس کا چہرہ تھام کر کہا تھا۔ رو رو کر برا حال کر لیا تھا اس نے اُس کی سوجی آنکھیں اسفند کو مزید شرمندہ کر گئیں۔ اس نے حریم کو تھام کر بیڈ پر بٹھایا اسے پانی پلایا تھا۔ کچھ وقت گزرا تو وہ سنبھلی تھی۔

''بھول جاؤ حریم وہ جو بیت گیا......مت دو خود کو یہ تکلیف۔''

''وہ رات میری پوری زندگی پر محیط ہو گئی ہے۔ میں کیا کروں وہ خوف وہ وحشت میرے اندر سے نہیں نکلتی۔'' اب تک کسی معصوم بچے کی مانند سہمی ہوئی تھی وہ۔

''اللہ کی ذات پر یقین نہیں ہے تمہیں، اس پر ایمان کامل رکھو۔ صبر کرو وہ یقیناً ہمیں صبر عطا کرتا ہے۔ بھول جاؤ اسے اب تم تنہا نہیں ہو۔'' اسفند نے اس کے چہرے پر پھیلتے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔

''صرف اسی ذات پر تو یقین ہے جو اب تک سانسیں چل رہی تھیں۔ میں تو گناہ گار ہوں۔ یہ اس کا ہی تو کرم ہے کہ اس نے آپ جیسا مسیحا سونپا ہے مجھے۔ میں آپ جیسے نیک سچے انسان کے نام سے منسوب ہوں ورنہ میری کیا بساط ایک داغ دار ذات ہے جسے خود اپنے ہی وجود سے نفرت......'' اسفند نے اُس کے لبوں پر ہاتھ دھر دیا۔

''اگر میری سچائی کو سمجھتی ہو میری زبان پر اعتبار کرتی ہو تو سنو حریم فاطمہ میرے لیے تم کائنات کی تمام عورتوں سے زیادہ پاکیزہ......معصوم ہو تمہارا کردار اور تمہارا وقار اُجلا ہے۔ آئندہ اپنے لیے پھر ایسے لفظ استعمال نہ کرنا۔''

وہ حیران آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی جو اس کے قریب بیٹھا پہلی بار اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مخاطب تھا اس سے، اور اسے آج علم ہوا تھا کہ اس شخص کی آنکھیں کس قدر خوبصورت ہیں اور ان میں سچائیاں صاف جھلکتی نظر آتی ہیں۔ بے اختیار ہی اس کا دل زوروں سے دھڑکا تھا۔ اور یکدم وہ نگاہیں جھکا گئی اپنی بدلتی کیفیت سے وہ خود خائف ہوئی تھی اس نے دھیرے سے اسفند کا ہاتھ اپنے لبوں سے ہٹایا تھا اور خود بھی قدرے پیچھے کھسکی تھی۔ اسفند نے اس کی جھجک محسوس کر لی تھی تبھی اُٹھ کر سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کا مطلب وہ اب بالکل نارمل تھی۔ تبھی اسفند کی

قربت اُس کو پریشان کر رہی تھی۔
''اماں بی نہیں آئی تھیں۔'' اس کے سوال پر وہ ہونق سی دیکھنے لگی تو اس نے سر پیٹا۔
''ایک بار دروازہ ناک ہوا تھا مگر مجھ میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ باہر نکلتی۔'' سچائی سے اعتراف کیا۔
''اٹس او کے...... اچھا یہ بتاؤ لنچ میں کیا کھاؤ گی۔'' اندازہ تھا اسے کہ وہ کمرے سے نہیں نکلی تو اس نے کھایا کچھ نہیں ہوگا۔
''مجھے بھوک نہیں ہے۔''
''لگ جائے گی میرے ہاتھ سے بنا لنچ دیکھ کر خود بخود لگ جائے گی۔ آؤ تمہارے لیے لنچ بناتے ہیں۔''
''آپ نے کرلیا؟''
''اوں ہوں......'' تمہارا خیال آ گیا تھا سو فوراً گھر آ گیا۔ شرٹ کی آستین فولڈ کرتا ہوا وہ ایمانداری سے بولا تھا۔
''میں بنا لیتی ہوں آپ رہنے دیں۔''
''تم بھول رہی ہو کہ تم ہماری مہمان ہو۔'' وہ یقیناً اس کا موڈ اچھا کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھی مسکرا کے اس کے پیچھے کچن میں آ گئی تھی اور مہارت سے اس کے چلتے ہاتھ دیکھنے لگی۔
''آپ کو کوکنگ آتی ہے۔''
''تنہائی انسان کو سب کچھ سکھا دیتی ہے۔ میں نے زندگی اکیلے گزاری ہے حریم فاطمہ۔'' وہ مصروف انداز میں بتا رہا تھا۔ وہ لب بھینچے اسے دیکھ رہی تھی جانے کیوں اسے آج یہ شخص بہت پیارا لگ رہا تھا۔

☆......☆......☆

آج ورید جلدی آ گیا تھا۔'' تھکا تھکا سا، اس کے پاس صوفے پر آ کے گرا تھا جو نیوز پیپر دیکھ رہا تھا۔

''حریم کہاں ہے؟'' اس نے اِدھر اُدھر نگاہیں گھمائیں۔
''کچن میں چائے بنا رہی ہے۔ تھوڑا دھولے اپنا وہ چائے لے آئے گی۔''
''آج تھکن سی ہو رہی ہے یار......''
''خیریت......'' اس بار اسفند نے اخبار رکھ کر درید کو دیکھا تھا۔ وہ واقعی میں بہت نڈھال سا لگ رہا تھا۔
''جب حریم نے فیصل آباد میں ہی رہنا ہے تو یہاں جو اس کا گھر ہے، اس کا کیا کرنا ہے...... تم نے اُس سے اس ٹاپک پر بات کی۔'' درید نے پوچھا۔
''یار میں کیوں کروں وہ اس کے پیرنٹس کی نشانی ہے۔''
''مگر......''
''شی......'' درید کچھ کہہ رہا تھا کہ اس نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ حریم چائے بنا لائی تھی۔ اور ان دونوں کو سرو کر کے واپس کچن میں چلی گئی۔
''آج پھر اس کی طبیعت بگڑ گئی بمشکل خاموش کرایا تھا۔ صبح میں بھول گیا کہ وہ تنہا نہیں رہتی مجھے ویسے ہی یاد آیا میں گھر آ گیا اور یہاں آ کر دیکھا تو حریم کی بہت بری حالت تھی۔
''او گاڈ......''
''اب تو آ گیا ہے میں اسے لے کر ڈاکٹر کے پاس چلتا ہوں۔''
''ہاں تو اسے لے جا۔'' درید نے فکرمندی سے کہا۔ اسفند نے حریم کا چیک اپ کرایا تو ڈاکٹر نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔
''کوئی ایسی ناخوشگوار بات ہوئی ہے ان کی لائف میں جو ان کے ذہن میں چپک کر رہ گئی ہے اور جب تک کہ یہ خود اسے بھولنے کی کوشش نہیں

کریں گی۔ نارمل نہیں رہ سکتیں۔ پھر بھی انہیں خوش رکھنے کی کوشش کریں کیونکہ ان کا خوش رہنا ہی ان کی صحت کی ضمانت ہے۔''

''اگر واقعی آپ چاہتے ہیں کہ وہ سب میں بھول جاؤں تو آپ وہ گھر بیچ دیں کیونکہ جب تک اس گھر سے لنک رہے گا مجھے وہ رات نہیں بھول سکتی۔'' واپسی پر حریم نے اسفند سے کہا۔

''اسفند نے تعجب سے اُسے دیکھا۔ مگر وہ تو تمہارے والدین کی نشانی ہے پھر کیوں؟''

''میں مانتی ہوں میرے مما پپا کی نشانی ہے وہ...... میرا بچپن وہاں گزرا، میری ہر یاد اس گھر سے جڑی ہے۔ لیکن میری تمام خوش گوار یادوں پر وہ ایک رات محیط ہوگئی ہے۔ جو اسی گھر سے وابستہ ہے۔ وہاں قدم رکھتی ہوں میری روح لرز جاتی ہے بین کرنے لگتی ہے۔'' اس کے چہرے پر پھر وہی اذیت جھلکنے لگی۔

''او کے جیسے تم چاہو گی وہی ہوگا۔ لیکن ریلیکس ہو جاؤ......''

''مجھے واپس گھر بھیج دیں۔ میرا یہاں دل نہیں لگتا۔'' کتنی ہی دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولی تو اسفند سر ہلانے لگا۔ شاید ابھی یہاں رہنا اس کا مناسب نہیں تھا۔ آج دوپہر کی حالت کے بعد خود اسفند کو بھی یہی لگا تھا تب ہی وہ اگلے ہی دن اسے خود چھوڑ آیا تھا۔

واپس آیا تو طلال بھی آچکا تھا۔ بلال اور نہال ابھی وہیں تھے طلال بھی اپنے فائنل ایگزام کی وجہ سے آیا تھا۔ مگر اس میں بہت تبدیلی آگئی تھی۔ بہت سنجیدہ سا رہتا تھا۔

''نماز پڑھ کر اپنے ابا جی کے لیے دعا کیا کرو طلال...... انشاء اللہ وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔'' اس نے طلال کا سر تھپک کر کہا تھا اور اس نے مان بھی لی تھی اس کی بات، فجر میں وہ اسفند سے پہلے اُٹھ کر مسجد گیا تھا۔

''تھینک یو بگ بی...... بلیومی جس دن سے نماز باقاعدگی سے شروع کی دل کو بہت سکون ہے۔'' آج شام طلال نے اسے کہا تھا۔ اور کتنے حیرت کی بات تھی کہ اس کے دل کا سکون جانے کہاں کھو گیا تھا۔

امی نے اُسے فون کیا تھا۔ درید بتا رہا تھا۔

''اچھا'' وہ جیسے خیالوں میں بولا۔

''اسفند تم نے کیا صرف دنیا دکھاوے کے لیے اس کو اپنا نام دیا ہے۔ اسے صرف نام کی نہیں تمہاری توجہ اور محبت کی ضرورت ہے۔''

تم مسیحا بن کر اس کا ہر درد بانٹتے رہے پھر اب کیوں یہ گریز جب تمہارا ایمان ہے کہ ہر فیصلہ اللہ کی رضا سے ممکن ہے تو کیوں حریم کو دل سے اپنی بیوی نہیں تسلیم کر رہے ہو۔ درید بہت اُلجھا اُلجھا پوچھ رہا تھا۔

''یار تو کیوں نہیں مانتا میں نے پورے ہوش وحواس میں اس سے نکاح کیا ہے اللہ کی ذات کو حاضر ناظر مان کر وہ میری بیوی ہے میں پورے دل و دماغ سے یہ تسلیم کرتا ہوں۔'' اسفند نے یہ کہتے ہوئے اپنا سر صوفے کی پشت پر ٹکا دیا۔

''پھر وہ کیا چیز ہے جو اس کے اور تیرے درمیان حائل ہے۔'' آج تو جیسے درید سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔ یہاں وہ لاجواب ہو جاتا تھا۔

''یہی سوال تو وہ خود سے کر رہا تھا کہ اگر میں حریم کو اپنی تمام حقیقت بتا دوں کیا وہ قبول کر پائے گی اس سچ کو...... کہ جس دل میں صرف اُسے ہونا چاہیے وہاں کوئی اور تھا۔''

''وہ تمہارا ماضی تھا اور حریم تمہارا حال تمہارا مستقبل ہے۔ اگر واقعی تیرے دل میں اب کچھ

نہیں ہے تو......'' درید نے جملہ ادھورا چھوڑا۔
''درید انسان شاید پہلی محبت عمر بھر نہیں بھول سکتا۔''
''کیا کیجیے ان کا اسفند ضیاء جو خود بھولنا نہ چاہتے ہوں۔ کب تک فرار پا سکو گے اس حقیقت سے ایک معصوم لڑکی کی ذمہ داری قبول کی ہے تم نے وہ شرعی بیوی ہے تمہاری...... اس کے کچھ حقوق ہیں جو تم پر واجب ہیں۔ میرے نزدیک اگر اب بھی تم اپنے دل میں عینی کنول کی یادیں لیے بیٹھو گے تم خیانت کے مرتکب ہو گے۔ وہ تلخ ہونا نہیں چاہتا تھا مگر حریم اسے سگی بہنوں کی طرح عزیز تھی۔ اس کی وجہ سے اب اکثر وہ اسفند سے بحث کرتا تھا۔
اور پھر وہ اسفند سے خفا ہو گیا اور بہت سارے دن اِسی ناراضگی میں گزر گئے۔
آج وہ بہت دنوں کے بعد پھر قاری صاحب کے سامنے دوزانو بیٹھا تھا۔
''ایک بار پھر میری زندگی کٹھن موڑ پر ہے قاری صاحب، اور میری حالت ایسی ہے کہ میں خود کو کسی بھی فیصلے پر آمادہ نہیں کر پا رہا۔'' اور پھر وہ سب بتاتا چلا گیا۔
''کیا تمہیں اس پاک ذات پر یقین نہیں رہا۔ جو بے کل ہو، بے قرار ہو۔ اور اس کے کیے گئے فیصلے کو ماننے سے انکاری ہو۔''
''نہیں قاری صاحب اس پر ایمان تو پختہ ہے۔ دل اس پر بھی راضی ہے کہ یہ فیصلہ صرف اس کا ہے۔''
''پھر...... شکر ادا کرو اس رب کا جس نے تمہیں چنا ایک بے سہارا لڑکی کو سہارا دینے کے لیے۔ وہ رحیم ہے کریم ہے۔ بے شک وہ بہتر جانتا ہے تبھی تو اس نے تمہارا انتخاب کیا ہے۔''
''شکر گزار ہوں میں اُس رب کا جس نے مجھے اتنی توفیق دی۔ مگر قاری صاحب یہ بے کلی یہ بے سکونی کیا ہے۔''
''تم بھول گئے بچے کہ میں نے تمہیں کیا سمجھایا تھا۔ صبر کرو۔ اس پر جو تمہیں نہ ملا اور ہو سکتا ہے اس صبر سے اللہ پاک تمہارے لیے خیر کثیر پیدا فرما دے۔ یہ اس کی رضا تھی کہ تم اس شہر سے اُس شہر جا بسے یہ راستہ اُس نے تمہارے لیے منتخب کیا کیونکہ وہ جانتا تھا جو تمہارے لیے اچھا ہے۔ تم نہیں سمجھ سکتے نہیں جان سکتے اُس کی حکمت اُس کی مصلحت۔''
اُن کی باتیں اس کے دل کو یوں قرار دے رہی تھیں۔ جیسے پیاسی دھرتی کو بارش کی بوندیں قرار دیتی ہیں۔
''ایک نیک وفا شعار پرہیز گار بیوی عطا کی ہے اللہ پاک نے تمہیں۔ وہ رب تم سے خوش ہے تبھی اُس نے تم پر یہ کرم کیا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ جس کے لیے تم تڑپتے رہے وہ تمہارے قابل نہ تھی۔ اور اس نے تمہیں وہ عطا کیا جس کے تم قابل ہو جو تمہارے لیے نیک ہے۔ وہم میں نہ پڑو شکر بجا لاؤ اُس ذات کا آغاز کرو اپنی نئی اور خوشگوار زندگی کا......''
''میرے لیے دعا کیجیے گا قاری صاحب کہ میں حریم کو اس کے تمام حقوق دے سکوں اور خوش رکھ سکوں۔''
''انشاء اللہ تمہارا آنے والا وقت بہت اچھا ہے۔ اور میری نیک دعائیں تمہارے ساتھ ہیں ہمیشہ......''
آج اُس کے ذہن پر دھرا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا اور دل خود بخود ہی حریم کی طرف مڑ گیا۔ اس سے پہلی ملاقات سے آخری ملاقات کا سفر اُس کے ذہن میں تواتر سے آ رہا تھا۔
سچ کہتے ہیں قاری صاحب یہ رستہ اللہ نے چنا تھا اس کے لیے تبھی اس نے عینی کے دل میں

میری محبت نہ ڈالی کیونکہ عینی کو نہیں اس نے میرے لیے حریم کو منتخب کیا تھا۔ وہ میرا نصیب تھی پھر بھلا میں کیسے عینی کنول کو پا سکتا تھا۔ ہاں عینی نے انجانے میں سہی مجھے جو راہ دکھائی۔ میرے اللہ کی وہ ہی میری نجات ہے۔

''بے شک وہ خوش قسمت تھا کہ اللہ پاک نے اسے اپنی پسند اپنی رضا عطا کی۔ بے شک وہ انسان غلط تھا۔ وہ اپنے لیے وہ مانگ رہا تھا جو اس کے لیے بہتر نہیں تھا۔''

جانے حریم میرے بارے میں کن وسوسوں کا شکار ہوگی۔ وہ رات بھر سوچتا رہا کہیں حریم غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے کہ میں اس سے دور ہوں تو اس اذیت ناک واقعہ کے باعث، نہیں میرا اللہ گواہ ہے میرے ذہن و دل میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں حریم کے پاس جاؤں گا پورے دل کی خوشی اور آمادگی کے ساتھ اسے اپنی زندگی کا ہر سچ بتاؤں گا۔

کیونکہ آنے والی زندگی کا آغاز کرنے کے لیے اُسے تمام حقیقت بتانا ضروری ہے۔

وہ تو جانے کا مصمم ارادہ کیے بیٹھا تھا کہ اس ویک اینڈ پر امی میرے اور حریم خود ہی آ گئیں۔ ان کے یہاں آنے کے بعد اسے علم ہوا کہ درید نے انہیں بلایا ہے۔ چونکہ وہ تو اسفند سے خفا تھا۔ اس لیے اس کے سامنے ذکر نہیں کیا۔

''ویش گڈ...... چند دن اچھے گزر جائیں گے۔'' وہ خوش تھا اور اس کے چہرے پر پُرسکون مسکراہٹ نے درید کو دنگ کیا تھا حریم کو دیکھ کر اس پر کوفت نہیں چھائی تھی۔

بلکہ آج وہ عام دنوں سے زیادہ فریش تھا۔ اب جانے یہ ڈرامہ وہ امی کو دکھانے کے لیے کر رہا تھا یا......

''وہ تینوں بچے کہاں گئے۔''

''امی ان کے ابو کی طبیعت خراب ہے گاؤں چلے گئے ہیں۔''

''ہمیشہ کے لیے۔''

''ہاں شاید...... بلال تو جاب چھوڑ کر جا چکا ہے۔ طلال کا باہر جانے کا ارادہ ہے۔ رہا نہال...... تو مے بی وہ آ جائے۔'' درید نے تفصیل بتائی جو رات ہی بلال نے اسے فون پر بتائی تھی۔

''جہاں بھی رہیں خوش رہیں۔''

''آمین...... مگر یہ تو طے ہے کہ ہمیشہ اچھی یادوں میں رہیں گے۔'' اسفند نے کہا تھا۔

''اور میرب اسٹڈیز کا سناؤ۔''

''کیا سناؤں! آپ کی وائف تو یہاں سے جانے کے بعد انکار پر اڑ گئی کہ اس نے نہیں پڑھنا...... پھر میں بھی چپ کر گئی۔''

میرب نے بتایا تو وہ حیران نظروں سے حریم کو دیکھنے لگا جو سر جھکا گئی تھی۔

''وائے حریم؟'' اب وہ براہِ راست اس سے مخاطب تھا جس سے لفظ ادا کرنا مشکل ہو رہے تھے۔

''ہاں تو پڑھ لے گی آگے کچھ دن ٹھہر کے لے لے گی داخلہ......''

امی اس کی فیور میں بولی تھیں۔ اور موقع ملتے ہی امی اس سے سوال جواب کر رہی تھیں۔

''کیا مسئلہ ہے تمہارا...... نکاح کر کے عمر بھر یوں ہی رہنا ہے۔ کس بات کی سزا دے رہے ہو اسے۔''

''نہیں امی ایسا کچھ نہیں ہے یقین کریں اس ویک اینڈ پر میرا گھر جانے کا ارادہ پکا تھا۔''

''بس تمہارا ہر ہفتے یہ ہی بیان ہوتا ہے۔ دیکھو اسفند اس معصوم کے ساتھ جتنا کچھ بیت چکا ہے وہ ہی کم ہے کیا جو اسے مزید دکھ دے رہا ہے۔''

''امی میں نے کیا کہہ دیا......''

''تمہاری لاپروائی بے توجہی سے کیا اندازہ

لگائے گی وہ...... کہ تم نے احسان کر دیا اس پر......
اگر واقعی تو چاہتا ہے کہ حریم خوش رہے تو اسے اپنی توجہ دو، محبت دو تمہارے رویے سے جانے اس کے ذہن میں کیا کیا وہم آتے ہوں گے کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ خاموش رہنے لگی ہے۔ نکاح سے پہلے تو وہ ہنس بول بھی لیتی تھی۔''

''او کے آئی ایم سوری مگر یقین کریں اب آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔'' اُس نے امی کو یقین دلایا تھا۔

اب اسے حریم کو یقین دلانا تھا۔ اس کے وہموں کو دور کرنا تھا۔ اور یہ موقع اسے رات میں مل گیا۔

''کیوں پڑھنا نہیں چاہتی ہو تم آگے......''

''میرا دل نہیں چاہتا۔'' اس نے دھیرے سے سر جھکا کر کہا تھا۔

''مگر کیوں؟''

''میں نہیں چاہتی آگے پڑھنا۔''

''اور اگر میں کہوں کہ یہ میری خواہش ہے۔'' اس نے حریم کے چہرے پر نگاہیں فوکس کی تھیں۔

''آپ کا حکم تو مان سکتی ہوں۔''

''حریم میں نے حکم نہیں خواہش ظاہر کی ہے۔''

''میرے لیے آپ کی ہر بات حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ کیونکہ میرے نزدیک آپ عام انسان نہیں ہیں۔''

''خدا کے لیے مجھے عام انسان رہنے دو، اگر تمہارا یہی رویہ رہا تو......! ہمارے بیچ کے فاصلے نہیں ختم ہو سکتے۔''

''مگر میرے دل میں آپ کا جو مقام جو احترام ہے وہ مجھے اجازت نہیں دیتا کہ میں آپ کو عام انسان مانوں۔''

''میں اپنے اور تمہارے بیچ کے فاصلے مٹانا چاہتا ہوں حریم ضیاء۔ نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اکیلے رہ کر میں بھی تھک چکا ہوں اور تم بھی......''

وہ خاموش تھی بالکل چپ صرف اسفند بول رہا تھا۔

''مجھے اپنا نام دے کر جو احسان آپ نے کیا ہے وہ میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔''

''فار گاڈ سیک حریم تم میری بیوی ہو اور کوئی احسان نہیں کیا تم پر......''

''میں بالکل عام انسان ہوں تمہاری طرح سب کی طرح......'' اس کی جھنجلاہٹ پر حریم نے تعجب سے دیکھا تھا۔

''میں تو بہت گنہگار انسان ہوں حریم...... ایک عمر لاعلمی میں گزاری۔ اب اگر اس پاک ذات نے ہدایت دی۔ اپنی محبت اس دل میں ڈالی ہے تو اپنے تمام پچھلے گناہوں کی ان کوتاہیوں کی جو جانے انجانے میں ہوئیں ان کی معافی طلب کرتا ہوں۔ تم پلیز مجھے میری ہی نظروں میں شرمندہ مت کرو۔'' وہ آزردہ سا ہو گیا۔

''جتنا میں آپ کو جان سکتی ہوں آپ بہت اچھے نیک انسان ہیں۔''

''تم مجھے جانتی ہی کتنا ہو حریم، کچھ بھی تو نہیں جانتیں تم میرے بارے میں مگر میں آج تم سے اپنی ہر حقیقت شیئر کرنا چاہتا ہوں تاکہ تمہیں آنے والی زندگی کے بارے میں فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔'' اس نے پوری سچائی سے کہا تھا اور حریم کو اپنے بارے میں ہر ہر بات بتا دی۔

اس کی تمام عمر جس طرح گزری جس ماحول میں گزری۔ اور وہ شدت بھی جس کی انتہاؤں پر جا کر اس نے عینی کنول سے محبت کی تھی۔

''وہ مجھے زندگی کا سب سے بڑا دکھ دے کر بھی مجھ پر احسان کر گئی۔ مجھے میرے رب کے قریب کر گئی۔ جس ذات، اُس کی سچائیوں سے

میں لاعلم تھا۔ پھر انسان کی محبت میں ڈوب کر جب میں اس رب کے آگے جھکا دل کا سکون مانگا تو مجھے علم ہوا کہ یہ محبت تو دھوکہ ہے، محبت تو وہ ہے جو اس کی ذات سے کی جائے بس وہ ہی حقیقت ہے باقی سب فانی ہے، فریب ہے۔'' اُس کی نگاہوں کی نمی میں سچائیاں جھلک رہی تھیں۔

''بہت غلیظ زندگی گزار رہا تھا میں، غم کو دور کرنے کے لیے حرام چیز کا سہارا لیتا تھا۔ مجھے لگتا تھا شراب میں سکون ہے۔ مگر میں غلط تھا حریم سکون صرف اس کے سامنے جھکنے میں اسے واحد ماننے میں ہے۔''

جب مجھے اس سچ کا ادارک ہوا تو میں نے اپنی زندگی کا ہر فیصلہ اس کے سپرد کر دیا اور مطمئن ہو گیا۔ اور تم...... اسی کی رضا ہو، اسی کی مرضی سے میری زندگی میں شامل ہو۔

وہ دنگ نظروں سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ جس کے تاثرات الفاظ کے ساتھ بدل رہے تھے۔ مگر ماضی میں جا کر اس کے چہرے پر جو کرب نمایاں تھا وہ حریم کو بھی دکھی کر گیا۔

''تمہیں یہ سب بتانے کا مقصد صرف اتنا ہے تم اپنی زندگی کا فیصلہ آسانی سے کر سکو' میرا ماضی جاننے کے بعد تمہارے ذہن میں کئی سوال ابھرے ہوں گے۔ مگر میرے پاس تمہارے کس سوال کا جواب نہیں۔ میری ذات میرا سچ سب تم پر عیاں ہے۔ اب فیصلہ تم نے کرنا ہے۔''

''حد ہو گئی یار میں پریشان ہو گیا کہ آخر تم دونوں کہاں چلے گئے۔'' سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتے ہی درید نے کہا تھا اور حریم کے دل کی باتیں...... من میں ہی رہ گئیں تھیں۔

☆......☆......☆

''تمہارا گھر سیل ہو گیا ہے بس کچھ کاغذات پر تمہارے سائن چاہیں۔'' اگلے دن وہ سب کے ساتھ بیٹھا اسے بتا رہا تھا۔

''کیوں گھر کیوں بیچا، اب تمہارے رشتہ دار پھر سے پیچھے لگ جائیں گے۔'' امی بولیں تو اس نے پلٹ کر اسفند ضیاء کا چہرہ دیکھا کہ اب کیا کہیں۔

''امی اسی مسئلے کو حل کرنے کے لیے تو گھر بیچ رہے ہیں۔ ان کو ان کے حصے کی رقم دے دیں گے۔ اور اس طرح حریم بھی پُرسکون اور بااعتماد زندگی گزارے گی۔''

''یوں بھی حریم نے رہنا تو فیصل آباد میں ہے۔'' درید بولا تو لمحہ بھر کو اس کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں لہرائیں تھیں۔

''امی میں چاہتا ہوں کہ حریم یہیں رہے میرے ساتھ، ایک تو ہمیں گھر سنبھالنے کے لیے گھر میں خاتون کی اشد ضرورت ہے کیونکہ بلال تو جا چکا اور میں یا درید...... ہم گھر نہیں سنبھال سکتے۔ دوسرا میں حریم کو یہیں یونیورسٹی میں ایڈمیشن دلوانا چاہتا ہوں۔'' اس کے فیصلے پر درید اور امی بہت خوش تھے۔ کیونکہ ان کی بھی یہ ہی خواہش تھی کہ وہ دونوں ساتھ رہیں۔

''میرب اگر تم بھی ایم ایڈ کرنا چاہتی ہو یہیں ایڈمیشن لے لو۔'' وہ اب میرب سے مخاطب تھا۔ جو یکدم سر جھکا گئی۔ وہ اسفند کو کیا بتاتی اس نے کیوں ترک کر دیا ہے یہ ارادہ۔''

''بس اسفند بھائی پڑھ لیا...... جتنا پڑھنا تھا۔'' اس کے انداز میں جھجک تھی اور اس کا راز تب کھلا جب درید نے تنہائی میں اسے بتایا تھا کہ وہ پاپا بننے جا رہا ہے۔

''ارے یار تجھے بہت مبارک ہو۔'' وہ خوشی سے چیخا۔ درید بھی مسکرا دیا۔

''مجھے بھی موقع دے یار اس طرح خوش

ہونے کا۔'' درید بولا تو وہ سمجھ نہ سکا تھا۔ مگر جب درید کے چہرے پر کمینی سی ہنسی دیکھی تو اسے اس کی بات کا مطلب بھی سمجھ آ گیا اور اس نے زور دار مکہ اس کے پیٹ میں مارا۔

''بے شرم بے حیا انسان۔''

''ایویں...... میرا حق نہیں کوئی مجھے چاچو کہے۔''

''یاسر ہے ناں، یہ فرمائشی پروگرام وہاں چلا دے۔'' وہ اسے بری طرح لتاڑ کر آگے بڑھ گیا تھا۔

''حریم اگر یہاں رہنا چاہتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے اسفند مگر میں ابھی یہاں اسے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی اسے۔ میں نے اسے بیٹی کہا ہے اور اپنی بیٹی کی رخصتی میں اپنے گھر سے کروں گی۔''

''اور میں آپ کا بیٹا نہیں۔'' اسفند نے دکھی ہونے کی ایکٹنگ کی۔

''ہے ناں اسی لیے تو خواہش ہے کہ تیرا ولیمہ دھوم دھام سے کروں۔'' انہوں نے اس کا مان بھی نہیں توڑا تھا۔

سو فیصلہ ہو گیا وہ سب فیصل آباد جا رہے تھے تاکہ حریم کی رخصتی کر سکیں۔ مگر وہ حریم کے منہ سے ایک بار اس سوال کا جواب چاہتا تھا۔ جو اس نے اس پر چھوڑ رکھا تھا مگر ایسا ہو نہ سکا۔

فیصل آباد آ کر محض دو دن بعد کی تقریب رکھی تھی امی نے اسفند کی خواہش پر سادہ سی تھی تقریب مگر پھر بھی سب نے اچھے سے مزہ کیا تھا۔ اور امی نے حریم کو دلہن کے روپ میں سجا کر اس کے کمرے میں منتقل کر دیا تھا۔

''تو خوش ہے ناں اسفند کوئی ملال کوئی گزرے وقت کی یاد......'' درید نے پوچھا۔

''میری آنکھیں پڑھنے کا ہنر آتا ہے ناں پڑھ لے۔'' اسفند اسے لاجواب کر گیا کیونکہ سنہرے چمکتے کانچ میں صرف خوشی اور اطمینان جھلک رہا تھا۔ درید عباس نے گلے لگا کر اسے وش کیا تھا۔

کمرے میں داخل ہونے کے بعد وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ کنفیوز تھے۔ مگر پھر بھی اسفند مضبوطی سے قدم اٹھاتا اس کے قریب آیا تھا۔ اور بہت دلچسپی اور غور سے اس نے حریم کا سجا سنورا سراپا دیکھا تھا۔

''مجھے تم سے اپنے سوال کا جواب اب بھی درکار ہے۔'' اس کے سوال پر حریم ساری جھجک فراموش کر کے اسے دیکھنے لگی۔

''مجھے آپ کے ماضی سے کوئی سروکار نہیں کیونکہ وہ گزر چکا ہے میرا مستقبل آپ سے وابستہ ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ میرا مستقبل بہت مضبوط ہے۔''

''اتنے دن سولی پر ٹانگ کر رکھا یہی بات پہلے نہیں کہہ سکتی تھیں۔'' اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں شکوہ کیا۔

''آئی ایم سوری!''

''آج بھی؟''

''تم میرا نام کیوں نہیں لیتیں؟'' اس بار وہ سنجیدہ ہو گیا تھا اور بھرپور خفگی سے اُسے دیکھا جو گردن جھکا گئی۔

''مجھے مجبور مت کریں میں آپ کا نام نہیں لے سکتی۔'' اس کے لفظوں میں جو احترام تھا۔ اسفند کو دنگ کر گیا۔

''گویا تم اپنے اور میرے درمیان کے تعلق کو یوں ہی رکھنا چاہتی ہو۔ فاصلے قائم رکھنا چاہتی ہو۔''

''میں آپ جیسے اعلیٰ صفات رکھنے والے انسان کے قابل ہی کب ہوں مجھ میں جو عیب ہے جو داغ ہے وہ لاکھ دنیا سے چھپا لوں مگر آپ کے سامنے تو اپنی ذات بہت چھوٹی اور بدنما محسوس

ہوتی ہے۔'' جھلمل کرتی آنکھیں اسفند پر سکتہ طاری کر گئیں۔ وہ کیا کیا سوچتی تھی کن وسوسوں میں گھری تھی۔

''تم ایسا سوچتی ہو حریم......''

''غلط کیا ہے، میں نہیں ہوں آپ کے قابل......''

''تم کس قابل ہو یہ میرے دل میں جھانک کر دیکھو حریم ضیاء......'' وہ جب اس کے نام کے ساتھ اپنا نام جوڑتا تھا حریم کو اپنا نام بہت پُر وقار لگتا تھا۔

''یہ احسان کم ہے کہ نام دیا ہے اپنا مجھے آپ نے، میں عمر گزار سکتی ہوں آپ کے نام کے ساتھ مگر یہ سچ ہے کہ میں خود کو آپ کی محبت آپ کی قربت کے لائق نہیں سمجھتی۔''

اس کی باتیں اسفند ضیاء کی کشادہ پیشانی پر کئی شکنیں نمودار کر گئیں اس کے چہرے پر جو تاثرات آئے تھے لمحہ بھر میں ڈری گئی تھی۔

''قابل تو میں بھی نہیں تمہارے، کیونکہ جو تمہارے ساتھ ہوا وہ تمہارا ماضی ہے اور میرا ماضی بھی کوئی اچھا نہیں رہا حریم فاطمہ...... اور سب سے بڑی بات...... جو تم پر بیتی اس میں تم پر صرف ظلم ہوا جبر کیا تمہاری مرضی تمہاری رضا نہیں تھی۔

مگر میرے ماضی میں میں نے جو بھی کیا اپنی مرضی سے کیا۔

میں نے عینی کنول کے ساتھ محبت میں ڈوب کر بہت قربت کے لمحے گزارے ہیں۔ وہ بھی میرے لیے غیر محرم تھی۔ مجھے اس وقت یہ احساس نہیں تھا۔

اس کا تلخ لہجہ حریم کو رُلا گیا۔

''مجھے میرے رب کے سامنے سرخرو ہونا ہے حریم تمہیں میں نے بے شک اُس کی رضا سے پایا ہے مگر اس میں میری مرضی بھی شامل ہے۔''

اس نے روتی ہوئی حریم کا چہرہ مضبوط ہاتھوں میں تھام کر کہا تھا۔

''اپنے دل سے یہ وہم نکال دو حریم پلیز...... تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میرے دل میں تمہارا مقام بہت اونچا ہے۔ میری نظر میں تم دنیا کی ہر عورت سے زیادہ پاکیزہ اور معصوم ہو۔ بخدا میرے لیے تم انمول موتی ہے جو قدرت نے مجھے میری کسی نیکی کی صورت عطا کیا ہے۔''

''پھر آپ کا خشک رویہ۔'' اس کے لب تھرتھرائے اور اسفند ضیاء سخت شرمندہ ہوا تھا بس یہ ہی خوف تھا اسے۔

''میرے دل کی بے چینی کو اتنا غلط نام نہ دو حریم۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ تمہیں سب بتاؤں یا نہیں...... مگر میرا اللہ گواہ ہے کہ تمہارے لیے میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

بلکہ میں تو شکر گزار ہوں اس رب کا جس نے مجھے تم جیسی معصوم اور نیک شریکِ حیات عطا کی۔

''آپ سچ کہہ رہے ہیں ناں...... کیا واقعی آپ کے نزدیک میں پاکیزہ ہوں۔'' ڈبڈباتی آنکھیں جب سنہرے کانچ سے ٹکرائیں تو لمحہ بھر کو جیسے کائنات تھم سی گئی تھی۔

''کیسے ثابت کروں کہ تمہیں یقین آ جائے۔'' بوجھل سا لہجہ تھا۔ حریم کی دھڑکنیں ساکت ہو گئیں۔

''میری آنکھیں ہمیشہ میرے دل کی سچائیاں بیان کرتی ہیں کیا تمہیں میری آنکھوں میں سچ نظر نہیں آتا حریم۔''

اسفند ضیاء نے اب بھی اس کا چہرہ تھام رکھا تھا اور وہ پوری توجہ سے حریم کی پانیوں سے بھری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

بھلا وہ کہہ سکتی تھی کہ اس میں اتنی ہمت کہاں

کہ ان کی آنکھوں میں دیکھ سکے۔ وہ کبھی بھی اُس کی نگاہوں میں لمحہ بھر بھی نہیں دیکھ پاتی تھی۔ کیونکہ ان آنکھوں میں وہ کشش تھی جو اس جہاں کی تمام خوبصورتی میں بھی نہیں تھی۔

اللہ پاک کی قدرت کا سب سے انمول گفٹ تھیں وہ آنکھیں جن میں بس اک پل کو وہ دیکھ سکتی تھی مگر سنہرے کانچ میں شفاف چمکتا اپنا ہی چہرہ نظر آیا تھا۔

''آئی ایم سوری میں نے آپ کو غلط سمجھا۔''

''آپ میرے استاد ہی ہیں جنہوں نے زندگی کی تمام تلخیوں کو سہہ کر مجھے جینے کا ہنر سکھایا۔ ورنہ میں تو مایوسی کے اندھیروں میں ڈوب چکی تھی۔

''یہ اعتماد صرف آپ نے دیا ہے۔ میرے دل میں تمام دنیا کے لیے خوف اور نفرت تھی مگر مجھے محبت کرنا آپ نے سکھائی ہے۔''

''محبت کرتی ہوناں مجھ سے۔'' اسفند نے سرشار سے لہجے میں پوچھا اور حریم کی جان پر بن آگئی۔ کیسے اقرار کرے کیسے بیان کرے کہ روز اول سے اُس کی محبت دل کے نقش پر روشن ہے مگر شاید وہ لاعلم تھی۔

لیکن نکاح کے بعد اس پر آگہی ہوئی تھی کہ یہ شخص محض مسیحا نہیں ہے یہ تو اس کی رگ و جان میں بسا ہوا ہے۔

اس کی سانسیں بھی صرف اس کا نام پکارتی ہیں۔

''بس کرو دو جان چکا ہوں کتنی محبت ہے تمہیں مجھ سے۔''

''تمہاری آنکھوں میں تمہارے دل کی داستان رقم ہے حریم ضیاء جو باآسانی پڑھ لی ہے میں نے۔''

اور وہ فوراً ہی نگاہیں جھکا گئی لرزتی پلکیں چہرے پر کھلتا حجاب اور یاقوتی لبوں کی تھرتھراہٹ اسفند ضیاء کو مدہوش سا کر گئیں اور اس نے حریم کو اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔

''اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔'' اس کے لہجے میں شوخی تھی۔ حریم جیسے خود میں سمٹنے لگی۔

''بولوناں حریم ضیاء کیسے اعتبار کرو گی۔''

''خود سے زیادہ اعتبار ہے مجھے آپ پر...... اور......!''

''اور......!'' اسفند نے ادھورہ جملہ دہرایا۔

''آپ کی محبت پر......'' اس کے لہجے میں حیا تھی مگر اس نے لمحہ نہیں لگایا تھا بات مکمل کرنے میں۔''

''بس یہ ہی یقین درکار تھا مجھے' زندگی کے اِس نئے سفر کو شروع کرنے سے پہلے، جو تم نے مجھے دیا ہے۔'' اس نے حریم کا نازک وجود دونوں بانہوں میں سمیٹ کر اس کے بالوں پر لب رکھ دیے تھے۔

شکر گزار تھا وہ اس خالق کائنات کا جس نے اسے یہ انمول موتی عطا ورنہ شاید وہ کبھی اپنے لیے ایسا جیون ساتھی تلاش نہ کر پاتا۔ جس کی نگاہوں میں پاکیزگی اور حیا تھی۔

وہ اسی حیا کی تلاش میں بھٹک رہا تھا اور جانے کب تک بھٹکتا کہ اس کے رب کو اس پر رحم آ گیا۔

''بے شک انسان بے صبرا ہے وہ نہیں سمجھ پاتا کہ اس کا رب اس کے لیے کیا سوچتا ہے۔ وہ ہمیں وہ عطا کرتا ہے جو اس کی چاہت ہو اس کی پسند ہو اور کیا...... اس سے بڑھ کر کچھ ہے کہ وہ پاک ذات ہم سے خوش ہے۔

اس رب کو راضی کرنا ہی انسان کی سب سے بڑی عبادت ہے۔ بے شک وہ اب ہم سے راضی ہو گیا تو ہم نے دونوں جہاں پا لیے۔

☆☆......☆☆

افسانہ

بس اسی لمحے جیسے اس نے خود ہی اپنے مکمل جہاں کو نظر لگا دی۔ موبائل پر آئی ایک کال نے جیسے ایک کالا ناگ بن کر ان کی خوشیوں کو نگل لیا۔ آمنہ اور ربابہ جس کار پر آ رہی تھیں۔ اسے ایک تیز رفتار ٹرالر نے اس بری طرح روند ڈالا کہ وہ دونوں موقع پر......

بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر جب وہ باہر نکلی تو عازم گاڑی سے ٹیک لگائے بڑی بے چینی سے اس کا منتظر تھا۔

''واؤ'' اسے دیکھتے ہی عازم نے سیٹی بجانے والے انداز میں ہونٹ سیکڑ کر اسے اتنی وارفتگی سے دیکھا کہ شادی کے دس سال گزر جانے کے باوجود بھی حیا کے ڈھیر سارے رنگ اس کے خوب صورت چہرے کو مزید دلکش بنا گئے۔

''یار آج تو تم پہچانی ہی نہیں جا رہی۔ بیوٹی پارلر والوں نے تمہیں کیا سے کیا بنا دیا۔''

وہ آنکھوں میں ڈھیر ساری شرارت سموئے اسے چھیڑنے والے انداز میں بولا تو نمرہ ایک دم ہی اپنے پرانے جون میں لوٹ آئی۔

''اگر تعریف کرنی نہیں آتی تو خاموش ہی ہو جایا کریں۔ بلاوجہ ہی اپنی بے تکی زبان کو تکلیف دیتے رہتے ہیں۔'' وہ تنتناتی ہوئی کار میں آ کر بیٹھ گئی تو عازم بھی ہنستا ہوا کار اسٹارٹ کرنے لگا۔

''جانِ عازم! تم واقعی آج غضب ڈھا رہی ہو۔ ایمان سے، تم شادی والے دن بھی دلہن بن کر اتنی خوبصورت نہیں لگی تھیں جتنی حسین آج لگ رہی ہو اور اس پر ستم تمہارا یہ غصیلا روپ اور مارے ڈال رہا ہے۔'' کار چلاتے ہوئے اس نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے اتنی بھرپور نگاہوں سے دیکھا کہ نمرہ ایک بار پھر اپنے دھڑکتے دل کو سنبھالنے کی کوشش میں بے حال ہی ہو گئی۔

کمال ہے بھئی، کیا ایک مرد کے لفظوں میں اس کے اظہار میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ شادی کے اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی وہ ایک عورت کو دوبارہ نئی نویلی دلہن کے روپ بخش دینے پر قادر ہو جاتا ہے۔ اس نے بڑی حیرانی سے سوچا۔

آج عازم کی فرمائش پر اپنی دسویں اینورسری پر اس نے سفید چوڑی دار پاجامہ اور کامدانی کے سفید کرتے اور دوپٹے کے ساتھ چاندی کا بہت

خوبصورت سیٹ پہنا تھا۔ مہنگے ترین بیوٹی پارلر نے اس کے حسن کو دو چند کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ لمبے بالوں کی موٹی سی چوٹی کے ہر بل پر چنبیلی کے پھول لپٹے ہوئے تھے۔ اس کے اتنے متناسب جسم اور معصوم چہرے کو دیکھ کر کوئی کسی طور اس بات پر یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ تین بچوں کی ماں ہے۔ بیوٹی پارلر میں موجود عورتوں نے بھی اس پر بے حد حیرانی کا اظہار کیا۔

''آپ کو دیکھ کر میں یہ سمجھی تھی کہ شاید آپ اپنی منگنی کا میک اپ کروانے آئی ہیں۔'' ایک خاتون جو اپنے بال سیٹ کروانے آئی ہوئی تھیں، اسے بے حد رشک سے دیکھتے ہوئے بولی تھیں۔

اس دن وہ صحیح معنوں میں بیوٹی پارلر کی ہیروئن بنی ہوئی تھی کہ ہر نگاہ کی مرکز وہی تو بنی ہوئی تھی لیکن اس وقت عازم کی والہانہ نظریں، اس کے وارفتہ جملے اسے سب کچھ بھلا کر جیسے کسی نئی دنیا میں لے

جا رہے تھے۔ ہزاروں نگاہوں کی مرکز بننے والی اس لڑکی کے سامنے ساری تعریفیں اس کے شوہر کے چند خوبصورت جملوں اور توصیفی نگاہوں کے سامنے بالکل ہیچ تھیں۔

آج ان دونوں نے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں اپنے عزیزوں اور دوست اقارب کو اینورسری کے سلسلے میں ایک شاندار ڈنر پرائوٹ کیا ہوا تھا اور یہ سب تیاری اسی سلسلے میں تھی۔ عازم خود بھی بلیک ڈنر سوٹ میں کچھ زیادہ ہی جچ رہا تھا۔ نمرہ کو اپنے اوپر جی بھر کر رشک آیا۔ اتنا چاہنے والا وجیہہ شوہر' خوبصورت ترین گھر' نوکر چاکر' شاندار اسٹیٹس' تین خوب صورت بچے' فاران' جبران اور رمشا۔ بھلا کس چیز کی کمی تھی اس کے پاس۔ سسرال میں صرف ایک ساس ہی تھیں۔

عازم اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ باپ کا انتقال کافی عرصے قبل ہوگیا تھا لیکن وہ اپنے پیچھے بے شمار جائیداد چھوڑ گئے تھے اس لیے عازم اور اس کی ماں کو سوائے ان کی کمی کے کبھی کسی اور پریشانی کا احساس نہیں ہوا۔ عازم نے ایم بی اے کرنے کے بعد اپنے ڈیڈی کا بزنس ایک بار پھر...... شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ آمنہ فرید کو اپنے ہونہار بیٹے پر بے پناہ فخر محسوس ہوتا تھا۔ عازم کی شادی انہوں نے بہت دھوم دھام سے اپنے بے حد قریبی دوست ربابہ کی بیٹی سے کی تھی حالانکہ اس رشتے پر سارے ہی عزیز واقارب نے بہت باتیں بنائی تھیں۔ بڑی ناگواری کا اظہار کیا تھا کہ بھلا اپنے خاندان میں کتنی اچھی اور پیاری لڑکیوں کے ہوتے ہوئے انہیں غیروں کے یہاں سے لڑکی لانے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن آمنہ کو بچپن سے ہی نمرہ بے حد اچھی لگتی تھی۔ نمرہ

بھی اپنی آمنہ آنٹی سے کافی اٹیچ تھی۔ عازم بھی اپنے بے شمار کزنز کے ہوتے ہوئے بھی بچپن سے ہی نمرہ اور اس کے بہن بھائیوں سے زیادہ کلوز تھا۔ ربابہ اور آمنہ کی اسکول کے زمانے سے ہی دانت کاٹے کی دوستی چلی آرہی تھی۔ آمنہ اپنا ہر دکھ' ہر راز اور پریشانی ربابہ سے ہی شیئر کیا کرتی تھیں۔ ربابہ ان کے لیے سگے رشتوں سے بڑھ کر تھیں۔ سچی اور بے لوث محبت خونی رشتوں سے مشروط نہیں ہوتی۔ یہ بات ربابہ کی دوستی نے انہیں اچھی طرح سے سمجھا دی تھی۔

شوہر کے انتقال کے بعد سگی بڑی بہن سے زیادہ ربابہ کی دل جوئی اور اس کے ساتھ نے آمنہ کے دل کو بڑی تقویت بخشی تھی رمنا (بہن) کی غیریت اور بیگانگی نے ان کے دل کو بہت ٹھیس پہنچائی تھی۔ دونوں بھائی باہر تھے، ایک شارجہ اور ایک امریکا میں سیٹل تھا۔ دونوں ہی اپنی اپنی دنیا میں مگن تھے۔ بہن کو مہینے میں ایک بار فون کرکے جیسے اپنا فرض نبھا دیتے تھے۔ ابا بوڑھے اور کمزور تھے' اماں بھی دس بیماریوں کو جھیل کر زندگی بتا رہی تھیں۔ فرید کے انتقال کے بعد تنہائیوں اور ویرانیوں کے اس طوفان میں وہ ایک تنکے کی طرح بہہ جاتیں اگر ربابہ کا مہربان ساتھ نہ ہوتا۔ رمنا تو اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ کچھ اتنا بزی ہوتی کہ ہفتوں بہن سے ملاقات ہی نہ ہو پاتی۔ اماں اور ابا اکثر ان کے پاس رہنے کو آجاتے تھے۔ ماں باپ کی محبتوں کے گھنے سائے میں آمنہ کے جلتے ہوئے دل کو کافی ٹھنڈک مل جاتی تھی پھر ان کا فرماں بردار چاہنے والا بیٹا بھی تو ان کے کاندھوں کو تھامے ہوئے تھا اور اب جبکہ وہ اپنی پڑھائی مکمل کرکے ایک کامیاب بزنس مین بن چکا تھا اور آمنہ نے اس کی آنکھوں

میں نمرہ کا عکس بھی بہت واضح طور پر محسوس کر لیا تھا تب بھلا وہ کیوں اپنی آرزو اور عازم کی پسند کو رشتے داروں کی بھینٹ چڑھا دیتیں۔ سو وہ بڑے ہی دھوم دھام سے نمرہ کو اپنی بہو بنا کر لے آئیں۔

روایتی ساس بہو کا رشتہ کبھی بھی ان کے درمیان نہیں آیا تھا۔ ایک خوبصورت اور مثالی خاندان تھا ان کا جہاں وہ اپنے بیٹے بہو اور پوتوں و پوتی کے ساتھ ایک بے حد خوشگوار زندگی گزار رہی تھیں۔ نمرہ کو بھی ان سے بہت ڈھارس رہتی تھی۔ ساس اگر ماں کا روپ بن جائے تو بہو اسے بیٹی سے بھی زیادہ پیاری ہو جاتی ہے اور بہو اگر بیٹی کا پرتو بن جائے تو ساس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے شوہر کے دل کے سنگھاسن پر بھی رانی بن کر براجمان ہو جاتی ہے، جیسا کہ نمرہ کے ساتھ ہوا تھا۔ عازم کو وہ اور بھی زیادہ پیاری ہو گئی تھی۔ اپنی ماں کے چہرے پر کھلتی خوشی اور طمانیت کو محسوس کر کے اسے جو خوشی محسوس ہوتی تھی، اس کا سارا کریڈٹ وہ نمرہ کو دیتا تھا۔ ورنہ اپنے ہی خاندان میں اس نے اس رشتے کے حوالے سے بہت سے ایسے قصے دیکھے تھے جس نے اسے شادی سے ہی خوفزدہ کر دیا تھا لیکن نمرہ اور آمنہ کے خوشگوار تعلقات نے اس کے ہر خوف اور وسوسے کو بالکل زائل کر دیا تھا۔

آج ان دونوں کی دسویں ویڈنگ اینورسری پر آمنہ نے ایک خصوصی گولڈ کا سیٹ نمرہ کے لیے بنوایا تھا۔ یہ سرپرائز گفٹ وہ اچانک ہی نمرہ کو دینا چاہتی تھیں۔ اس لیے ربابہ کے ساتھ جیولر کی دکان کے چکر نمرہ سے چھپا کر لگاتی رہی تھیں اور اس وقت بھی انہوں نے عازم سے کہہ دیا تھا کہ وہ پارلر سے نمرہ کو لے کر سیدھا ہوٹل پہنچے، وہ ربابہ کے ساتھ ڈائریکٹ پہنچ جائیں گی۔

اس وقت ہوٹل کے جگمگاتے ہوئے خوب صورت بینکوئٹ ہال میں نمرہ اور عازم کا پرفیکٹ کپل ہر ایک نگاہ کو جیسے خیرہ کیے دے رہا تھا۔ رشک اور حسد کی ملی جلی نگاہیں ان کے اوپر سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ خوشی سے چمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ نمرہ کو اسی لمحے بے اختیار ایک شعر یاد آ گیا۔

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمیں تو کہیں آسماں نہیں ملتا

کاش وہ اس شاعر کو بتلا سکتی کہ اس کا خیال کتنا غلط ہے۔ کبھی کبھی کسی کو مکمل جہاں مل بھی جاتا ہے۔

''آؤ دیکھو، میری دنیا کتنی مکمل ہے۔ معمولی سی بھی کمی نہیں ہے اس میں۔ بس صرف اللہ کا شکر ہی ادا کرنا ہوتا ہے سو وہ میں کر رہی ہوں۔''

اور...... اور جس وقت وہ یہ سب سوچ رہی تھی، بس اسی لمحے جیسے اس نے خود ہی اپنے مکمل جہاں کو نظر لگا دی۔ موبائل پر آئی ایک کال نے جیسے ایک کالا ناگ بن کر ان کی خوشیوں کو نگل لیا۔ آمنہ اور ربابہ جس کار پر آ رہی تھیں۔ اسے ایک تیز رفتار ٹرالر نے اس بری طرح روند ڈالا کہ وہ دونوں موقع پر ہی ختم ہو گئیں۔ ڈرائیور بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ حیرت انگیز طور پر نمرہ کا پاک بھائی جوان دونوں کے ساتھ تھا وہ بچ گیا تھا۔ عازم اور نمرہ پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ خوبصورت جگمگاتا ہوا خوشیوں سے معمور ہال لمحوں میں ایک ماتم کدے میں تبدیل ہو گیا۔

کبھی کبھی انسان کی زندگی میں آنے والا ایک چھوٹا سا لمحہ اتنا طاقتور بن جاتا ہے کہ وہ برسوں کی بنی بنائی زندگی کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔

نمرہ کی چیخوں سے درو بام لرزے جا رہے تھے۔
عازم سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ اس کی ماں جس میں اس کی جان تھی اتنا اچانک اسے چھوڑ گئی تھی کہ وہ یقین ہی نہیں کر پا رہا تھا اور نمرہ کے لیے تو ستم اور بھی بڑا تھا۔ اس کی پیاری ماں اور پھر ماں اور دوست جیسی شفیق ساس دونوں ہی ایک ساتھ اس سے بچھڑ گئی تھیں۔ ان دونوں نے تو ایک ساتھ جان دے کر اپنی دوستی نبھائی تھی لیکن ان کے بچے جیسے زندہ درگور ہو گئے تھے۔ ہر سو بکھری چاندنی اب ایک گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بدل چکی تھی، جہاں ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجھائی دے رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ترس رہی ہوں کوئی ماں سا مہربان وجود
دعائے نور پڑھے اور مجھ پہ دم کر دے

آج اس المناک حادثے کو بیتے ہوئے ایک ماہ کا عرصہ بیت چکا تھا۔ لیکن ان کے گھر کے در و بام ابھی تک نوحہ کناں تھے۔ نمرہ کی تو جیسے زندگی ہی بدل کر رہ گئی تھی۔ رو رو کر آنسو بھی خشک ہو چکے تھے لیکن دل کی ویرانی کم ہونے کے بجائے مزید بڑھتی جا رہی تھی۔ لب جیسے مسکرانا بھول گئے تھے۔ اس کی ویڈنگ اینورسری اس کی مما اور عزیز از جان آمنہ آنٹی کی موت کا سبب بن گئی تھی اور ظاہری سی بات ہے، آئندہ وہ کبھی بھی اپنی شادی کی سالگرہ نہیں منائے گی، کبھی بھی نہیں منائے گی کیونکہ وہی تاریخ تو مما اور آمنہ آنٹی کی ڈیتھ اینورسری کی بھی ہوگی۔

''اف.....!'' وہ جھرجھری لے کر سوچتی۔ ''یہ سب کیا ہو گیا؟ مما کیسے اسے یوں اچانک چھوڑ کر چلی گئیں؟ بابا جانی اور چھوٹے بہن بھائی کیسے تنہا رہ گئے؟ اس کا میکہ کیسے اجڑ گیا؟ ہر صبح کی شروعات وہ مما کو فون کر کے ہی تو کرتی تھی۔ اب وہ کیا کرے گی۔ جب وہ ان کے گھر جائے گی تو کون مسکراتا ہوا آ کر اسے گلے سے لگائے گا؟ بابا جانی اب بات بے بات کسے پکارتے ہوں گے؟ عاشی اور فواد تو ابھی بہت چھوٹے ہیں وہ مما کے بغیر کیسے رہ پائیں گے؟ یہ سب باتیں سوچتے ہوئے اس کا کلیجا پھٹنے لگتا۔

مما کا مسکراتا ہوا پیارا سا چہرہ ایک پل کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا تھا۔ وہ گھبرا کر آمنہ آنٹی کے کمرے میں چلی آتی۔

''آمنہ آنٹی...... آپ بھی چلی گئیں؟'' وہ ان کی مسہری پر بیٹھ کر زار و قطار رونے لگتی۔ کمرے کی سیٹنگ ویسے ہی تھی۔ اس نے ان کی کسی بھی چیز کو ادھر سے اُدھر نہیں کیا تھا۔ باتھ روم میں اب بھی ان کا آخری بار استعمال کیا ہوا تولیہ، صابن، ٹوتھ پیسٹ اور برش سب جوں کے توں موجود تھے۔ سائیڈ ٹیبل پر ان کے کان سے اتارے وہ ٹاپس بھی ویسے ہی رکھے ہوئے تھے جو چلتے ہوئے انہوں نے وہیں رکھ کر میچنگ کے دوسرے ٹاپس پہن لیے تھے۔ سب کچھ بالکل ویسا ہی تھا۔ بس آمنہ آنٹی ایک دم منظر سے غائب ہو گئی تھیں۔

یہ موت کیا چیز ہے؟

ایک چلتا پھرتا، ہنستا بولتا ہوا شخص ایک دم سے ہی اپنے پیاروں کی زندگی سے غائب ہو جاتا ہے۔ کبھی بھی واپس نہیں لوٹتا۔ وہ لوگ جو اپنے گھر میں، اپنی زندگی میں ہر پل اس کی موجودگی کو محسوس کرتے تھے، ایک دم سے اس کو منظر سے غائب ہوتا دیکھ سکتے ہیں، ایسی قیامت کو سہنا کوئی آسان کام تو نہیں ہوتا۔

''آمنہ آنٹی! آیئے، مجھے اپنے سینے سے

لگا لیچے۔ دیکھیے میری مما بھی چلی گئیں۔'' وہ رو رو کر انہیں پکارتی۔ عازم کا اپنا حال بھی بہت برا تھا۔ ایک جامد چپ نے جیسے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

ان دونوں کا دکھ مشترکہ تھا لیکن نہ جانے کیوں اتنے بڑے غم نے ان دونوں کو نزدیک کر دینے کی بجائے دور سا کر دیا تھا۔ عازم کب آفس چلا جاتا ہے، نمرہ کو پتا ہی نہیں چلتا تھا اور نہ ہی عازم اسے جگانے کی زحمت کرتا تھا۔ شام کو جب وہ واپس آتا تو بھی وہ اپنے میکے گئی ہوتی یا اگر کبھی گھر پر ہوتی تو متورم آنکھوں اور ملگجے لباس میں اس کا اداس سراپا عازم کو مزید گھٹن کا شکار کر دیتا۔ بچے الگ سہمے سہمے سے رہنے لگے تھے۔ وہ کھلکھلاتا ہوا جاگتا سا ماحول جیسے آمنہ آنٹی اور ربابہ کے ساتھ ہی مر گیا تھا۔

☆......☆......☆

اس نے سکھ پر لگائی پابندی
ہم نے دکھ کے کواڑ کھول لیے

نمرہ ابھی ابھی بابا جانی کے گھر سے واپس لوٹی تھی۔ آج ان کی طبیعت تو ٹھیک نہیں تھی۔ عاشی اور فواد کے ایگزام بھی سر پہ تھے۔ نمرہ پر دہری ذمے داری آن پڑی تھی۔ دو دو گھروں کی ذمے داریاں نبھانا کوئی آسان کام تو نہیں تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی سامنے لاؤنج میں اسے عازم بیٹھا ہوا نظر آیا۔

''ارے، آپ کب آئے؟'' وہ ہلکے سے مسکراتے ہوئے اس کے نزدیک آ گئی۔

عازم نے کوئی جواب نہیں دیا بس خاموشی سے ٹی وی دیکھتا رہا۔ نمرہ نے محسوس کر لیا کہ اس کا موڈ خاصا آف ہے۔

''عازم، میں بابا جانی کی طرف گئی تھی۔ آج ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اور عاشی اور فواد ایگزام کی وجہ سے بزی ہیں۔ فواد تو آج رو بھی رہا تھا۔ مما ایگزام کے دنوں میں اس کی کتنی کیئر کرتی تھیں۔'' آخری جملہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

''اگر آپ کی مجلس ختم ہو گئی ہو تو میں کچھ عرض کروں؟'' عازم کے اتنے سرد لہجے پر وہ ایک لمحے کو تو گنگ ہی رہ گئی۔

''کہیے......!'' وہ بہ مشکل بولی۔

''آج اس منحوس حادثے کو گزرے چھ ماہ ہو چکے ہیں۔ امی کے جانے کا غم میں نے اکیلے سہا ہے، اگر تمہاری مما مری ہیں تو میری بھی تو ماں مجھ سے بچھڑی ہے۔ تمہارے ساتھ بابا جانی اور سب بہن بھائی ہیں، تم سب مل کر ربابہ آنٹی کا غم بانٹ رہے ہو، کبھی میرے متعلق بھی تم نے سوچا ہے کہ میں کتنا تنہا رہ گیا ہوں؟ میرے لیے تو میری ماں کے علاوہ کوئی اور تھا ہی نہیں اور نہ شاید آئندہ بھی کوئی ہوگا۔ بیوی تو بیوی ہوتی ہے وہ ماں جیسا درد دل میں کیسے لا سکتی ہے؟''

اس کے لہجے میں درد، غصہ، بدگمانی، شکایت کا ایک غبار تھا جسے وہ بنا رکے نکالے جا رہا تھا اور نمرہ ششدر بیٹھی اس کے الفاظ کی دھار سے اپنے دل کو کٹتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

''اپنے بچوں کا حال دیکھا ہے، بالکل یتیموں کی طرح لگنے لگے ہیں۔ لگتا ہے ان کی بھی ماں مر گئی ہے۔'' عازم کا لہجہ مزید سفاک ہو گیا۔

''عازم......!'' اس نے تڑپ کر اس کی جانب دیکھا۔ ''مما کے غم کے ساتھ ساتھ آمنہ آنٹی کا دکھ بھی میری سانسوں کے ساتھ چل رہا ہے۔ میں تو دہرا غم جھیل رہی ہوں عازم! نہ اپنے گھر میں چین ملتا ہے اور نہ ہی بابا جانی کے گھر

سکون ملتا ہے لیکن میں پھر بھی پوری کوشش کر رہی ہوں کہ آپ، میرے بچے اور گھر اگنور نہ ہوں اگر پھر بھی آپ کو ایسا کچھ محسوس ہوا ہے تو سوری......!'' اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

پہلے وہ اس کے آنسو دیکھ کر پریشان ہو جاتا تھا لیکن آج جیسے وہ ٹھورپنے کی انتہا پر تھا۔

''عاشی اور فواد کی فکر تھوڑی کر کے اپنے بچوں کی فکر بھی کرو۔ ان کے ایگزام بھی سر پر ہیں۔'' وہ ہنوز بگڑا بگڑا سا بیٹھا ہوا تھا۔ نمرہ کے ٹوٹے ہوئے دل کے مزید ٹکڑے ہو گئے۔

آمنہ آنٹی کے جانے کے بعد عازم کافی چڑچڑا اور آدم بے زار ہو گیا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر الجھنا اس کا وتیرہ بن چکا تھا۔ شاید وہ اپنی ماں کی اتنی اچانک جدائی کو دل سے قبول ہی نہیں کر پا رہا تھا۔ نمرہ کی شکایت آمیز نظریں ایک لمحے کو اس کے چہرے کی طرف اٹھیں لیکن عازم بے رخی اور سرد مہری کا ایک جہاں اپنے اردگرد بسائے اس سے بالکل لاتعلق بیٹھا ٹی وی ریموٹ سے کھیلنے میں مصروف تھا۔ وہ دلبرداشتہ سی اس کے پاس سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ بچے اس وقت ٹیوٹر سے پڑھنے میں مصروف تھے ورنہ اس کا آنسوؤں میں بھیگا چہرہ انہیں ہراساں کر دیتا۔ وہ چپ چاپ بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔

عازم اس کے دل پر گزرنے والی قیامت سے بے نیاز خود ترسی کی ایک تصویر بنا بیٹھا تھا۔ اسے صرف اپنے غم کا احساس تھا۔ وہ یہ سوچ ہی نہیں رہا تھا کہ جس سے وہ دل جوئی چاہ رہا ہے وہ تو خود رونے کے لیے اس کا کاندھا ڈھونڈ رہی ہے۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو کتنا اکیلا اور تنہا محسوس کر رہی تھی اگر اس وقت آمنہ آنٹی ہوتیں تو وہ ان کی گود میں منہ چھپا کر خوب رو لیتی۔ ان سے عازم کے اس سرد رویے کی شکایت کر کے ان سے عازم کو خوب ڈانٹ پڑواتی۔

''لیکن آمنہ آنٹی بھی مر گئیں۔ کاش...... وہ نہ مرتیں، کوئی تو ہوتا یہاں میرے درد کو سمجھنے والا......'' اس نے زیر لب کہا اور گھٹ گھٹ کر رونے لگی۔

☆......☆......☆

ایسی تاریکیاں آنکھوں میں بسی ہیں کہ فراز
رات تو رات ہے، ہم دن میں جلاتے ہیں چراغ

''عازم، آج آپ ذرا جلدی آجایئے گا۔ بچوں کا دل آج سی سائیڈ پر جانے کا چاہ رہا ہے۔ واپسی پر کے ایف سی میں کھانے کا پروگرام بنا رہے ہیں یہ لوگ۔'' نمرہ فون پر بڑے خوشگوار انداز میں عازم سے کہہ رہی تھی۔

''اچھا کوشش کروں گا۔'' وہی سرد مہری لہجے میں چھپی ہوئی تھی، جس کو نمرہ پچھلے آٹھ ماہ سے جھیل رہی تھی۔

''ہم لوگ آپ کا انتظار کریں گے، کسی میٹنگ کا کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔'' وہ اس کے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے اسی شگفتگی سے بولی۔

''میں پوری کوشش کروں گا نمرہ لیکن فی الحال ابھی میرے پاس کچھ کلائنٹس بیٹھے ہوئے ہیں۔'' اب عازم تھوڑا نرم لہجے میں بولا تھا۔ نمرہ کے لیے یہ ہی کافی تھا۔ اس نے خدا حافظ کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

آج کتنے دنوں بعد اس نے عازم سے باہر آؤٹنگ پر جانے کی بات کی تھی ورنہ ہفتے میں کم از کم دو بار تو وہ سب باہر کھانا کھانے ضرور جاتے تھے۔ آمنہ آنٹی کبھی ان کا ساتھ دیتیں اور کبھی کوئی

بہانہ کر کے ٹال جاتیں۔ وہ اپنے بچوں کے باہر گھومنے پھرنے پر خوش ہوتی تھیں۔ نمرہ نے کبھی بھی عام ساسوں کی طرح ان کا موڈ آف ہوتے نہیں دیکھا تھا لیکن ان کے انتقال کے بعد جیسے وہ ہنسنا بولنا، گھومنا پھرنا سب کچھ خواب و خیال سا ہو کر رہ گیا تھا۔

ایک تو اچانک اتنے بڑے حادثے نے عرصے تک ان لوگوں کے ہوش و حواس معطل رکھے۔ دوسرے نمرہ پر تو دہری ذمے داری آن پڑی تھی۔ اس کے تو سسرال کی ساتھ ساتھ میکے پر بھی قیامت ٹوٹی تھی۔ اپنے بابا جانی اور فواد و عاشی کو یوں اجڑا اجڑا سا دیکھ کر اس کا کلیجا پھٹتا تھا۔ مما کے بغیر وہ گھر اسے کاٹنے کو دوڑتا تھا لیکن پھر بھی اسے ہر روز وہاں جانا ہوتا تھا۔ اس کے معصوم بہن بھائی گھبرا گھبرا کر اُسے بلایا کرتے۔ بابا جانی کو بھی جیسے اس کے آنے سے سکون مل جاتا تھا لیکن وہ وہاں زیادہ دیر نہیں رُک پاتی تھی۔ عازم کے موڈ کی فکر بھی تو دامن گیر رہتی تھی۔ پتا نہیں کیوں وہ اس کے دکھ، اس کے احساسات کو سمجھنے کے بجائے اس بات کو زیادہ دل پر لے بیٹھا تھا کہ اس کی ماں کی موت کی اہمیت نمرہ کی نظروں میں اتنی زیادہ نہیں۔ وہ اس کا دکھ بانٹنے کے بجائے اپنے میکے والوں پر گزرنے والے غم پر زیادہ فکر مند اور پریشان رہتی ہے۔ اسے نمرہ کا روز روز اپنے میکے جانا بے حد گراں گزرنے لگا تھا جس کا اظہار بھی طنز اور کبھی شدید خفگی کی صورت میں وہ اکثر کرتا تھا اور نمرہ جیسے جان لیوا صدمات نے پہلے ہی اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا وہ مزید بکھرتی چلی جا رہی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنی زندگی میں آنے والے اس بدترین فیز کو وہ کیسے ہینڈل کرے۔ اس کے بہن بھائی ابھی

ہدیۂ عقیدت

سُنہری عنبر
گلاب کا فرش
نوری منظر نبی ﷺ کی مسجد

پاک زمانہ
وہ اسطوانہ
ریاض الجنت نبی ﷺ کی مسجد

پیارے آقا ﷺ
پکارے اُمت
دکھا دے، ہم کو نبی ﷺ کی مسجد

قلب جھومے
نگاہ چومے
دیوار و در نبی ﷺ کی مسجد

سخن سجدہ
بدن سجدہ
جبین سجدہ نبی ﷺ کی مسجد

دنیا دارو!
غموں کے مارو
ہے دُکھ مداوا نبی ﷺ کی مسجد

نولکھ مبارک
نصیب ہو گر
یہ جنتی گھر نبی ﷺ کی مسجد

(دردانہ نوشین خان)

چھوٹے تھے، وہ اپنی مما کی موت، ان کی جدائی کو سہار نہیں پا رہے تھے۔ بابا جانی کا بلڈ پریشر بے حد بڑھا ہوا رہنے لگا تھا۔ مما کے ہاتھوں سے سجا وہ خوبصورت گھر ایک ویران مقبرے کی طرح لگنے لگا تھا۔ وہ کیسے ان سب کو نظر انداز کر کے اپنے گھر میں سکھ سے رہ سکتی تھی۔ آمنہ آنٹی کا غم بھی ایک کانٹے کی طرح اس کے دل میں ہمہ وقت چبھتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ ایسی نیند سو جائے کہ پھر کبھی اس کی آنکھ ہی نہ کھلے۔ ایسے میں وہ فاران، جبران اور رمشا کی معصوم محبتوں میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتی۔ ان کی پیاری پیاری من موہنی باتوں اور حرکتوں سے اپنا دل بہلانے کی کوشش کرتی لیکن دل کو پھر بھی سکون نہیں ملتا تھا۔

اب اس کی پوری کوشش یہ ہی ہوتی کہ وہ عازم کے آفس ٹائم میں بابا جانی کے گھر ہو آئے۔ وہ اپنا درد دل میں چھپا کر عازم کے سامنے فریش نظر آنے کی کوشش کرتی تاکہ عازم کے بجھے دل میں تھوڑی سی خوشی کی کرن جاگے۔ عازم آفس سے آکر سیدھا اپنی امی کے کمرے میں جاتا تھا اور یہ عادت اس کی اب تک برقرار تھی۔ وہ دس پندرہ منٹ ضرور ان کے کمرے میں گزارتا۔ ان کے بیڈ پر کچھ دیر آنکھیں بند کر کے لیٹا رہتا۔ بند آنکھوں کے گوشوں سے خاموش آنسو بہتے رہتے اور ان لمحوں میں بھی وہ اپنے شریک سفر کے آنسوؤں میں برابر سے شریک رہتی۔ آمنہ آنٹی کی کتنی ہی یادوں کو وہ اس کے ساتھ مل کر دہراتی لیکن ایسے موقعوں پر چھم سے مما کی تصویر بھی اس کی آنکھوں میں اتر آتی۔ عازم کے آنسو پونچھتے ہوئے بابا جانی کا اترا ہوا چہرہ اور فواد اور عاشی کی آنسو بھری نگاہیں بھی اس کے دل میں کچوکے لگانے لگتے لیکن اپنے لبوں سے اس کا دکھ کا اظہار کرنا تو درکنار وہ اپنی آنکھوں کو بھی اس خوف سے بند کر لیتی کہ مبادا کہیں عازم ان میں جھانک کر ان میں چھپے اس کی مما کے غم کو نہ پڑھ لے۔

آمنہ آنٹی کے انتقال نے عازم کو ایک دم سے کیسے بدل دیا تھا۔ وہ نرم خو محبتوں سے گندھا ہوا انسان جس کی خوبصورت باتوں سے اس کی زندگی میں روشنی بکھری رہتی تھی۔ اب وہی روشنی اس کے بدصورت رویے اور طنزیہ باتوں نے جیسے بجھا کر رکھ دی تھی۔

اس دن وہ بابا جانی کے گھر گئی ہوئی تھی۔ فواد کو اردو کے پیپر میں کچھ مشکل پیش آ رہی تھی۔ بابا جانی کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ بچوں کو اسکول سے لیتے ہوئے سیدھی یہیں آ گئی تھی کہ فواد بہت پریشان تھا۔ وہ فواد کو کسی شعر کی تشریح سمجھا رہی تھی کہ موبائل پر عازم کی کال آ گئی۔

''کہاں ہو تم؟ میں نے گھر فون کیا تھا۔ حاجرہ نے بتایا کہ تم باہر گئی ہوئی ہو۔'' وہ کافی غصے میں لگ رہا تھا۔

نمرہ کی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ عازم دن میں شاذ و نادر ہی فون کرتا تھا اور آج بھی اسی لیے وہ دوپہر کو یہاں آئی تھی تاکہ عازم کے آفس سے آنے سے پہلے پہلے وہ گھر واپس چلی جائے لیکن اس وقت عازم کے فون نے سارا معاملہ ہی گڑبڑ کر دیا تھا۔

''عازم، میں بس کچھ دیر کے لیے بابا جانی کے گھر آئی تھی۔ فواد کو پڑھائی میں تھوڑی ہیلپ کی ضرورت تھی۔'' وہ گھبرا کر صفائی دینے لگی۔

''اسلام آباد سے میرا دوست شہزاد اچانک مجھ سے ملنے آفس آ گیا تھا۔ وہ امی کی تعزیت

کے لیے تمہارے پاس بھی آنا چاہتا تھا لیکن تمہیں میری امی کے غم سے کیا مطلب تم لوگوں کا اپنا ہی غم اتنا بڑا ہے پھر میری ماں کی موت کی اہمیت بھلا تمہاری نظروں میں کیا ہوگی؟'' اس کے لہجے میں غراہٹ تھی۔

وہ اس کی بات سن کر ایک لمحے کو جیسے سن ہوگئی۔ کیسے دل کو کاٹ دینے والے جملے تھے اس کے۔ نمرہ کا مر جانے کو دل چاہنے لگا۔ عازم نے فون بند کر دیا تھا لیکن وہ یونہی موبائل کانوں سے لگائے گم صم بیٹھی رہی۔

''کیا بات ہے بیٹا! سب خیریت تو ہے نا؟'' بابا جانی کی آواز پر جیسے وہ ہوش میں آگئی۔ وہ نہ جانے کب واپس آگئے تھے، اسے پتا ہی نہیں چلا۔ وہ بڑی تشویش بھری نگاہوں سے اس کی اڑی ہوئی رنگت کو دیکھ رہے تھے۔ آنکھوں میں مچلتے آنسو بھی ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھے۔ وہ چونکہ موبائل لے کر فواد سے کچھ فاصلے پر آگئی تھی اس لیے وہ اس کی کیفیت سے بے خبر اپنی کتابوں میں ہی الجھا بیٹھا تھا۔ بچے ٹی وی دیکھنے میں مگن تھے اور عاشی کچن میں اس کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ بس اس وقت اتفاق سے بابا جانی کی نظروں میں ہی اس کی یہ غیر ہوتی کیفیت آگئی تھی۔

''بولو نا بیٹے، کیا بات ہے؟'' وہ مزید پریشان ہو کر اس کے نزدیک چلے آئے۔

''بابا جانی......!'' وہ بے اختیار ان کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔

''بابا جانی میں تھک چکی ہوں۔ میں مما کا غم برداشت کر رہی ہوں، آمنہ آنٹی کی جدائی سہہ رہی ہوں لیکن میں عازم کا اتنا بدصورت رویہ اور اس کی خودغرض فطرت کو نہیں سہہ سکتی۔ میں

مرجاؤں گی بابا جانی، میں مرجاؤں گی۔''

آج جیسے اس کے ہاتھوں سے صبر کا دامن چھوٹ ہی گیا تھا۔ وہ ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی اور بابا جانی اسے ایک معصوم بچی کی طرح اپنے بازوؤں کے حصار میں لیے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو چھپاتے ہوئے اسے سمجھا رہے تھے۔

''میری بچی! میں تمہارے دکھ، تمہاری پریشانی کو سمجھ رہا ہوں، تم کیا سمجھتی ہوں، میں تمہارے ننھے سے دل پر چھائی ہوئی پریشانیوں سے بے خبر ہوں؟ تم جو کچھ جھیل رہی ہو، مجھے اس کا اچھی طرح سے اندازہ ہے۔ میں تو خود تم سے اس سلسلے میں بات کرنا والا تھا۔''

وہ اسے تھامے ہوئے اپنے کمرے میں لے آئے۔ عاشی بھی چائے کا مگ ہاتھوں میں تھامے ان کے پیچھے چلی آئی۔ نمرہ نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے بابا جانی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا جو شاید اس سے کچھ کہنے والے تھے۔

''بیٹا! تم میری بہت بہادر بیٹی ہو، تم ایک ساتھ دو محاذوں پر لڑ رہی ہو بیٹا لیکن میرے خیال میں بس تمہارے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ اب تم صرف اپنے گھر اپنے بچوں اور اپنے شوہر کا خیال کرو، یہاں پر میں ہوں نا۔ عاشی بھی اتنی بڑی ہوگئی ہے کہ وہ اس گھر کو سنبھال سکے۔ ہے نا عاشی؟'' آخری جملہ انہوں نے عاشی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو عاشی نے اثبات میں سر ہلا دیا لیکن آنسو خاموشی سے اس کے رخسار پر لڑھک آئے۔

''بابا جانی! میں نے اپنے آپ کو اندر سے بالکل مار دیا ہے عازم کی خاطر لیکن وہ کیوں نہیں میرے جذبات، میرے احساسات کو سمجھتے؟ میں نے اگر اپنی مما کو بے طرح یاد کیا ہے تو آمنہ آنٹی کے لیے بھی تو تڑپی ہوں اور میرا یہ رونا کوئی دکھاوا نہیں ہے لیکن وہ تو دکھاوے کے طور پر بھی کبھی مما کا ذکر نہیں کرتے۔ انہیں صرف اپنا غم عزیز ہے۔ ایک خود ترسی میں مبتلا شخص کے ساتھ میں کیسے دن رات بتاؤں؟ کیسے اپنی پیاروں کو چھوڑ دوں بابا جانی؟'' وہ ایک بار پھر بلک بلک کر رو دی۔ اب کے عاشی بھی دبی دبی سسکیوں کے ساتھ اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

''نمرہ! جب تم نے اتنی بڑی قیامت کو سہہ لیا تو پھر یہ سچویشن جو تمہاری زندگی میں آئی ہے یہ تو وقتی ہے بیٹا! عازم اپنی ماں سے بہت اٹیچڈ تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد اس کے لیے سارا جہاں اس کی امی ہی تھیں۔ تم سے شادی کے بعد بھی اس کی اپنی ماں سے محبت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی کیونکہ تم تو خود آمنہ کے لیے ایک بیٹی کا روپ ثابت ہوئی تھیں۔ تم نے ماں بیٹے کی محبت کو بٹانے کی کوئی کوشش نہیں کی لیکن اب اس کی ماں کے غم کو تم نے اپنی ماں کے غم کے ساتھ بانٹ لیا ہے جسے شاید وہ برداشت نہیں کر پا رہا۔ اس کے لیے اپنی ماں کا اچانک بچھڑ جانا ایک ناقابل برداشت دھچکا ہے اور ایسے میں اس کو اپنے سسرال والے ایک کانٹے کی مانند کھٹک رہے ہیں۔ یہ ایک نفسیاتی گرہ ہے بیٹا، جسے تم نے اپنی سمجھ داری سے کھولنا ہے۔'' وہ بڑے رسان سے اسے سمجھا رہے تھے۔

''لیکن بابا جانی، آمنہ آنٹی کے انتقال سے پہلے تو انہوں نے اس گھر کو کبھی سسرال نہیں سمجھا تھا۔ ہر وقت کا آنا جانا رہتا تھا ہم سب کا۔ اب کیسے وہ اتنا فرق محسوس کرنے لگے ہیں؟'' نمرہ

نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''بیٹا، چونکہ آمنہ اور ربابہ میں بے پناہ دوستی تھی اور وہ بچپن سے ہی اس گھر میں آتا جاتا رہتا تھا اور تم سب سے کافی نزدیک تھا اور پھر ربابہ اور آمنہ نے سمدھن کے رشتے کو کبھی اپنی دوستی پر حاوی نہیں ہونے دیا سو پہلے جیسی روٹین میں سب کچھ چلتا رہا تھا لیکن اب آمنہ اور ربابہ کے چلے جانے کے بعد جیسے اسے یہاں اجنبیت محسوس ہونے لگی ہے۔ وہ اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کرنے لگا ہے۔ ایسے میں سوائے تمہارے اسے دور دور تک کوئی اپنا نظر نہیں آرہا اور بیٹا، یہ فیز بہت جلدی ختم ہو جائے گا۔ آہستہ آہستہ اس کا زخم بھر جائے گا اور پھر سے نارمل ہو جائے گا۔ بس تمہیں صبر سے اس وقت کا انتظار کرنا ہے۔'' وہ اسے کافی دیر تک سمجھاتے رہے تھے۔

اور جب وہ اپنے گھر واپس جانے کے لیے اٹھی تو دل پر پڑا ہوا بوجھ کچھ کم لگ رہا تھا اور بابا جانی کے کہنے کے مطابق اب اسے اپنے گھر کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے نئے سرے سے کوشش شروع کرنا تھی اور یہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی کہ آج اس نے بہت دنوں بعد عازم سے کہیں باہر چلنے کی خواہش کی تھی۔

☆......☆......☆

کیا خبر تھی کہ خزاں ہوگی مقدر اپنا
ہم نے ماحول سجایا تھا بہاروں کے لیے

عازم خلاف توقع شام سے پہلے ہی گھر پہنچ گیا تو نمرہ کے ساتھ ساتھ بچے بھی بہت خوش ہوگئے۔ وہ لوگ تقریباً تیار تھے۔ نمرہ نے عازم کی پسند کا پنک کلر کا سوٹ پہنا تھا۔ بہت دنوں بعد اس نے ہلکا پھلکا میک اپ بھی کیا تھا اور میچنگ جیولری بھی پہنی تھی۔ شیمپو کیے ہوئے خوب صورت ریشمی لانبے بالوں کو اس نے کھلا چھوڑا ہوا تھا اور عازم ہمیشہ ہی اس کی چوٹی کھول کر بال بکھیر دیتا تھا۔

''یہ کیا کرتے ہیں آپ؟ اتنی محنت سے میں نے چوٹی گوندھی تھی۔'' وہ اکثر چڑ کر کہتی تو وہ شرارت بھری ہنسی ہنس دیتا۔

''بھئی میں کیا کروں، کراچی میں ایسے تو گھٹائیں چھاتی نہیں ہیں تو ہمیں تمہاری ان ہی گھٹاؤں سے کام چلانا پڑتا ہے۔'' وہ اس کے بالوں کو اپنے ہاتھوں میں لپیٹتا ہوا کہتا اور نمرہ کے دل کے اندر پھول ہی پھول کھل جاتے۔

آج بہت عرصے بعد وہ ان بیتے ہوئے دنوں کو آواز دینا چاہ رہی تھی۔ انہیں یادوں سے نکال کر حال میں واپس لانا چاہ رہی تھی۔

عازم کی نظریں بھی بھٹک بھٹک کر اس کے خوب صورت سراپے سے اُلجھی جارہی تھیں جنہیں وہ اچھی طرح سے محسوس کر رہی تھی تب ہی تو اس کے چہرے کا رنگ کپڑوں سے ہم رنگ ہوا جارہا تھا۔ بچے خوشی سے چہک رہے تھے۔ بہت دنوں بعد ان کے ممی اور ڈیڈی انہیں پہلے جیسے لگ رہے تھے۔ نمرہ کو یوں محسوس ہورہا تھا جیسے ہر سو بہار ہی بہار کے رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ آج وہ اپنے دل پر چھائے ہوئے غم کو کچھ لمحوں کے لیے بالکل ہی بھول جانا چاہ رہی تھی۔ اس نے اپنا سیل فون بھی آف کردیا تھا اور فون کو بھی انگیج کر کے رکھ دیا تھا وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی بھی قسم کی کوئی کال عازم کا موڈ خراب کردے۔ خاص طور پر عاشی یا فواد کا فون فوری طور پر عازم کے موڈ آف ہوجانے کا سبب بن جایا کرتا تھا۔

''نمرہ پلیز، مجھے ایک کپ چائے کا بنادو۔ اس کے بعد پھر چلتے ہیں۔''

عازم نے بڑے خوشگوار انداز میں اس سے کہا تو وہ چائے بنانے کچن میں چلی آئی۔ ابھی اس نے الیکٹرک کیٹل ان ہی کی تھی کہ عازم کے پکارنے پر وہ جلدی سے لاؤنج میں چلی آئی۔ سامنے ہی مما کی اسکول کے زمانے کی دوست نفیسہ آنٹی کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ کافی عرصے سے دبئی میں مقیم تھیں۔ انہیں رباب کے انتقال کی خبر ہی نہیں تھی۔ تقریباً ایک سال بعد ان کا پاکستان آنا ہوا تھا تب یہاں آ کر انہیں یہ خبر ملی۔ وہ حواس باختہ رباب کے گھر پہنچیں تو اتفاق سے وہ لوگ گھر پر نہیں تھے۔ چوکیدار سے نمرہ کا ایڈریس لے کر وہ اس کی طرف چلی آئیں کہ ان کے دل کو اس اندوہناک خبر سننے کے بعد چین ہی نہیں آ رہا تھا۔ نمرہ کا دل بھی ان کو دیکھ کر بے ساختہ بھر آیا۔ مما اتنی شدت سے یاد آئیں کہ وہ ان کے گلے لگ کر بے اختیار رونے لگی۔

''یہ سب کیسے ہو گیا نمرہ؟ مجھے تو اب تک یقین نہیں آ رہا۔'' کچھ دیر رو لینے کے بعد انہوں نے گلوگیر آواز میں اس سے پوچھا تو وہ بہتے اشکوں کے ساتھ ان کو تفصیل بتانے لگی۔ آمنہ آنٹی کے بارے میں بتاتے ہوئے وہ ایک بار پھر رو پڑی۔ اُسے پتا ہی نہیں چلا کہ عازم کب اُٹھ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔

نفیسہ آنٹی کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئیں۔ بچے باہر لان میں کھیل رہے تھے۔ اس نے اپنی متلاشی نگاہیں عازم کی تلاش میں ادھر اُدھر دوڑائیں لیکن وہ اسے کہیں نظر نہیں آیا۔

''اوہ خدایا!'' ایک لمحے کو کسی خوف نے جیسے اس کے دل کی دھڑکنوں کو روک دیا۔ کیا اس کی دل جوئی، غم گساری سب بے کار گئی۔ کیا اس کا اپنے محبوب کے لیے سجنا سنورنا خاک ہو گیا، کیا اس ستم گر نے پھر اسے بے خطا آسمان سے زمین پر لا پھینکا۔ وہ لرزتے قدموں سے آمنہ آنٹی کے کمرے کی طرف چلی آئی اور اس کی توقع کے عین مطابق وہ اپنی امی کے بیڈ پر آنکھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے لیٹا تھا۔

''عازم!'' وہ اس کے سرہانے آہستہ سے بیٹھ گئی اور اپنا ہاتھ اس کے ماتھے پر رکھ کر بہت پیار سے اُسے پکارا، لیکن جواب میں جس بے دردی سے اس نے نمرہ کا ہاتھ جھٹکا! وہ نمرہ کو دہلا دینے کے لیے کافی تھا۔

''کیا ہوا عازم، کیوں خفا ہو رہے ہو؟'' اس کی آواز آنسوؤں سے بھیگ گئی۔

''تمہاری ان آنٹی کو ہمارے گھر آنے کی کیا ضرورت تھی؟ مجھے کچھ دیر تو خوش رہنے دیا ہوتا؟ کتنی مشکلوں سے میں نے اپنے دل کو بہلانے کی کوشش کی تھی۔ اپنی امی کے غم کو اپنے بچوں کی خاطر کچھ لمحوں کے لیے بھلانا چاہا تھا لیکن تمہاری مما کا پرسہ دینے وہ خاتون بجائے ان کے گھر کے، یہاں چلی آئیں۔ اب تو میرے ہی گھر میں میری امی کے بجائے تمہاری مما کا ذکر زیادہ ہونے لگا ہے۔''

وہ کھولتے ہوئے لہجے میں اس کے دل میں ایسے ایسے تیر پیوست کر رہا تھا کہ وہ اندر سے بالکل لہولہان ہوتی جا رہی تھی۔

''عازم، میری مما آپ کی بھی تو کچھ لگتی تھیں۔ مجھے درمیان میں سے ہٹا کر دیکھیے تو وہ آپ کی آنٹی بھی تو ہوتی تھیں۔ بچپن میں کتنے ناز اٹھائے ہیں انہوں نے آپ کے اور شادی کے بعد بھی آپ ان کے داماد نہیں بلکہ چہیتے بیٹے کے طور پر رہے۔ اگر آج آپ کے گھر ان کا پرسہ لے لیا گیا تو کون سا گناہ ہو گیا؟'' نمرہ کے ضبط کا

دامن بھی آج اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا تھا۔
"گناہ تم سے نہیں مجھ سے ہوا ہے۔ آج میں نے اپنی امی کو کچھ دیر کے لیے تم سب کی خاطر بھلانا چاہا تھا اسی لیے میں آفس سے آ کر ان کے اس کمرے میں بھی نہیں آیا تھا تاکہ میرے آنسو تم سب کے چہروں کی مسکراہٹ نہ ختم کر دیں لیکن تمہارے گھر والے تمہیں ایک منٹ کے لیے بھی رباب آنٹی کو نہیں بھولنے دیتے۔ انہیں ہمارے گھر کو اداسی میں ڈوبے دیکھنا ہی سکون دیتا ہے۔ ہمارا سارا پروگرام خراب کر دیا ان محترمہ کو یہاں بھیج کر۔" وہ بے حد بپھرے ہوئے انداز میں اٹھا اور اسے ایک طرف ہٹاتے ہوئے تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ ششدر سی بیٹھی ان کا یہ نیا الزام سنتی رہ گئی۔
"بابا جان...... تو گھر پر تھے ہی نہیں۔ خدارا، انہیں تو درمیان میں مت لائیے۔"
اس نے چلا کر کہنا چاہا لیکن وہ کچھ سننے کا روادار ہی کب تھا۔ اتنی تیزی سے باہر گیا تھا کہ اسے کچھ کہنے کی مہلت ہی نہ ملی تھی۔ وہ وہیں کارپٹ پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ یہ پروگرام اس کی مما کی وجہ سے خراب ہوا تھا اس لیے عازم نے رائی کا پہاڑ بنا دیا تھا لیکن اگر اس وقت آمنہ آنٹی کی تعزیت کے لیے کوئی آ جاتا تو عازم کا کبھی یہ ری ایکشن نہ ہوتا۔"
پہلی بار اس کے دل میں آمنہ آنٹی کے لیے کوئی درد نہیں جاگا بلکہ ایک گلہ سا محسوس ہوا اور دوسرے ہی لمحے ایک اور خیال جھماکے کی طرح اس کے دماغ میں کوندا، اگر اس دن اس حادثے میں آمنہ آنٹی بچ گئی ہوتیں اور صرف مما کی ہی ڈیتھ ہوئی ہوتی تو عازم اس کی ماں کی موت کو بھی ایک ایشو بنا کر اس کی زندگی اجیرن کر دیتا کہ اس کے اتنے اہم اور خوشیوں بھرے دن کو اپنی ویڈنگ اینورسری کو وہ اس کی مما کی وجہ سے نہیں منا سکتا اور کوئی بعید نہیں تھی کہ وہ ایک دو سالوں بعد وہ اسے زبردستی اس تاریخ کو ہنسی خوشی منانے کو کہتا جس تاریخ کو اس نے اپنی مما کو خون میں لت پت دیکھا تھا۔
"شکر ہے، آمنہ آنٹی بھی مما کے ساتھ ہی اس دنیا سے چلی گئیں۔ اب کم از کم وہ عازم کے طعنوں سے تو بچی رہے گی کہ اس میں اس کی اپنی ماں کا غم بھی تو شامل ہوگا۔" ایک عجیب طرح کا اطمینان اس کے دل میں اتر آیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اپنی اس سوچ پر ندامت سے بری طرح گڑ گئی۔
"یا اللہ! مجھے معاف کر دے! میں نے اپنی آمنہ آنٹی کے لیے اتنی گھٹیا بات سوچی بھی کیسے؟ ابھی کچھ دیر پہلے تو ان کے چلے جانے کا دکھ سہا ہی نہیں جا رہا تھا اور اب ان کے مر جانے پر میں شکر ادا کر رہی ہوں۔ ان کی دعاؤں، ان کی محبت اور شفقتوں کا یہ صلہ دے رہی ہوں؟" اس نے زور زور سے اپنے رخساروں کو پیٹ ڈالا۔
"آمنہ آنٹی! پلیز۔ مجھ سے خفا مت ہوئیے گا۔ مجھے معاف کر دیں لیکن یہ سب قصور آپ کے بیٹے کا ہے، ان کی چھوٹی سوچ نے مجھے بھی چھوٹا بننے پر مجبور کر دیا۔"
وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی لیکن پھر بھی ایک عجیب سا اطمینان اس کے دل کے کسی کونے میں مسکرا مسکرا کر اس سے کہہ رہا تھا کہ آمنہ آنٹی نے اس کی مما کی موت کو اس کے لیے ایک طعنہ بننے سے بچا لیا ہے۔

☆☆......☆☆

أمِ مریم

رحمٰن، رحیم، سدا سائیں

بیٹے یہ ایک بہت تلخ حقیقت ہے کہ شادی کے بعد بیوی جتنی بھی محبوبہ ہو مگر وہ شوہر کے ہاتھ میں پکڑے ترازو کے جس پلڑے میں جا کر بیٹھتی ہے۔ وہ پلڑا بہت ہلکا ہوتا ہے۔ دوسرے پلڑے میں سسرال والے ہوتے ہیں۔ وہ پلڑا بہت بھاری ہوتا ہے۔ اور کئی سال تک......

زندگی کے ساتھ سفر کرتے کرداروں کی فسوں گری، ایمان افروز ناول کا تئیسواں حصہ

''نہیں جاؤں گی۔ اس وقت تک جب تک آپ مجھے معاف نہیں کرتے۔'' اس نے دھڑلے سے مان سے گردن اکڑا کر صاف انکار ہی نہیں کیا بلکہ مزید اسی شانِ تمکنت سے گویا ہوئی تھی۔

''دیکھیے صاحب! انا کے بت کو ہٹا کر دیکھیے۔ ایک نازک حسین اور پیاری سی لڑکی معذرت کر رہی ہے آپ سے۔'' اس نے اسی مان شوخی اور اعتماد سے کہتے اس کے گھٹنوں کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے چہرہ وہیں ٹکا کر ایسی فاتحانہ نظروں سے اسے دیکھا۔ گویا اس مرتبہ وہ ہرگز نہیں اسے جھٹک سکتا۔ ہرگز نہیں نظر انداز کر سکتا۔ اس کا یہ مان یہ اعتماد کچھ اتنا بے جا بھی نہیں تھا۔ ایک تو زہد شکن حسن اس پر دلہناپے کا حسین تر روپ اس پر بھی غضب یہ ناز و ادا یہ پیش رفت...... عبدالعلی تو جیسے حرکت کرنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ جبکہ قدر کو اس کی اس ساکن خاموشی نے مزید حوصلہ دیا تھا۔ جبھی ہاتھ بڑھا کر اس کے بال شرارت سے بکھیر دیے تھے۔

''مان جائیں ناں...... مانا کہ غلطی میری ہے۔ مگر اب منا بھی تو رہی ہوں...... چلیں کان پکڑتی ہوں۔'' اس نے جھٹ کان بھی پکڑ لیے۔ عبدالعلی نے ناگواریت میں مبتلا ہو کر اس کی یہ غیر سنجیدگی یہ مسخرہ پن ملاحظہ کیا تھا۔

''اُووف...... کر بھی دیں معافی کا اشارہ...... کب تک یونہی رہوں......'' تب عبدالعلی نے ایک دم سے اس کی چوڑیوں سے بھری کلائی جھپٹ کر دبوچ لی تھی۔ اور اپنی سرد نظریں اس کی آنکھوں میں بے رحمی کے تاثر سمیت گاڑھ دیں۔

''کیوں کر رہی ہو یہ فضول حرکتیں......؟''

''آپ سے محبت جو کرتی ہوں۔'' وہ بسوری۔ عبدالعلی اسے گھورتا رہا۔

''آئندہ کرو گی کوئی بچکانہ حرکت......؟'' وہ مشروط ہوا۔ قدر نے فی الفور گردن نفی میں

ہلائی۔
'' دل تو چاہتا ہے اتنا ماروں کہ......''
عبدالعلی نے دانت پیسے۔ قدر نے تحیر سے اسے دیکھا۔ آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔ وہ ایک دم ڈھیلی پڑی۔
'' تو ماریں پھر...... یہ حسرت بھی آج پوری کرلیں اگر اس دن دل نہیں بھرا تو...... میری شادی کی رات اگر ہر لحاظ سے انوکھی نرالی ثابت ہوچکی ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔'' وہ بولی تو آواز بھی رقت زدہ تھی۔ عبدالعلی اسے گھورتا رہا۔ پھر کچھ کہے بغیر بازوؤں میں بھرلیا۔ سینے سے لگالیا۔ آنکھیں چوم لیں۔ قدر نے آنکھیں موندلیں۔ یوں جیسے گہرے سکون میں مبتلا ہوئی ہو اور اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آہستگی سے مستی سے گنگنائی۔

میری ہر من مانی بس تم تک
باتیں بچگانی بس تم تک
میری نظر دیوانی بس تم تک

عبدالعلی ہولے سے ہنس دیا۔ پھر اس کے بالوں کی لٹ انگشت شہادت پر لپیٹی اور ہلکا سا جھٹکا دیا۔
'' اگر تم آج کی رات مجھے ناراض رہنے دیتی۔ مجھے ایسے نہ مناتی منتیں کرکر کے...... تو میں سچ مچ تمہیں شوٹ کردیتا اس رات کو برباد کرنے کے جرم میں۔'' وہ اس میں محو تھا۔ مگن تھا۔ مست تھا۔ قدر ہولے سے سرشاری سے ہنسنے لگی۔
'' اگر آپ آج کی رات مجھ سے نہ منتے میں خود مرجاتی۔ غم سے، دکھ سے، سبکی سے۔'' عبدالعلی نے اس کے گرد بازوؤں کا حلقہ مزید تنگ کردیا۔
'' شکر ہے تم نے معافی مانگ لی۔ ورنہ ہماری یہ اہم رات بھی گل خان کے گھر پر بسر ہوئی رات کی طرح پھیکی اور بے رونق رہ جاتی۔ سچ بتاؤں...... تم آج اس سے زیادہ ہماری نہیں لگ رہی تھیں۔ جتنی اس رات...... جبھی تو دل اتنا بے ایمان ہوگیا تھا۔'' وہ ہنسا اور قدر گلابی پڑتی چلی گئی تھی۔
'' لیکن آپ آج ضرور اس رات سے زیادہ پیارے لگ رہے تھے۔ جبھی میں آپ کو ہر صورت منالینے پر آمادہ تھی۔'' وہ ہنسی تو عبدالعلی کی بھی ہنسی اس کی ہنسی میں شامل ہوگئی تھی۔

☆......☆......☆

لاریب کے منع کرنے کے باوجود وہ ان کے ساتھ لگی رہی تھی۔ سمیٹنے میں چھوٹے موٹے کاموں میں...... گو کہ لاریب نے منع بھی کیا تھا۔ مہندی لگے ہاتھوں پیروں کے ساتھ وہ جب کمرے میں لوٹی تو مہندی سوکھ کر جھڑنا شروع ہوچکی تھی۔ اس نے گہرا سانس بھرا اور گوری شفاف کلائیوں اور ہاتھوں پر موجود نقش و نگار دیکھتے جانے کس خیال کے تحت مسکرا رہی تھی۔
فون کی بیل پر اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔
'' السلام علیکم!'' اس نے کال ریسیو کرلی تھی۔ عبداللہ نے جواباً سرد آہ بھری۔ سلام کا جواب دیا اور خیریت دریافت کی تھی۔
'' الحمدللہ!'' اتباع کا لہجہ نرم تھا۔ مدہم تھا، گریزاں تھا۔
'' کیا ہو رہا تھا جناب!'' وہ مسکرایا۔
'' نماز پڑھنے لگی تھی۔'' اتباع کی سنجیدگی کا ہنوز وہی عالم تھا۔
'' کل اس وقت تم یہاں ہوگی...... میرے پاس میرے ساتھ اور......''
'' آ، آپ اس وقت کیا کررہے ہیں؟ امن بوجان سب ٹھیک ہیں......؟'' اس کے رومینٹک
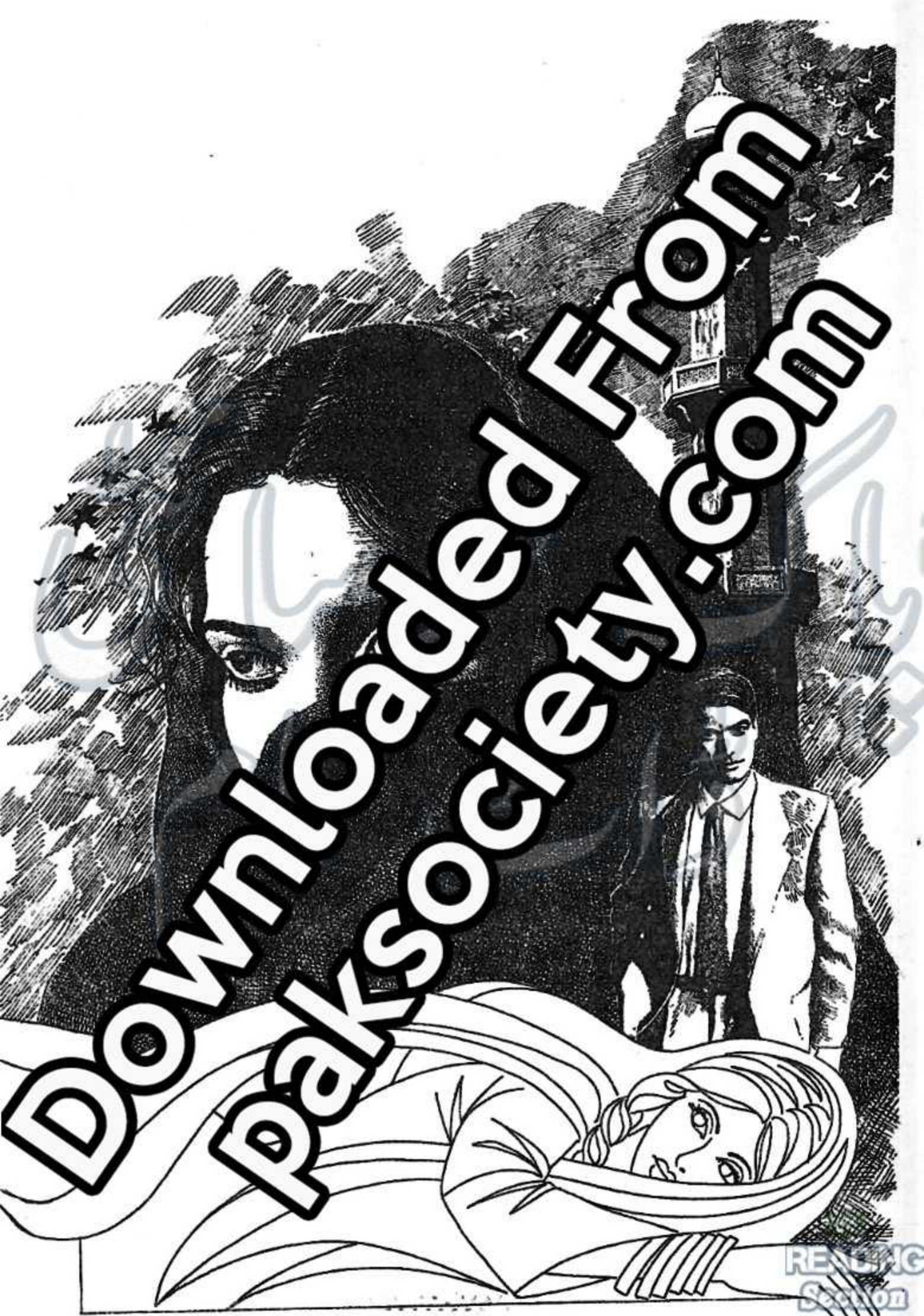
موڈ سے خائف ہوتے اتباع نے گھبرا کر اس کی بات قطع کی۔ گویا دھیان بٹانا چاہا۔ عبداللہ نے صاف محسوس کیا۔ جبھی آہ بھری تھی۔

بہت تصور کے جلوے ہیں میں ہوں
جدائی سلامت مزے آ رہے ہیں

اتباع دہک سی گئی۔ کچھ دیر تک اس نے خود کو سنبھالا تھا۔ پھر قدرے حوصلہ کیا۔

''میں نماز پڑھ لوں...... لیٹ ہو رہی ہے۔''

عبداللہ نے جواباً لمبا مخمور سانس کھینچا۔

''آج کی رات بہت لمبی ہے یار! بہت اکتا دینے والی...... کب صبح ہو گی۔ کب دن ڈھلے گا کب کل کی رات آئے گی۔ کب تم میرے پاس ہو گی۔ کب میں خود پر رشک کروں گا کہ......''

اس پر حرام ہیں غم دوراں کی تلخیاں
جس کے نصیب میں تیری زلفوں کے سائے ہیں

''کل میں دنیا کا سب سے امیر شخص ہوں گا ناں اتباع!'' وہ اس کی تائید چاہتا تھا۔ جو حجاب کے مارے اس سے ہو نہیں سکتی تھی۔ وہ خفت زدہ سی محجوب سی بیٹھی رہی۔

''یار تم بھی کچھ بولو......'' عبداللہ نے پکار کر اسے چونکا دیا۔

''پلیز......!!'' وہ ملتجی ہوئی۔ عبداللہ نے گہرا متاسفانہ سانس بھرا۔

''اوکے...... آج چلا لو اپنی، کل ہمارا دن ہو گا۔ ہماری من مانی ہو گی۔'' وہ متبسم ہوا تھا۔ اتباع نے گھبرا کر فون بند کر دیا۔ نماز میں مشغول ہوئی تو جیسے باقی سب بھول گیا۔ دل بے حد گداز ہو رہا تھا۔ یہ اس کی اس گھر میں آخری عشا کی نماز تھی۔ دعا کے دوران بھی آنکھیں بار بار چھلکتی رہیں۔ خدا سے تیری...... اصلاح اور رہنمائی مانگتے رہنے کے بعد اس نے منہ پر ہاتھ پھیرا اور جائے نماز تہہ کرتے اٹھی تو لاریب کو اپنا منتظر پا کے حیران رہ گئی تھی۔

''اماں آپ جاگ رہی ہیں اب تک......؟'' اس نے جائے نماز رکھا اور ان کے ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگائے۔

''آپ بھی تو جاگ رہی ہو بیٹے! بس دل کیا آج اپنی بیٹی کے ساتھ کچھ باتیں کروں تو چلی آئی۔'' انہوں نے نم آلود آواز میں کہتے اسے ساتھ لگا لیا تو اتباع کی آنکھیں بے اختیار چھلک گئی تھیں۔ کچھ کہے بغیر وہ ان کے کاندھے پر سر ٹکا کر ساتھ لگ کے بیٹھ گئی۔

''میں بابا جان کو سب سے زیادہ مس کروں گی اماں! آپ ان کا ہمیشہ بہت خیال رکھیے گا۔'' اس کی آواز بھیگ رہی تھی۔ لاریب نے اس کا ماتھا چوما تھا۔ سر ہلایا۔

''کہنے کی ضرورت نہیں ہے جان! سب سے قیمتی سرمایہ ہیں وہ ہمارا۔'' انہوں نے ڈھارس دی تھی۔ اتباع انہیں دیکھتی رہی۔

''عبداللہ جتنے خوش ہیں اماں! مجھے اتنا ہی ڈر لگ رہا ہے۔ جہاں تک میں نے محسوس کیا ہے وہ بہت شدت پسند ہیں۔ ایسی شدتیں کبھی بھی دائمی اور پائیدار نہیں ہوتیں۔ آپ دعا کیجیے گا کہ میں ایڈجسٹ کر سکوں۔ انہیں اپنے رنگ میں رنگ سکوں نہ کہ ان کے رنگ میں رنگی جاؤں۔'' لاریب اس کی بات سنتیں سیدھی ہو بیٹھی تھیں۔ اسے محبت سے دیکھا پھر نرمی سے سمجھانے کے انداز میں گویا ہوئی تھیں۔

''آپ جس رنگ میں رنگی ہو بیٹے یہ اللہ کا رنگ ہے۔ یہی پیارا رنگ ہے بلاشبہ...... مگر تمہیں ایک بات یاد رکھنی ہے۔ صبر پڑھایا تو جا سکتا

ہے۔ سکھایا نہیں جاسکتا۔ صبر سیکھنے کے لیے صبر کرنا پڑتا ہے۔ صبر سے گزرنا پڑتا ہے۔ مفہوم کتابوں سے پڑھا لیں تو جاسکتا ہے۔ بیٹے تقویٰ سیکھنے کے لیے تقویٰ کا کھٹن دشوار راستہ طے کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ وہی کر سکتا ہے جس کے نصیب میں لکھا ہوا۔

مطلب کسی کو ہانک کر...... زبردستی دین کے راستے پر نہیں لایا جاسکتا۔ اصل چیز عمل ہے۔ درگزر ہے۔ معافی ہے۔ یہ ایسے ہتھیار ہیں جو اثر میں بہت تاثیر رکھتے ہیں۔ تمہیں بھی انہی ہتھیاروں سے خود کو آراستہ رکھنا ہے۔ دعا کرنی ہے۔ کبھی بھی زبردستی نہیں کرنی۔ جبر نہیں کرنا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا۔

بیٹے یہ ایک بہت تلخ حقیقت ہے کہ شادی کے بعد بیوی جتنی بھی محبوبہ ہو مگر وہ شوہر کے ہاتھ میں پکڑے ترازو کے جس پلڑے میں جا کر بیٹھتی ہے۔ وہ پلڑا بہت ہلکا ہوتا ہے۔ دوسرے پلڑے میں سسرال والے ہوتے ہیں۔ وہ پلڑا بہت بھاری ہوتا ہے۔ اور کئی سال تک بھاری ہی رہتا ہے۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ بیوی کی برداشت صبر کی بدولت یہ پلڑا بھاری ہونے لگتا ہے۔ پھر سسرال والوں کے پلڑے کے برابر آتا ہے۔ پھر اس سے بھی بھاری ہو جاتا ہے۔ پھر ہمیشہ بھاری ہی رہتا ہے۔ فضا میں معلق نہیں رہتا۔ زمین سے لگا رہتا ہے۔ لیکن توازن نہیں کھوتا۔ یہ کام صرف اور صرف عورت کا صبر کرتا ہے۔ برداشت کرتی ہے۔ قربانی کرتی ہے۔ اس بات کو ہمیشہ سمجھانے کا مطلب یہ بھی نہیں کہ عبداللہ یا بھائی و بھائی جان میں سے مجھے کسی کی بھی جانب سے تمہارے ساتھ بدسلوکی یا بے انصافی کا خدشہ ہے۔ تم من چاہی ہو۔ لاڈلی ہو، اس کے باوجود اگر عورت میں برداشت صبر نہ ہو تو دلوں سے اترنے میں دیر نہیں لگتی۔ اور میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ میری بیٹی کو خدانخواستہ معمولی سا بھی دکھ پہنچے۔ کیونکہ بیٹے یہ بھی سچ ہے کہ مرد کے ساتھ تو صرف دو عورتوں کا رشتہ ہوتا ہے۔ ایک وہ...... جس کے بطن سے وہ جنم لیتا ہے۔ اور دوسری وہ لڑکی جو اس کے وجود سے دنیا میں آتی ہے۔ باقی تمام عورتیں تو سورج کی روشنی کی مانند ہوتی ہیں کچھ دیر مرد کی ذات اس میں گرم اور روشن رہتی ہے۔ اس کے بعد اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اندھی رات کا اندھیرا...... تابنا کی عورت کی وفا...... ایثار اور محبت میں مضمر ہے۔ جتنا ایثار محبت اور وفا ہوگی وہ اتنی ہی زیادہ مرد کے دل کے قریب رہے گی۔ مرد کبھی بھی یہ پسند نہیں کر سکتا کہ اس کی ذات پر کسی دوسرے فریق کو اہمیت دی جائے۔ وہ دوسرا عورت کا باپ بھائی ہی کیوں نہ ہو۔ بیٹے تم آج سے پرائی ہو رہی ہو تو سمجھ لو...... ہم سب کے حقوق تم پر معاف ہوئے اور شوہر کے شروع...... اگر شوہر اپنی زوجہ کو یہ حکم بھی دے کہ وہ اپنی والدہ سے نہیں ملے گی چاہے صورت حال یہ بھی ہو کہ اس کی ماں مر کیوں نہ جائے تو بیوی کو گھر سے شوہر کی اجازت کے بغیر قدم نکالنے کا حکم نہیں ہے۔ یہ شریعت ہے ہماری۔ اللہ نے شوہر کے اتنے حقوق رکھے ہیں۔ مزید یہ کہ اگر شوہر بیوی کو یہ حکم دے کہ وہ رات بھر اسے پنکھا جھلتی رہے تو بھی عورت کو انکار کی مجال نہیں۔ میں جانتی ہوں...... میری بیٹی یہ سب باتیں جانتی ہے مگر دہرانے کا مقصد یاد دہانی ہے۔ ان باتوں کی اہمیت واضح کرنا ہے۔

''آپ فکر نہ کریں اماں! میں انہیں کبھی بھی کسی بھی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔''

اتباع حجاب آمیز انداز میں سر جھکائے سن رہی تھی۔ آہستگی سے بولی تھی۔ لاریب نے مسکرا کر

اس کا روشن چہرا محبت سے دیکھا پھر اس کی آنکھوں کو چوم لیا تھا۔

''اللہ میری بیٹی کا نصیب بھی اس کی صورت جیسا تابناک رکھے ہمیشہ آمین۔'' اتباع کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ لرزنے بھی لگیں۔

''آپ آج یہاں سو جائیں اماں! میرے ساتھ......'' وہ ان کا ہاتھ پکڑے پکڑے ان کے ساتھ لگ کر لیٹ گئی۔ لاریب نے کچھ نہیں کہا۔ اپنا دوسرا بازو بھی اس کے گرد لپیٹ دیا تھا۔ دونوں خاموش تھیں۔ دونوں کے دل اک ساتھ دھڑک رہے تھے۔ دونوں کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ جدائی کا احساس دونوں کی افسردگی کا باعث تھا۔

(میں تو بن گیا ہوں۔ اور تو میں بن گیا ہے۔ میں تن ہوں اور تو جاں ہے۔ بس اسکے بعد کوئی نہ کہے کہ میں اور ہوں اور تو اور ہے)۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے باوجود ہونٹوں پر بہت دلفریب بہت روشن مسکان کا بسیرا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور اپنے برابر لیٹے ہوئے عبدالعلی کو دیکھا۔ جو اس کی جانب متوجہ تھا۔ عبدالعلی کی نگاہوں میں تبسم تھا، شرارت تھی۔ قدر کی نظروں میں حجاب تھا۔ گریز تھا، اس کی پلکیں بالآخر جھک گئیں۔ صبح جب وہ نماز کے لیے اٹھا...... غسل کرنے سے قبل کرنے کے بعد...... مسجد جانے سے پہلے بار بار اسے جگایا تھا نماز کے لیے...... وہ نیند میں تھی۔ غنودگی میں ہوں ہاں کرتی رہی۔

''یار نماز قضا ہو جائے گی کیا کرتی ہو؟'' عبدالعلی جاتے جاتے اس پر تنا کمبل کھینچ کر نرمی سے جھنجلایا تھا۔

''اٹھ رہی ہوں بس...... ڈونٹ وری۔'' اور عبدالعلی واقعی بے فکر ہو کر مسجد چلا گیا تھا۔ مگر جب حسب عادت نماز کے ساتھ جوگنگ کر کے بھی لوٹا۔ تو اسے ہنوز بستر میں سوتے پا کر غصے اور جھنجلاہٹ کی شدید لہر اس کے اندر دوڑ گئی تھی۔ مگر کچھ کہتے کہتے تھم گیا تھا۔ اسے لاریب کی ایک ایک بات یاد آئی۔ جو انہوں نے پرسوں بالخصوص اس سے شیئر کی تھی۔ اپنی زندگی کا اک اک لمحہ......

''کیا شک تھی بیٹے! کہ میں بہت لادین تھی۔ بالکل اندھی...... فیشن ایسا تھا لباس بھی کہ تم اب بھی تصور نہیں کر سکتے۔ مگر پھر اللہ نے ہدایت کے لیے چنا تو عبدالغنی کو میرے نصیب میں لکھ دیا۔ جو کبھی ٹوکتے نہیں تھے۔ جو کبھی منع نہیں کرتے تھے۔ انہیں ضرورت ہی نہیں تھی۔ اللہ نے انہیں عمل میں اتنا پاورفل اور مضبوط بنایا تھا کہ یہ عمل تسخیر کرتا تھا۔ میں بھی تسخیر ہوتی گئی۔ قدر...... کی عادات اور مزاج کچھ کچھ مجھ جیسا ہے۔ یعنی وقت پلٹ کر بہت پیچھے چلا گیا ہے۔ اللہ نے اک اور عبدالغنی اور لاریب پیدا کیے ہیں۔ عبدالغنی کو پھر موقع ملا ہے کہ وہ ثواب کما لے۔ جنت خرید لے۔ اللہ کو راضی کر لے۔ اور یہ رضا نرمی محبت اور عمل کی نرمی کے سوا کسی اور چیز میں مضمر نہیں ہے۔''

لاریب کی الفاظ کی بازگشت سے اس کے ذہن کے ایوانوں میں اتری تھی۔ اور جیسے اندر کا اشتعال دھیما پڑتا گیا۔ چہرے کے تنے ہوئے عضلات معمول پر آئے تھے۔ وہ آ کر بستر پر اس کے مقابل لیٹا تو ہاتھ بڑھا کر قدر کے ریشمی بے حد سلکی بالوں میں پھنسا دیے۔ اس کا لمس قدر کے لیے جادوئی اثر رکھتا تھا۔ جبھی اس نے آنکھیں کھول دیں تھیں۔ شرگیں نظریں دہکتے گال......

وہ جیسے ہنوز اپنی سحر زدہ نظروں کے حصار میں قید تھی۔ عبدالعلی نے جھک کر سائیڈ سے الارم کلاک اٹھایا اور اس کے سامنے کر دیا۔

''اب اٹھ جاؤ، تمہیں تیار بھی ہونا ہے اور اماں ناشتہ تقریباً مکمل بنا چکی ہوں۔'' قدر کو یکدم جھٹکا لگا تھا ٹائم دیکھتے ہوئے۔ اس نے گھبرا کر بوکھلا کر عبدالعلی کو دیکھا اور خفت و خجالت کے شدید احساس سمیت سرخ پڑنے لگی۔

''نماز...... قضا ہو گئی ہے علی......'' اس کا لہجہ متاسفانہ تھا۔ عبدالعلی نے گہرا سانس بھر لیا۔

''سوری عبدالعلی! آئندہ ایسا نہیں ہوگا پرامس۔'' اس کی خفت بڑھی۔

''کیا تم صرف اس وجہ سے شرمندہ ہو قدر کہ میں نے تمہیں نماز کا کہا تھا...... جبکہ اللہ کا زیادہ حق ہے کہ میری بجائے تمہیں اس کی پرواہ ہو، اس کی ناراضگی کی...... اس کے خوف کی۔'' عبدالعلی کا لہجہ و انداز ناصحانہ تھا۔ قدر چند لمحوں کو ساکن رہ گئی۔ اس کا گلابی چہرہ سرخ پڑا تھا۔ یہ سرخی خفت و خجالت کی تھی۔

''ٹھیک کہا آپ نے...... میں اللہ سے معافی مانگتی ہوں۔''

''بالکل...... اور اللہ بہتر معاف کرنے والا ہے۔'' عبدالعلی مسکرایا تھا۔ اور اس کا سر تھپکتا اٹھ کر باہر چلا گیا۔ قدر کپڑے اٹھائے واش روم میں گھس گئی۔ نہا کر باہر آئی تو اتباع کو اپنا منتظر پا کر بے ساختہ جھینپ گئی تھی۔

''ماشاء اللہ! بہت چمک رہی ہو۔ میں اندازہ کرنے آئی تھی۔ بھائی جان سے صلح ہوئی۔'' اس کا انداز شرارتی تھا۔ قدر کی شرگیں مسکان مزید گہری ہوئی۔ جھٹک کر بال تولیے سے آزاد کیے اور اسے اک نظر دیکھا۔

''تو پھر کیا اندازہ کیا؟''

''اب کیا بتاؤں میں، بس رہنے دو۔ شرم آ رہی ہے۔'' اتباع بھی شرارت پر اتر آئی۔ قدر نے گھور کر اسے دیکھا۔

''چلو کوئی بات نہیں، کل بتا دینا۔ یہ شرم کل تک اُتر جائے گی۔'' وہ سکون سے کہہ کر برش اٹھائے بال سلجھانے میں مگن ہوئی تھی۔ جبکہ اتباع کا شرم سے برا حال ہو کر رہ گیا تھا۔

''بدتمیز...... بہت زیادہ بدتمیز ہو تم۔'' وہ اتنا جھینپی تھی کہ اسے مارنے کو لپکی۔ قدر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''نہ...... نہ میری جان! یہ ڈائیلاگ تمہیں...... عبداللہ بھائی کے لیے سنبھال کر رکھنے چاہئیں۔'' اتباع کا چہرہ یکلخت تپ کر لو دینے لگا۔ وہ اب کی بار کچھ نہیں بول سکی تھی۔ الٹے قدموں واپسی کو مڑی تو قدر نے بے اختیار پکار لیا تھا۔

''کہاں بھاگ رہی ہو یار...... میں بہرحال عبداللہ صاحب نہیں ہوں جو تمہارے چھکے چھڑا دوں۔'' وہ ہنوز شرارت پر آمادہ تھی۔ اتباع کا شرم اور کوفت سے برا حال ہونے لگا۔

''چھکے تو مجھے لگتا ہے تم نے میرے بھائی کے بھی چھڑوائے ہوں گے۔'' وہ جھنجلا کر بولی تو قدر زور سے ہنس دی تھی۔ پھر آہ بھر کے بولی تھی۔

''کہاں ایسے نصیب میرے...... محترم نے رارت وہ طبیعت صاف کی کہ بتا نہیں سکتی۔ زندگی بھر کبھی اتنا نہیں تڑپی ہوں گی جتنی منتیں رات کروالیں۔ ساری شرطیں منوالیں۔ تب منہ سیدھا کیا۔ بڑا ہی اَن رومینٹک بندہ ہے قسم سے......'' اس کا انداز صاف مصنوعی تھا۔ اتباع نے کاندھے جھٹک دیے۔

''مجھے اتنی ہمدردی نہیں ہو سکتی تم سے...... بی

کو زحالات بگاڑے بھی تم نے ہی تھے۔'' قدر کی آنکھیں پھٹ سی گئیں تھیں اس طوطا چشمی پر، پھر سرد آہ بھری۔

''کیا شکوہ کرنا..... یار تم بہن بھائی ہو ہی ایسے روکھے خشک اور سرد..... البتہ عبداللہ بھائی سے ہمدردی ضرور ہے۔ بیچارے وہ بھی میرے جیسے..... بے بس لاچار ہوں گے تمہارے سامنے تمہاری مرضی کے تابع جیسے میں تمہارے بھائی جان کی شکل کے زاویے گنتی پر کھتی رہتی ہوں۔'' مسکراہٹ ضبط کرتی وہ شریر انداز میں مسلسل شگوفے چھوڑ رہی تھی۔ اتباع کا چہرہ البتہ دہکنے لگ گیا تھا۔

''غلط فہمی ہے خاصی محترم کے متعلق..... ہرگز اتنے شریف نہیں۔ جب من مانی پر اترتے ہیں تو کسی کی پرواہ نہیں کرتے۔'' وہ کچھ غصے میں کچھ جذباتیت میں کہہ گئی تھی۔ مگر قدر کے چہرے پر پھیلتے حیرانی..... بے یقینی اور پھر خوشگواریت کے تاثر کو دیکھتے یکدم اپنی غلطی کا احساس جاگا تو سٹپٹائی، گڑبڑائی وہاں سے بھاگنے کو تھی کہ قدر نے بے اختیار لپک کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ اور شوخ و شنگ مسکان سمیت چمکتی نظروں سے اسے آنکھیں بچا کر دیکھنے لگی۔

''کیا کہا تم نے.....؟'' وہ ہنس رہی تھی۔ کھلکھلاتے لہجے میں استفسار کیا۔ اتباع کی جان پر بن آئی تھی۔ نظریں چراتی، حجاب سے سرخ پڑتی وہ بے حد پیارا روپ لیے سامنے تھی۔

''کچھ نہیں.....'' اتباع کوفت آمیز حجاب سے جھنجلا کر بولی۔ نظریں ہنوز چار کرنے سے ہچکچا رہی تھی۔ قدر زور سے ہنسی اور اسے یکدم بازوؤں میں بھر لیا۔

''شادی کے لیے ایسے ہی منایا ہوگا نا انہوں نے..... غیر مہذبانہ دھمکیاں دے کر..... من مانی کے عملی ثبوتوں سے..... ہے ناں.....؟'' وہ اس کا حجاب آمیز کترایا، جھینپا، سٹپٹایا ہوا روپ نظروں میں تول رہی تھی۔ اتباع کا شرم سے چہرہ تپنے لگا۔ کچھ کہے بغیر وہ اس کا حصار توڑ کر فاصلے پر ہوئی۔

''بکو مت..... اور اپنا کام کرو بجھیں۔'' وہ اسے ڈانٹ رہی تھی۔ قدر نے منہ لٹکا لیا۔

''دیکھو ذرا ہمارے میاں صاحب کو..... بجائے اس کے تیاری میں مدد دیتے۔ خود غائب ہو گئے۔ ارے ظالم لڑکی تم ہی رُک جاؤ کچھ دیر کو..... مجھے ناشتے کی ٹیبل پر تم ہی لے جانا۔ کہاں میں ایک رات کی دلہن اکیلی آتی اچھی لگوں گی بھلا.....'' بال سلجھا کر عجلت میں لپ اسٹک لگاتی وہ مصنوعی احتجاج بلند کر رہی تھی۔ اتباع نے اس کا واویلا سنا تھا اور گہرا سانس بھرا۔

''ایک رات کی دلہن یا ایک رات کی بچی.....! جس سے چلنا محال ہے۔ رکو میں عبدالہادی انکل کو بھیجتی ہوں۔ گود میں اُٹھا کر تمہیں ناشتے کی میز پر لائیں گے۔ پھر تو بڑی اچھی لگو گی تم۔'' اتباع نے اپنی طرف سے اسے شرمندہ کرنا چاہا۔ مگر وہ بھلا تھی کہ پروں پر پانی پڑنے دیتی۔ بجائے خاموش ہونے کے الٹا دانت نکالنے شروع کر دیے۔

''چچ چچ..... کر دیا نا اپنے اَن رومینٹک ہونے کا ثبوت فراہم۔ ارے بیوقوف لڑکی اگر ایسا احسان کرنا ہی ہے تو میرے پاپا کو زحمت دینے کے بجائے اپنے بھائی جان کو بھیج دو۔ اس طرح ہماری یہ حسرت پوری ہو جائے گی ایک آدھ فلمی سین کی..... ورنہ محترم سے تو توقع نہیں۔'' بے حجابی کا ایسا شاندار مظاہرہ ہوا تھا کہ اتباع ہی خفت و خجالت سے سرخ پڑ گئی تھی۔ اور

متاسفانہ انداز میں سر جھٹکتے اسے گھورنے کا فریضہ انجام دیا۔

''بدتمیز...... بالکل بے شرم ہو۔ تم سے سدھرنے کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔'' وہ جھلاتی ہوئی دروازے سے نکلی تھی۔ قدر مسکراتی گنگناتی ہوئی کانوں میں بندے پہن رہی تھی۔

☆......☆......☆

یہ دن بہت مصروف ہنگامے اور افراتفری کا تھا۔ ولیمہ کی تقریب اور اتباع کی بارات ایک ساتھ تھی۔ قدر سلور کلر کے انتہائی شاندار لباس میں ایسا روپ لیے تھی کہ نگاہیں چندھیا رہی تھیں اس کی جگمگاہٹ کے سامنے اس کے برعکس عبدالعلی کی تیاری بہت سادہ و نفیس تھی۔ سفید کھدر کا عام سا شلوار سوٹ اس پر سیاہ ویس کوٹ اس کے باوجود وہ جیسے یکدم ہر کسی میں نمایاں ہوگیا تھا۔ آرمی کٹ ہیئر اسٹائل کلین شو...... بڑی بڑی سحر طراز آنکھوں میں موجود رہنے والے سرخ ڈورے جو اس کی آنکھوں کو دلکشی و خوبصورتی کو بے تحاشا حسین بنا کر دکھاتے تھے۔ اس پر ان میں بسی سنجیدگی متانت اور بردباری...... وہ مردانہ وجاہتوں کا بہترین شاہکار تھا۔ غضب کی دراز قامت اور کسرتی وجود وہ تمام تر سادگی کے باوجود بھی نمایاں تھا۔ ٹھٹکا دینے والی پرسنالٹی کے باعث...... اتباع کا آج کے دن کا لباس اسکائی بلیو کلر کا تھا۔ اتنا بیش قیمت کہ لباس کو دیکھ کر ہی دل خوش ہوا جاتا تھا۔ اور جب وہ اتباع کے ترشے ہوئے مومی سراپے پر سجا تو صحیح معنوں میں گویا قیمت وصول ہوئی تھی۔ وہ پارلر نہیں جانا چاہتی تھی۔ جبکہ عبداللہ کی خواہش تھی وہ پارلر سے تیار ہو۔ خاصی بحث و تکرار کے بعد وہ بہت ساری شرائط پر پارلر جانے پر آمادہ ہوئی تھی۔ بغیر تھریڈ اور بالوں کی کٹنگ کے محض میک اوور کے لیے۔ عبداللہ نے گہرا سانس بھرتے انہی شرائط پر صبر کر لیا تھا۔

''ٹھیک ہے قدر! تم انہیں کہو وہ ایسے ہی تیار ہو جائیں۔ ویسے بھی انہیں تھریڈ کروانے کی ضرورت نہیں ہے۔ فیس نیٹ اینڈ کلین ہے۔ بال بھی کٹنگ نہ ہوں گے تو اچھے لگتے ہیں۔'' چونکہ اتباع نے قدر کے سامنے بات کرنے یا پھر اس موضوع پر بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جبھی قدر کو یہ کام کرنا پڑتا تھا۔ عبداللہ کے جواب پر وہ مسکراہٹ دبا کر اتباع کو تکنے لگی تھی۔

''بہت خوب! چلیں یہ تو میں اتباع سے ہی پوچھ لوں گی کہ آپ نے کب اسے اتنا قریب سے اور تفصیلی دیکھا کہ چہرے کے نیٹ اینڈ کلین ہونے کا بھی پتا چل گیا اور بالوں کی خوبصورتی کے بھی راز کھل گئے۔ جبکہ محترمہ ہر وقت لپٹی سمٹی رہتی ہیں۔ آپ بس یہ ذرا غور سے سن لیں کہ...... مجھے صرف قدر کہنے پر آج سے پابندی لگی۔ بھابی یا پھر قدر بھابی کہہ لیا کیجیے۔ ہمارے صاحب بہادر کو برا لگ سکتا ہے۔ اور ہم ان کی مرضی کے خلاف نہیں چل سکتے۔ اور تم نہیں...... آپ...... آ کر کو اب میرا رشتہ بڑا ہو گیا ہے۔ اتباع کی بڑی بھابی ہوں میں۔''

ناز سے گردن اکڑاتے وہ بڑے اعتماد اور کسی حد تک شوخی سے بول رہی تھی۔ اتباع کو ہنسی دبانا محال ہوا جا رہا تھا۔ دوسری جانب عبداللہ بھی بے ساختہ و بے اختیار قہقہہ لگانے میں مصروف ہوا تھا۔

''واہ واہ...... کیا انداز بدلے ہیں محترمہ آپ نے...... بھابی کہلوانے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے غالباً اور آپ دنیا کی واحد لڑکی ہوں گی۔ جسے

چھوٹی ہو کر بھی بڑی بننے کا شوق چرایا ہوا ہے۔ یہ سب محترمہ عبدالعلی کی سنگت و قربت کی ہی فیض یابی کہی جا سکتی ہے۔ اور بھلا کیا اور جہاں تک ہماری نصف بہتر کو دیکھنے اور نزدیک و قریب سے دیکھنے کا سوال ہے تو یہ راز کی باتیں ہیں۔ راز رہنے دیں۔ ورنہ ہماری زوجہ خفا ہو سکتی ہیں۔ اور ہم یہ خطرہ کم از کم آج کے دن مول لینے والے نہیں۔ ویسے بھی بات فاصلوں کی نہیں نظر کی گہرائی کی ہوا کرتی ہے۔ جنہیں دیکھنے اور سراہنے کی نگاہیں خواہش مند ہوں انہیں میلوں دور سے بھی پوری جزئیات سے دیکھا جانا اتنا ناممکن نہیں۔ آپ سے کیا پردہ اب بھلا کہ ہماری ہی راہ کی مسافر ہیں نا آپ بھی۔'' گھمبیر لہجے میں وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہا تھا۔ قدر بے اختیار مسکراہٹ دبا گئی۔

''تم کچھ غلط بھی نہیں کہتی تھیں۔ محترم خاصی پہنچی ہوئی ہستی ہیں۔ اب سمجھ لو۔ مجھے واقعی تم سے ہمدردی ہو گئی ہے۔''

فون بند کرتی وہ اتباع کو دیکھ کر جس ذومعنی انداز میں بولی تھی۔ وہ اتباع کی پیشانی سلگانے کانوں کی لوؤں تلک سرخ کرنے کا باعث بنی۔ وہ اتنا جھینپی تھی کہ اس کے کاندھے پر مکے مارتی گئی۔

''بہت بدتمیز ہو تم...... بہت ہی زیادہ......''

وہ لانبی پلکیں جھکاتی خجالت سے چور آواز میں بولی۔ قدر زور سے ہنس پڑی تھی۔

''یہ ڈائیلاگ خاصا پرانا ہو چکا۔ اتنا چارم بھی نہیں ہے۔ اب کچھ اور بھی بولنا سیکھو لو۔ بہت ضرورت پڑنے والی ہے۔ یا ممکن ہے ہمارے بے باک بے شرم بھائی صاحب تمہاری بالکل ہی بولتی بند کر دیں۔'' اس سے قبل کہ اتباع جواب میں کچھ کہہ پاتی۔ دروازہ کھلا اور علیزے کے ساتھ عبدالعلی اندر داخل ہوا تھا۔

''اتباع...... تیار ہو آپ گڑیا......! عبدالاحد گاڑی میں منتظر ہے آپ کا۔ بوجانی ساتھ چلیں گی تمہارے۔'' قدر اگر اس کی سمت متوجہ تھی اور اسے دیکھتی رہ گئی تھی تو وہ صرف اس کے علاوہ باقی ہر طرف متوجہ تھا۔ وہ سرد آہ بھر کر رہ گئی۔ اتباع کچھ نہیں بولی۔ البتہ جھکے سر کے ساتھ آہستگی سے سر ہلا دیا تھا۔

''اُداس نہیں ہوتے ہیں بیٹے! آپ کہیں دور جا رہی ہو نہ انجان لوگوں میں۔ اللہ کا شکر ہے اپنے ہیں اور تم ہمارے بچے سمیت سب کی من چاہی ہو۔ اللہ ہمیشہ نصیب روشن رکھے آپ کا۔'' علیزے نے اس کی پلکوں پر اترتی نمی کو محسوس کرتے ہوئے یہی بے اختیار ساتھ لگا کر تھپکا تھا۔ وہ کچھ کہے بغیر ہی ان کے ساتھ لگ کر سسکیاں بھرنے لگی۔

''کم آن اتباع! میری پیاری سی گڑیا رانی! ایسے کرو گی تو سب اُداس ہوں گے۔ خود کو سنبھالو سویٹ ہارٹ!'' عبدالعلی بھی آگے بڑھا تھا۔ اتباع کے دوسری جانب قدر کے پہلو میں آ کر اس کا سر شفقت و محبت سے تھپکنے ڈھارس بندھا رہا تھا۔ جب قدر ماحول بدلنے اور خاص کر عبدالعلی کی توجہ کی چاہ میں گلا کھنکار کر بولی تھی۔

''ہاں بھئی......! سنبھالو خود کو...... اب دیکھو ناں...... میری بھی تو کل شادی ہوئی ہے۔ میں تو بالکل نہیں روئی اس طرح کہ کس کو پریشان کر دیا ہو۔'' علیزے نے مسکرا کر جبکہ عبدالعلی نے گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا۔ وہ تیار ہو چکی تھی۔ اس کے پہلو میں سجی بنی کرسٹل کی گڑیا کی مانند جگمگاتی وہ ایکدم ساری توجہ حاصل کرنے میں کامیاب تھی۔

وہ آہستگی سے مسکرایا تھا۔
''مگر تمہیں تو خود بہت شوق تھا۔ بہت جلدی تھی تمہیں رونے کی ضرورت بھی کیا تھی۔'' اپنا بازو اس کے کاندھے پر مارتے ہوئے وہ سرگوشی سے مشابہہ، مگر بہت شریر انداز میں گویا اسے چھیڑ رہا تھا دانستہ قدر نے پلکیں اُٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر ناک سکوڑ لیا تھا۔
''اعلیٰ! لوگ سب کچھ جانتے تھے۔ اس کے باوجود ناک سے لکیریں نکلوا دیں۔ پتا نہیں پھر اسے کیا کہنا چاہیے ان کی بے حسی، ظلم یا پھر غیر دلچسپی۔'' ناک کی طرح ہونٹ بھی سکوڑ کر وہ بڑے غصیلے انداز میں جتلانے سے باز نہیں آئی۔ غصہ میں آواز ذرا بلند ہو گئی تھی۔ جبھی عبدالعلی بے ساختہ کھنکارا کہ اتباع کا بیگ اٹھائے اسے چادر اوڑھائیں۔ علیزے نے چونک کر انہیں دیکھا تھا۔ پھر مسکراہٹ دبا کر اتباع کا بازو پکڑے باہر نکل گئیں تو عبدالعلی ایڑیوں کے بل اس کی جانب گھومتا پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ اس کی نظروں میں گرمی بھی تھی۔ تپش بھی آنچ بھی، یہ سارے احساس جذبوں کے تھے۔ محبت کے تھے۔
''کیا کہا تم نے......؟ ذرا پھر سے کہو......؟''
اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو جانے والی قدر کا بازو کہنی سے پکڑ کر ہلکے سے جھٹکے سے اپنے مقابل کیا۔ قدر کے بڑے بڑے جھمکی والے بندے اس کے گالوں کے گرد ہلکورے لیتے اسے بہت انوکھا بہت دلفریب تاثر دینے لگے۔ عبدالعلی کو اس پل اس کے سوا سب کچھ بھولنے لگا۔ قدر کو اس پل اس کی جانب دیکھنا محال تھا۔ چہرہ حجاب سے تپنے لگا۔ گھبراہٹ اس پر وارد ہونے لگی۔ لانبی ریشمی پلکیں گالوں پر محشر بپا کرنے لگیں۔
''مختصراً ظلم کہہ لیں۔'' وہ منمنائی تھی۔
عبدالعلی نے اسے دونوں شانوں سے تھام کر خود سے قریب کرتے سارے فاصلے مٹا ڈالے......
قدر اس کی قربتوں سے اس کے موڈ سے ہراساں ذرا سا کسمسائی اور دونوں ہاتھ اس کے سینے پر رکھ کے دباؤ ڈالتے فاصلے بڑھانا چاہا۔
''ظلم سے ہونے والا آغاز اگر انتہائی محبت پر اختتام پذیر ہو تو پھر الزام تو نہیں بنتا ہے بیوی!'' وہ اسے جیسے کچھ یاد دلا رہا تھا۔ قدر دھک کر بے اختیار چہرہ جھکا گئی۔ ہونٹوں پر بہت دلفریب شرمیلی مسکان اتری تھی۔ جو اسے بہت انوکھا بہت خوبصورت اجلا روپ دینے لگی۔
''لیکن آپ نے اتنے خوبصورت رنگ میں بھنگ تو ڈالا ناں۔ یہ ساری باتیں کسی اور وقت کے لیے بھی اٹھا کر رکھی جا سکتی تھیں۔ اس کی ویس کوٹ کے بٹنوں سے کھیلتی وہ جیسے شکوہ کناں ہوئی۔ عبدالعلی نے اس کا نازک سا سفید مرمری ہاتھ پکڑا اور لبوں سے چھوا تھا۔
''تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر قدر ہماری نوجوان نسل کا المیہ یہی ہے۔ وہ آغاز غلط کرتے ہیں۔ پہلی رات ہی بیوی کو اتنی محبت اتنا مان اتنا سر پر بٹھاتے ہیں۔ اتنے حقوق دیتے ہیں کہ وہ ساری عمر پھر وصول ہی کرتی چلی جاتی ہیں۔ مرد پہلی رات جب اپنی شخصیت کو پس پشت ڈالتا ہے۔ بے جا اہمیت و خاصیت بیوی کو دے کر تو ساری زندگی کے لیے وہ اپنے حقوق صحیح معنوں میں سلب کرا لیتا ہے خود اپنے ہاتھوں...... پھر عورت کبھی سر سے نیچے اترنا اسے اس کے والدین باقی فیملی کو اہمیت دینے کو آمادہ نہیں ہوتی۔ جس سے ماحول معاشرہ اور گھر تباہ ہوتے ہیں۔ مرد اس اتنی سی اپنی غلطی کو سدھار لے...... بیوی کے ساتھ ماں باپ بھائی

بہنوں کے حقوق اوران کے مقامات کو پہچان لے تو پھر ہرگز یہ مشکل پیش نہیں آسکتی۔''

وہ اتنی سنجیدگی اتنی متانت سے گویا تھا کہ قدر حق دق اور کسی حد تک دکھ میں مبتلا ہو کر اسے دیکھتی رہ گئی عبدالعلی نے اس کی شفاف آنکھوں کی سطح پر پھیلتی نمی کو دیکھا تو جھک کر اس کی آنکھوں کو باری باری ہونٹوں سے چھوا تھا۔

''میں جانتا ہوں تم ہرٹ ہوئی ہو...... مگر قدر تمہارے مزاج میں شدت تھی۔ یاد کرو میں کتنی مرتبہ تمہیں سمجھا اور تنبیہ کر چکا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ میں نہیں چاہتا تھا شادی کے بعد اس اہم موقع پر میں تمہیں ذرا سی بھی تکلیف دوں مگر تم نے...... بہت زیادہ بے وقوفی کا ثبوت فراہم کیا۔ قدر میں جتنا میچور ہوں...... جس منصب پر ہوں۔ مجھے ایسی شریک حیات کی ضرورت تھی جو مجھے...... میرے مسائل کو سمجھے۔ میرے قدم سے قدم ملا کر چلے۔ جسے کسی بات کو سمجھانے یا قائل کرنے کے لیے مجھے دماغ کھپانا پڑے۔ تم مجھ سے محبت تو کرتی ہو۔ مگر مجھے محبت سے زیادہ ذہنی ہم آہنگی کی ضرورت ہے اپنی بیوی سے...... محبت اور ذہنی ہم آہنگی میں بس اتنا فرق ہے قدر! کہ جب محبت آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے۔ کچھ نظر نہیں آنے دیتی۔ جیسے تمہیں نظر نہیں آتا تھا سوائے میرے...... یہاں تک کہ امن کے ساتھ میرے تعلق اور احساس کی نوعیت بھی جبکہ اگر ذہنی ہم آہنگی ہو تو مسائل اس لیے پیدا نہیں ہوتے کہ تب آنکھوں میں اترا ہوا ہر رنگ چہرے کے زاویے کا ہر عکس از خود سمجھا دیتا ہے سب کچھ...... میں چاہتا ہوں تم مجھ سے محبت تو کرو ہی...... مجھ پر اعتماد بھی کرو ذہنی ہم آہنگی بھی ہو ہمارے درمیان...... پھر ہماری زندگی ویسی بہترین ہوگی۔ جیسی بابا جان اور اماں کی ہے۔ وہ اس فیملی کے اب تک آئیڈیل کپل ہیں اور قدر میں اس لیے بھی ایسا چاہتا ہوں تمہارے حوالے سے کہ اگر ہم صحیح وقت پر کچھ نہیں سیکھتے تو زندگی وہی سب کچھ غلط وقت پہ بہت سفا کی اور بے اعتنائی سے سیکھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔'' عبدالعلی نے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا تھا۔ قدر کچھ دیر نم آلود آنکھوں میں فخر بھرے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اپنا سر اس کے مضبوط کشادہ سینے پر ٹیک دیا تھا۔

''میری مسکراہٹ میری خوشی میرا سکون آپ کی ذات میں پوشیدہ ہے عبدالعلی! میں آپ سے صرف محبت نہیں کرتی۔ آپ کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ بس آج اس موقع پر...... آپ مجھ سے اک وعدہ کریں۔ حالات کیسے بھی ہوں۔ مجبوری کوئی بھی ہو...... عبدالعلی آپ کبھی دوسری شادی نہیں کریں گے۔ میں مر جاؤں گی عبدالعلی!'' وہ بے اختیار رو پڑی تھی۔ عبدالعلی نے اس کا سر تھپکا اور چہرہ اٹھا کر پھر سے ہاتھوں میں لے لیا۔

''میرے لیے نہیں، نیکی کا ہر کام اللہ کے لیے کرو گی تم۔ ہاں اجر و ثواب میں میں بھی حقدار بنتا رہوں گا۔ جہاں تک شادی کی بات ہے تو یار...... کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوں۔ میں نہ تو بابا جان جتنا سیلف کنٹرول ہوں نہ ہی ان کی طرح منصف و دیانت دار۔ جبھی ایسا نہیں کر سکتا۔ کہ ایک تم جیسی لڑکی کے مطالبے ناز نخرے پورے کروں۔ تمہیں خوش رکھ لوں تو ہی بڑی بات ہوگی۔'' خائف شریر انداز میں باقاعدہ کان پکڑتا ہوا وہ ہنسے جا رہا تھا۔ قدر نے مصنوعی غصے سے اسے دیکھا تھا۔ پھر خود بھی ہنس دی تھی۔ ماحول میں ہر سو محبت بکھر رہی تھی۔

☆......☆......☆

رخصتی کے وقت وہ اتنا روئی تھی کہ خود کو ہلکان کرلیا تھا۔ بریرہ کے سنبھالنے کے باوجود وہ بے قرار ہوئی جاتی تھی۔ اور عبداللہ کا بس نہ چلتا تھا۔ کسی طرح اسے چپ کرادے۔ سجے سجائے مہکتے جگمگاتے گھر میں اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ جہاں اسے لاکر بٹھایا گیا وہاں اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ مردوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ مگر عبداللہ پر تو پابندی نہیں لگائی جاسکتی تھی۔ جس کی آج چال ڈھال رنگ ڈھنگ ہی الگ تھے۔ سرشار سا سرشار تھا وہ۔ اتباع کے چہرے سے اس کی نگاہ نہیں ہٹتی تھی۔ امن جو اتباع کا از سرے نو میک اپ درست کررہی تھی۔ ہنستے ہوئے اس پر فقرے چست کررہی تھی۔ مگر عبداللہ کو پروا کہاں تھی۔

''خوامخواہ دیر لگارہی ہو...... دو منٹ کا کام ہے۔ جو تم سے ہو کر نہیں دے رہا۔'' وہ الٹا امن پر ہی خفا ہونے لگا۔ امن زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

''اللہ اکبر بھائی! آپ بھی نا بہت ہی بے صبرے ہورہے ہیں۔ جائیں کچھ دیر کو باہر جاکر دل بہلائیں۔ ابھی آپ کی دلہن اتنی آسانی سے کوئی نہیں ملنے والی آپ کو۔ اسے ہم نے کھانا بھی کھلانا ہے۔'' اتباع کی جھکی لرزتی پلکوں پر نگاہ جمائے وہ سرد آہیں بھرتا اٹھا تھا۔

''تم ہمیں اکٹھے ہی کھانا دے دو...... اپنے کمرے میں کھالیں گے ہم۔''

''ہاں وہ تو آپ کھالیں گے۔ مگر جو دلہن دیکھنے کو لوگ یہاں مرے جارہے ہیں۔ انہیں پھر گھسنے دیں گے آپ اپنے کمرے میں......؟'' وہ چڑ گئی تھی۔ عبداللہ نے اسے گھورنے پر اکتفا کیا۔ اور بڑھ کر فل سائز ڈیک آن کیا تھا۔ اپنی مرضی کی کیسٹ منتخب کرکے۔

''چونکہ آج ان سے الگ ہو کر خود کو بہلایا نہیں جاسکتا۔ جبھی یہیں پر جو بھی شغل ہوگا سو ہوگا۔''

دانتوں کی نمائش کرتے اس نے وضاحت بھی پیش کردی تھی۔ امن کھسیا کر خود بھی ہنس پڑی۔

امن نے اس کا دوپٹہ سیٹ کرکے اسے بٹھایا اور خود ذرا فاصلے پر ہوئی تو عبداللہ قدم بڑھاتا خود اتباع کے پہلو میں آکر تفاخرانہ انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ جو کوشش ناکام ہوئی کہ وہ بے حد کنفیوژ تھی پلکیں جھکاتے ہونٹ کچلنے لگی۔ عبداللہ کی مسکان گہری بے حد گہری ہوتی چلی گئی۔ اس کی نظریں بہت شوخ تھیں بہت استحقاق آمیز۔

اتباع کو عبداللہ کی نظروں سے زیادہ گانے کے بولوں میوزک کی آواز اور سرتال نے بے چین کیا تھا۔ جب بالکل ضبط کا یارانہ رہا تھا۔ شرم بالائے طاق رکھ کر بالآخر بول پڑی تھی۔

''عبداللہ!'' وہ بولی تو عبداللہ جیسے فنا ہوگیا تھا۔

''حکم جناب......! ارشاد۔'' اس کا لہجہ اس کی نظروں کی طرح شوخ تھا۔ بے قابو تھا۔ بہکتا ہوا تھا۔

''اسے بند کردیں، پلیز۔'' وہ ملتجی ہوئی اور عبداللہ حیران پریشان۔

''کیوں جان...... اتنا تو اچھا لگ رہا ہے۔''

''لیکن یہ گناہ ہے۔'' اتباع کا لہجہ خفگی سمیٹ لایا۔ عبداللہ نے بدمزا ہوتے گہرا سانس بھرا۔

''پلیز اتباع! اتنی پابندیاں نہ لگاؤ۔ تمہاری وجہ سے میں اپنی شادی کو اس انداز میں انجوائے

کر سکا نہ ہی یادگار بنا سکا ہوں جیسے سوچا تھا۔ تم دیکھتی کیسی رشک میں مبتلا کر دیتی ہماری یہ تقریب لوگوں کو...... ایسا فوٹو سیشن ہوتا ایسا ریسپشن ہوتا کہ بس کمال...... اب یہ تھوڑا سا ارمان تو نکالنے دو ناں۔ پھر یہ تو بہت معمولی سا گناہ ہے۔ ہرگز برا نہیں ہے۔ سو ڈونٹ یو وری۔ اس کا سر تھپک کر وہ مسکرایا تھا۔

عبداللہ کا لہجہ و انداز نرم تھا۔ منت آمیز بھی۔ اس کے باوجود اتباع کو اچھا نہیں لگا۔ اس نے بہرحال ناگواری دبالی تھی۔ بولی تو لہجہ قدرے دھیما ضرور تھا مگر پرزور بھی تھا۔

''ایک بات یاد رکھی جانی چاہیے عبداللہ! گناہ ہر صورت گناہ ہی رہتا ہے۔ اسے کسی بھی صورت بہرحال نیکی ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن تب گناہ کا بوجھ بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ جب تاویلیں پیش کر کے اسے درست قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ انسان گناہ کرے اور اس پر شرمسار ہو تو ممکن ہے اللہ اسے معاف فرمادے۔ لیکن گناہ گار خود کو حق پر سمجھے یہ اللہ کو سخت ناپسند ہے۔'' اس کا انداز ناصحانہ تھا۔ عبداللہ جو مسکراہٹ دباتے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہولے سے ہنس دیا۔

''ایسی برائیڈل پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ جو شادی کی پہلی رات ہی اپنے شوہر کے سامنے واعظ کر رہی ہے۔ مگر قسم سے پھر بھی بہت پیاری لگ رہی ہے۔''

اس کا لہجہ اس کی نظریں اس کا انداز کچھ ہی کنفیوژ کرنے کو کافی تھا۔ اتباع بری طرح جھینپ گئی تھی۔ عبداللہ نے اس کے سامنے یہاں بھی سر تسلیم خم کیا تھا اور میوزک آف کر دیا تھا۔ اس کے بعد بریرہ اور امن نے اسے اپنی موجودگی میں اصرار کر کے کھانا کھلایا تھا۔ اگلا مرحلہ ظاہری بات ہے اسے عبداللہ کے کمرے تک پہنچانے کا تھا۔ امن نے اسے سہارا دے کر اٹھایا تھا تو وہ سرتاپا ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ اس کا لباس بار بار اس کے پیروں میں اُلجھتا تھا۔ ایسے میں جب سیڑھیوں کے نزدیک اس کا پیر توازن کھو کر لڑکھڑایا تو امن اسے سنبھالتی خود بامشکل گرنے سے بچی تھی۔

''افوہ بھئی...... تم لازماً گراؤ گی میری بیوی کو چھوڑ دو۔ میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ ہارون اسرار کے ساتھ کچھ فاصلے پر کھڑا اسی سمت متوجہ عبداللہ لپکتا ہوا آیا تھا اور ایک طرح سے امن کو ڈانٹا۔ بریرہ مسکرانے لگی تھیں۔

''خیر اب ایسی بھی بات نہیں ہے بھائی! ہاں اگر آپ خود یہ کام کرنا چاہتے ہیں تو الزام مجھے یا میری کوتاہی کو نہ دیں۔'' وہ کسی قدر شرارت اور خفگی سے بولی تھی۔ عبداللہ سنجیدگی برقرار رکھنے مسکراہٹ دبانے کو کھنکارا۔

''میرا خیال ہے اتباع کا پیر مڑ گیا ہے۔ کیوں اتباع! چل سکتی ہیں آپ؟'' اتباع نے گھبرا کر سر اثبات میں ہلایا تھا۔ جس کا اس نے اپنے انداز میں مطلب اخذ کیا۔

''دیکھا وہ نہیں چل سکتیں۔ بس ہٹ جاؤ تم۔'' اس سے قبل کہ اتباع یا امن کچھ سمجھتیں عبداللہ نے خود بڑھ کر اسے سہارا ہی نہیں دیا۔ اسے بہت نزاکت سے بہت نرمی سے اپنے بازوؤں پر اٹھالیا تھا۔ اتباع ہکا بکا جبکہ باقی سب مسکراہٹیں ضبط کرتے واپس پلٹے تھے۔

''چھوڑیں...... عبداللہ! یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟'' اتباع حواس بحال کر پائی تو بے اختیار مچل کر اس کے بازوؤں سے نکلنا چاہا۔ عبداللہ

نے مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے اس کی یہ کوشش ناکام بناتے اسے سمیٹ کر گویا سینے سے لگا لیا۔

''پیار کر رہے ہیں۔ عبادت کر رہے ہیں، اور کیا کر رہے ہیں۔ گھبراتی کیوں ہیں جانِ من! بڑے بے قرار تھے ہم ان لمحات کے لیے۔ آپ بس خاموش رہیے آج مت تو کیے گا۔''

اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھتے وہ مسکرایا۔ نظریں واری صدقے جاتی تھیں۔ فدا ہوتی تھیں۔ نثار ہو رہی تھیں۔

''میری گردن میں بازو ڈالیے اتباع! خود سے بھی ذرا احساس دلائیں آپ آج اپنی مرضی سے ہم سے قریب ہیں۔'' وہ مسکرایا۔ اور گویا اسے چھیڑا۔ اتباع کی شرم سے بری حالت تھی۔ بے ساختہ نظریں چرا گئی۔ اس کا وجود جو ہولے ہولے کپکپا رہا تھا۔ اب جیسے پھڑ پھڑانے لگا تھا۔ عبداللہ نے اسے بھینچ کر خود میں سمو دیا۔

''ریلیکس سویٹ ہارٹ، مائی لائف!'' وہ شریر انداز میں ہنسا۔ اتباع کچھ اور سرخ پڑ گئی۔ چہرہ جیسے دہک کر آنچ دینے لگا۔

وہ اسے لیے اپنے بیڈ روم میں آ گیا تھا۔ جو اتنی خوبصورتی سے اتنے آرٹسٹک انداز میں سجا ہوا تھا کہ اسے خواب سا محسوس ہونے لگا۔ چھپر کٹ کے گرد گلابی جالی کا پردہ گلابوں کے گلدستوں کی آرائش سرسراتے ہوئے پردے فینسی لائٹس کی چکا چوند جن کی بدولت اتباع کا جگمگاتا وجود جیسے مزید شعاعیں بکھیرنے لگا تھا۔

''میوزک پر پابندی ہے، شاعری پر تو نہیں، میں تمہیں خراج اس طرح پیش تو کر سکتا ہوں ناں.....'' وہ کھلکھلایا تھا۔ اور اسے کسی قیمتی متاع کی مانند مسہری پر بٹھایا۔ اتباع سنبھل کر قدرے فاصلے پر ہوئی اور گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے اپنا دوپٹا درست کرنے لگی۔ جھکی پلکیں حیا بار انداز میں لرزتی تھیں۔ عبداللہ یونہی سرشار سا اٹھا اور لاکڈ دراز کھول کر مخملیں کیس نکال کر اسے دیکھا۔

''بہت کنفیوژ رہا ہوں رونمائی کا تحفہ خریدتے ہوئے اتباع! کچھ بھی تمہارے شایانِ شان نہیں لگتا تھا۔ بڑی مشکلوں سے اور ماما کی ڈانٹ کھا کھا کر یہ خریدا ہے۔ اب بھی کہوں گا یہ اس قابل نہیں مگر اس کی قسمت جاگ اٹھے گی آپ کی کلائی میں آ کر......''

وہ دوبارہ بیڈ پر آ کر اس کے پہلو میں براجمان ہو گیا تھا۔ اتباع تو پور پور سلگ رہی تھی اس کی قربتوں میں اتنی محبتوں اور قدر دانی کے احساس سمیت اس کی پلکیں رب کے حضور اظہار تشکر سے نم ہونے لگیں۔ اس نے ذرا کی پلکیں اٹھا کر عبداللہ کے خوبرو بے حد وجیہہ چہرے کو نم آلود نظروں سے دیکھا تھا۔

''ایسے مت کہیں عبداللہ! اتنی محبت نہ کریں مجھ سے...... مجھے ڈر لگتا ہے۔ اللہ نہ کرے آپ کبھی بدل گئے تو......''

عبداللہ جو بہت دھیان سے بہت توجہ سے اسے سن رہا تھا۔ ایک دم بہت ناراضی سے ایک دم بہت ناراضی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''زندگی ہو تم میری...... میرے لیے سانسوں کی ضمانت...... اتباع اتنی محبت کرتا ہوں کہ آپ مجھ پر حکمرانی کرنے لگیں۔ میں جو کسی کی نظر کا زاویہ بگڑتا برداشت نہیں کرتا تھا۔ آپ نے کتنی مرتبہ مجھے ڈانٹا۔ مجھے وقتی غصہ آتا تھا۔ بعد میں اتنی دیر سکون نہیں محسوس کر سکتا تھا۔ جب تک تمہیں منا نہیں لیتا تھا۔ اتباع...... ! آپ میرے وجود کا حصہ ہو۔ میری سب سے قیمتی متاع...... آپ کو کھو دینے کا سوچ بھی کیسے لوں۔''

اتنی عقیدت، اتنی محبت' اتنا احترام...... اس قدر چاہت ومحبت اور خاصیت اتباع کے جذبات واحساسات پر عجیب سی سرشاری انکساری عاجزی اور تشکر کا غلبہ ایسے چھایا کہ وہ مغلوب ہوتی کچھ بولنے سے قاصر ہوگئی۔ بس کچھ کہے بغیر عبداللہ کا ہاتھ پکڑا تھا۔ اور ایک عقیدت مندانہ بوسہ ثبت کررہا تھا۔ اس کی آنکھیں ہنوز نم ناک تھیں۔ عبداللہ کو کہاں توقع تھی اس کی جانب سے ایسی پیش رفت کی ایسے اظہار کی۔ ایسے خوبصورت جذبے کی، جبھی وہ مسحور ہوکر رہ گیا تھا۔ جذبات کی رو میں بہہ گیا۔ ایسا ہی والہانہ اظہار پھوٹ پڑا تھا اس کے اندر سے۔

''تھینکس اے لاٹ ڈارلنگ! تھینکس فار دس آفر۔ بس اب میں آزاد ہوں کہ تمہیں بتاسکوں میں کتنا بے قرار بے تاب تھا تمہارے لیے وہ اس پر جھکا تھا۔ اتباع ذرا سا بوکھلائی اور پرے سرکنا چاہا۔ عبداللہ نے ہنستے ہوئے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

''نہ......اب اور نہیں میری جان کہ......''

دیکھنا جذب محبت کا اثر آج کی رات
میرے شانے پہ ہے اس شوخ کا سر آج کی رات
اور کیا چاہیے اب اے میرے دل مجروح تجھے
اس نے دیکھا......تو بہ اندازِ دلبر آج کی رات

وہ ذرا تھما...... پھر اپنے مہکتے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیے اور خوشبو بھرے متبسم انداز میں مزید گویا ہوا۔

اللہ اللہ وہ پیشانی سمیں کا جمال
رہ گئی جم کے ستاروں کی نظر آج کی رات
عارضِ گرم پہ وہ شفق رنگ کی لہریں
وہ میری شوخ نگاہی کا اثر آج کی رات

اس کے گریز اور گھبراہٹ کو خاطر میں لائے بغیر وہ محو ومگن تھا۔ جب اتباع نے پھر اسے پکار لیا تھا۔

''عبداللہ! عشاء کی نماز نہیں پڑھی ابھی میں نے......'' وہ مضطرب اور بے چین لگتی تھی۔ عبداللہ نے اُس کے گرد لپٹے بازو مزید کس لیے۔

''اٹس او کے......کل پڑھ لینا ساتھ میں قضا یار......!''

''عبداللہ پلیز! جان بوجھ کر نماز قضا نہیں کرنی چاہیے۔ پھر یہ تو ہماری نئی زندگی کی ابتداء ہے۔ اس کی شروعات اللہ کی ناراضگی و نافرمانی سے نہیں ہونی چاہیے۔'' اتباع نے نرمی سے کہتے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں لیا۔ عبداللہ کچھ بے بس کچھ جھنجلایا ہوا اسے تکنے لگا۔ پھر گہرا طویل سانس بھر کے خود کو کمپوز کیا تھا۔

''او کے فائن! تم پڑھو...... میں ویٹ کرتا ہوں۔'' وہ ایسے بدلا گویا اپنی کوفت دبا رہا ہو۔ اتباع نے تشکرانہ نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ زیورات اتارتے میک اپ صاف کرتے اس کی نظریں عبداللہ پر بارہا مرتبہ اٹھی تھیں۔ جو سخت بے زار اور اُکتایا ہوا لگنے لگا تھا۔

''اس طرح فضول میں ٹائم ضائع کرنے سے بہتر ہے آپ بھی نماز پڑھ لیں عبداللہ!'' لباس تبدیل کرکے وہ وضو کرکے دوبارہ کمرے میں آئی تو کہے بغیر نہیں رہ سکی۔ عبداللہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ تازہ کھلے ہوئے گلاب جیسا نکھرا ہوا چہرا اس پر ٹھہرے پانی کے شفاف قطرے گویا شبنم کے موتی...... وہ پہلے تو جو غضب ڈھاتی تھی جو یہ روپ تھا۔ وہ سحر زدہ سا ہونے لگا۔

''وضو کر آئیں......'' اتباع جائے نماز بچھا

رہی تھی۔
''یار میں نے دن بھر کوئی ایک نماز بھی نہیں پڑھی۔'' عبداللہ نے کسی قدر شرمندگی سے جواب دیا تھا۔
''کوئی بات نہیں، یہ تو پڑھ لیں۔'' اتباع مسکرا رہی تھی۔
''یار صبح سہی، تم مجھے جگا دینا۔'' وہ کترایا تھا۔
''وہ تو جگاؤں گی انشاء اللہ! ابھی بھی پڑھیں نا میرے ساتھ۔'' اس کے لہجے میں اصرار بھی تھا بے چینی بھی، عبداللہ یہاں بھی اس کی بات رد نہیں کرسکا۔ چار و ناچار اُٹھ کر وضو کرنے گیا تھا۔ اتباع اس کی منتظر تھی باقاعدہ جائے نماز بچھائے۔ عبداللہ نے حیرت سے جائے نماز کی ترتیب کو دیکھا۔
''یہاں آ جاؤ نا میرے برابر......'' سر پر ٹوپی نہ ہونے کی بنا پر رومال باندھتا ہوا وہ شرارت سے مسکرایا۔
''نہیں، جائز نہیں ہے عبداللہ! آپ آگے پڑھیں گے۔ میں آپ سے کچھ ہٹ کر آپ کے پیچھے۔'' اتباع کی سنجیدگی بھی دلنشین لگتی تھی۔ عبداللہ کو حیرت نے آن لیا۔
''بٹ وائے......؟'' وہ جز بز ہوا۔
''یہ پابندی کیوں لگا رہی ہو یار! بیوی ہو تم میری۔''
''ناٹ ڈاؤٹ...... مگر یہ پابندی میری نہیں ہمارے رب کی ہے۔ عبداللہ! مرد و عورت چاہیے میاں بیوی ہو یا ماں بیٹا کیوں نہیں۔ مگر وہ اکٹھے نماز نہیں پڑھ سکتے۔ اس سے دونوں کی نماز فاسد ہو جاتی ہے۔'' اتباع رسان سے آگاہ کر رہی تھی۔ عبداللہ نے سر کو اثبات میں ہلا دیا۔ نماز کی ادائیگی کے دوران اتباع خاص کر ہر شے ہر احساس سے غافل اور بے نیاز ہو گئی تھی۔ نماز کے بعد اس نے دعا کو ہاتھ پھیلائے تو رب کی حمد و ثناء کے بعد ان لاتعداد نعمتوں کا شکر بجا لانے لگی تھی۔ جو رب نے عطا فرمائی ہیں اور انسان کا بس بھی نہیں کہ گنتی کر سکے۔
''یا اللہ! رحمٰن یا رحیم! تیرا یہ بندہ جو تیرے دربار میں آج تیرے حکم پر میری خواہش کے مطابق پیش ہوا ہے۔ اس کے دل میں اپنی محبت اپنی چاہت پیدا فرما دے۔ تیرا انتخاب ہوا جبھی یہ میرے شریکِ حیات ہوئے ہیں۔ میں تیرے فیصلے پر دل سے راضی بارضا ہوں۔ ان کی ہمراہی میں میرے لیے اپنے راستوں کو آسان بنا دے آمین۔''
''ہار......! بس کرو اور کتنی دعائیں مانگو گی۔ مجھ سے اور انتظار نہیں ہو رہا ہے۔'' عبداللہ جو کب سے فارغ ہوا اس کا منتظر تھا۔ بالآخر بول پڑا۔ اتباع نے چونک کر اسے دیکھا۔ اور نا چاہتے ہوئے بھی منہ پر ہاتھ پھیر لیا۔ جائے نماز تہہ کرتے اس کے چہرے پر پلکوں پر حیا کا تاثر بکھرنے لگا تھا کہ عبداللہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر خود سے قریب کر لیا تھا۔

☆......☆......☆

یہ رات خوابوں جیسی تھی۔ خیالوں جیسی...... اتنی کہ وہ خوبصورت مشکرانہ احساسات کے ہمراہ لمحہ بھر کو بھی پلک نہیں جھپک سکی۔ عبداللہ کے سو جانے کے بعد اس نے آہستگی سے بستر چھوڑتے عبداللہ کے اوپر کمبل درست کر دیا تھا۔ خود غسل کیا تھا اور بالوں کو سلجھانے کے بعد کچھ ہی میں جکڑا پھر جائے نماز پر آ گئی تھی۔ تہجد کی ادائیگی کے بعد اس نے وہ ساری دعائیں پوری تسلی سے رب کے حضور پہنچائی تھیں۔ جو عشاء کی نماز کے بعد رہ گئی تھیں۔ فجر میں کچھ ٹائم تھا جبھی وہ تلاوت

میں مشغول ہوگئی تھی۔ وہ ساری سورۃ جو اسے یاد تھیں اس نے وہیں جائے نماز پر بیٹھے مدھم آواز میں تلاوت کی تھیں۔ اسی دوران فجر کی اذان کی آواز فضا میں بلند ہونے لگی تو وہ اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ عبداللہ کو جگانا ایک مشکل مرحلہ ثابت ہوا تھا۔ نیند بہت گہری اور پکی تھی اس کی جو ٹوٹتی نہیں تھی۔ اتباع کو اسے باقاعدہ جھنجھوڑنا پڑا تب اس نے لحہ بھر کو خوابیدہ مخمور آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تھا۔

''اٹھ جائیں عبداللہ!''

''کیا ہوگئی اتنی جلدی صبح یار...... ابھی کچھ دیر اور سونے دو ناں۔'' وہ پھر اوندھا ہوگیا تھا۔ اتباع گہرا سانس بھرتی بیڈ کے دوسری جانب آئی۔

''نماز قضا ہوجائے گی۔ عبداللہ اُٹھ جائیں پلیز!'' اس نے پھر اس کا بازو پکڑ کر جھنجوڑا مگر اب کی بار عبداللہ نے بازو پھیلا کر اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

''جان...... ! تنگ مت کرو ناں۔ آؤ تم بھی سو جاؤ میرے ساتھ۔''

اتباع گھبرا کر تیزی سے فاصلے پر ہوئی۔ اور اب کی مرتبہ اس سے سارا کمبل کھینچ لیا۔

''بس اٹھیں، نماز قضا نہیں ہونی چاہیے۔'' عبداللہ جمائیاں لیتا بند آنکھوں کے ساتھ اُٹھ کر بیٹھا تھا۔

''ریئلی آنکھیں نہیں کھل رہیں یار...... ذرا میرا ہاتھ پکڑو۔ واش روم تک ہی چھوڑ آؤ۔'' اس نے اندھوں کی طرح بازو پھیلایا تھا۔ اتباع سمجھے بغیر جھانسے میں آگئی۔ جیسے ہی سہارا دینا چاہا عبداللہ نے اس کے ہاتھ پر گرفت کرتے اسے ہلکے سے جھٹکے سے پھر اپنے پہلو میں گھسیٹ لیا۔

اتباع کہاں تیار تھی۔ جبھی گھبراہٹ میں منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

کس قدر مدہوش کن تھا ان کے لبوں کا نشہ
یہ تو حوصلہ تھا اپنا پھر بھی جو سنبھل گئے

وہ اس پر جھک کر شرارت سے گنگنایا۔ اتباع کا چہرہ دہک کر بھاپ چھوڑنے لگا۔ اس نے سنبھل کر ہٹنا چاہا مگر عبداللہ نے اس پر اپنا بازو رکھ کر یہ کوشش ناکام بنا دی۔

''ایسی صبح میری زندگی میں کبھی نہیں آئی۔ میں آج دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہوں۔ اور رات......'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر شرارت بھری نظروں میں شوخی سمو کر اتباع کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر بڑی معصوم سی شرگیں مسکان تھی۔ جو اس کے حسین ترین چہرے کو مزید تابناک مزید خوبصورت بنا رہی تھی۔

اس کی وارفتگی میں بے خودی میں اک حسن تھا۔ اک وقار تھا۔ دلکشی تھی، اتباع کو خود پر حیرت ہوئی۔ وہ اک رات میں کتنا بدل گئی تھی۔ وہ جو عبداللہ کی ایسی باتوں سے کتنا بدکتی تھی۔ کتنا جھلتی تھی۔ اب اسے یہ سب برا نہیں لگ رہا تھا۔ بلکہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ چاہے جانے کا دلبرانہ انداز احساس اس کے اندر خوشی انبساط...... تفاخر بھر رہا تھا۔ کچھ کہے بغیر زیر لب مسکراتی وہ عبداللہ کے گھنیرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی تھی۔ جب عبداللہ نے کسی خیال کے تحت تھم کر اس کا چہرہ جانچا۔

''خاموش ہو، برا تو نہیں لگا تمہیں اتباع!'' اور اتباع دھیمے سروں میں ہنس دی تھی۔

''نہیں، میں یہ سوچ رہی ہوں ساری زندگی پاکستان سے باہر رہنے والا بندہ ادب کہاں سے گھول کے پی گیا۔''

''اووف...... آپ کو اتنی نظمیں اتنے اشعار

کیسے یاد ہو جاتے ہیں عبداللہ! وہ بھی حسبِ حال۔'' اور عبداللہ اس تعریف پر گردن اکڑائے اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

'' گھول کر پینے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ تمہیں دیکھا تو جب کبھی کے پڑھے تمام اشعار خود بخود زبان پر مچلنے لگ جاتے ہیں یار!'' اتباع جھینپ کر رہ گئی تھی۔ پلکیں حیا سے بوجھل ہوئیں۔ گالوں پر موجود شفق کا رنگ کچھ اور گہرا ہوتا چلا گیا۔

'' اذان ہوئے بھی دس منٹ ہو گئے ہیں عبداللہ! آپ کی جماعت مس ہو جائے گی ایسے تو......'' وہ نرمی سے ٹوکتی ہوئی اٹھی۔ عبداللہ نے پھر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ نظروں میں شرارت بھی تھی۔ طلب بھی...... اصرار بھی تھا۔ اتباع نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑوا لیا۔

'' میں کپڑے نکال رہی ہوں آپ کے...... بس آ جائیں۔''

'' رہنے دو زوجہ! میں خود نکال لیتا ہوں۔ ایک رات کی دلہن کام کرے مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' وہ ناچار کسلمندی چھوڑ کر اُٹھ کر کھڑا ہوا اور اپنے سلیپر پہننے لگا۔ اتباع مسکرائی تھی اور اس کی شرٹ اٹھا کر اسے تھمائی۔

'' پہلے یہ پہن لیں۔'' عبداللہ نے گردن موڑ کر مسکرا کر اسے شریر نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔

'' ابھی بھی اُلجھن ہو رہی ہے مجھے ایسے دیکھ کر...... حالانکہ اب تو تمہیں عادی ہونا پڑے گا۔ جانتی ہو نا میں شرٹ لازمی اُتار کر سوتا ہوں۔'' اس کا لہجہ معنی خیزی لیے کسی حد تک شوخ تھا۔ اتباع جھینپ گئی تھی۔ بہت خوبصورت رنگ اس کے چہرے پر بکھرے تھے۔

'' مجھے فکر ہو رہی ہے۔ آپ کو سردی نہ لگ جائے۔'' عبداللہ جواباً ہنسنے لگا تھا۔

'' تم بہت پیاری ہو اتباع! مجھے ہرگز تم سے ایسی محبت اور تعاون کی امید نہیں تھی۔ میں سمجھتا تھا تم مجھے بہت ستاؤ گی ہمیشہ کی طرح......'' وہ اس کے ہاتھ سے شرٹ لے کر پہن رہا تھا۔ اتباع نے گہرا سانس بھر لیا۔

'' میں اپنے حقوق پہچانتی ہوں عبداللہ! پھر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مجھے آپ سے محبت ہے۔ ہاں نظریات کا اختلاف الگ بات ہے۔'' عبداللہ مسکرایا اور اس کا گال سہلاتا واش روم میں جا گھسا۔ اتباع اس کا لباس پہلے ہی رکھ چکی تھی۔ جبھی خود جائے نماز بچھا کر نماز کی نیت باندھ لی۔ وہ دعا مانگ کر فارغ ہوئی تھی جب اس نے عبداللہ کو جائے نماز بچھاتے دیکھا تھا۔

'' ارے...... آپ یہاں کیوں نماز پڑھنے لگے ہیں؟''

'' تم نے خود ہی تو کہا تھا تمہارے برابر نہیں پڑھ سکتا۔'' جواباً وہ کتنی سادگی کس درجہ معصومیت سے کہہ گیا اور اتباع کے چہرے پر بے ساختہ مسکان بکھر گئی تھی۔

'' میرا مطلب ہے عبداللہ! آپ مسجد میں جائیں۔ جماعت کے ساتھ نماز ادا کیجیے۔ مرد کی نماز گھر پر نہیں ہو سکتی۔'' اس کے ہاتھ سے جائے نماز لیتی وہ نرمی سے آگاہ کر رہی تھی۔ عبداللہ نے اُلجھن آمیز انداز میں اسے دیکھا۔

'' مگر رات تو تم......''

'' وہ اس لیے کہ تب عشاء کی جماعت نکل چکی تھی۔ آپ قضا ادا کر رہے تھے۔ اب ایسی صورت حال نہیں۔'' اتباع اس کی بات کاٹتی رسان و نرمی سے سمجھا رہی تھی۔ عبداللہ نے کاندھے جھٹکے تھے۔ پھر سر تائیدی انداز میں ہلاتا اسے دیکھ کر مسکرایا۔

''او کے فائن! میری واپسی تک اچھی طرح سے تیار ہو جانا۔ ہم اکٹھے چائے پئیں گے او کے۔'' اتباع جھینپ سی گئی۔ اور محض سر اثبات میں ہلایا تھا۔ اس کی لانبی پلکیں جھک گئی تھیں۔ اور دھیرے دھیرے لرزتی تھیں۔ عبداللہ کے جانے کے بعد اس کا ارادہ اس کی خواہش کے مطابق تیار ہونے کا ہی تھا۔ مگر صوفے پر بیٹھی تو رات بھر کی جاگی آنکھیں پلکیں موندتے ہی کب نیند کی وادیوں میں کھو گئیں اسے ہرگز خبر نہیں ہوسکی۔ ہڑبڑائی اس وقت تھی جب کسی کا لمس محسوس کیا تھا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں تھیں اور عبداللہ کو خود کو اٹھا کر بیڈ پر منتقل کرتے پا کر ایک دم خجالت وخفت سے سرخ پڑ گئی۔

''سوری...... کب آنکھ لگ گئی پتا ہی نہیں چلا۔'' اس نے بکھر جانے والے بال سمیٹتے نظریں جھکائیں۔

''سوری تو مجھے کرنا چاہیے تمہاری نیند خراب کردی۔ لیکن خیر اچھا ہوا تم جاگ گئیں کہ...... میرا دل فریاد کر رہا تھا کہ......

چلو اُٹھ ہی جاؤ اے مجِ حسن جاناں
میں پاگل سا ہو گیا ہوں یوں تجھے دیکھتے ہوئے

اتباع کو ٹوٹ کر شرم آئی۔ رنگ بالکل گلابی پڑ گیا۔ دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔

''اچھا...... اب آپ انکل کے پاس جائیں۔ بو سے ملیں۔ سلام کریں انہیں، میں بھی آتی ہوں۔ اکٹھے چائے پئیں گے ٹھیک......؟'' اس نے اٹھتے ہوئے پروگرام مرتب کیا تو عبداللہ کا چہرہ اتر گیا تھا۔ اس نے خفا نظروں سے اتباع کو دیکھا۔

''اس کا کیا مطلب ہے......؟ یار میں چائے تمہارے ساتھ پینے کا خواہش مند ہوں۔ اور تم وعدہ بھی کر چکی تھیں۔'' اس نے منہ بسور کر شکوہ کا آغاز کیا تو اتباع کو اس معصوم بچکانہ انداز پر ہنسی آنے لگی۔

''وہ وعدہ بھی پورا ہوگا انشاء اللہ! لیکن آج لیٹ ہو گئے ہیں ناں...... تو بس نیچے چلتے ہیں۔ یہ بالکل مناسب بات نہیں کہ ہم خود سے وابستہ اہم رشتوں کو بھول جائیں۔ عبداللہ محبت اہمیت اور احساس سے محبت بڑھتی ہے۔ دیکھیے گا وہ سب کتنے خوش ہوں گے ہمیں دیکھ کر۔'' وہ نرمی سے رسان سے محبت سے اس کا بازو پکڑ کر اٹھانے لگی۔ عبداللہ کے آنکھوں میں موجود شاکی پن گہرا ہونے لگا۔

''کیا ہے یار...... تمہیں مجھ سے زیادہ میرے گھر والوں کی فکر کیوں ہے۔ پریشان نہیں ہو یار وہ ہرگز برا نہیں مانیں گے۔ بی کوز سب جانتے ہیں نئے دولہا دلہن کو زیادہ تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے۔'' اتباع اس کی آخری بات پر کھسیاہٹ کا شکار ہو کر رہ گئی۔ جبھی کچھ پل کو چپ رہی تھی۔

''میں جانتی ہوں یہ سب عبداللہ! مگر زندگی میں دلکشی حسن اور خوبصورتی کے لیے رشتوں کی اہمیت ترتیب بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یہ چیز میں نے بابا جان سے سیکھی ہے۔ وہ کبھی بھی کسی کے حقوق کو سلب نہیں ہونے دیتے۔ دیکھا...... سب کتنی محبت کرتے ہیں ان سے۔ عزت و احترام سے نوازتے ہیں۔ یہ اللہ کے راستوں پر چلنے کا اللہ کی طرف سے انعام کے سوا کیا ہوسکتا ہے۔ میں چاہتی ہوں۔ آپ بھی ایسا ہی طرز اپنائیں۔'' وہ مسکرا رہی تھی۔ عبداللہ سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ اسے اس پل ہارون اسرار کی بات یاد آئی جو انہوں نے مسکرا کر بڑے رازدارانہ انداز میں اس سے کہی تھی۔

(لفظ لفظ مہکتے اِس خوبصورت ناول کی اگلی قسط ماہ مارچ میں ملاحظہ فرمایئے)

شبِ تاریک

"ویسے صہیب کو امی کا تو خیال کرنا چاہیے، تنزیلہ باجی سے ناراضگی اپنی جگہ، مگر امی ابو کو کیوں اکیلا چھوڑ رہا ہے وہ۔" فرحان کو اپنے چھوٹے بھائی کی حرکت پر افسوس تھا۔ امی ابو نے صہیب کا خیال کیا ہم تو تھے ہی برے فرحان...... لیکن صہیب تو بڑا......

"امی آپ کو نہیں پتا، تنزیلہ باجی جب بھی آتی ہیں پورے سال کے لیے گھر میں فساد کھڑا کر جاتی ہیں۔"

"اب کیا ہوا ہے بیٹا، تمہاری پھوپو کا رویہ ٹھیک نہیں ہوا تمہارے ساتھ؟"

"کیسے ہو سکتا ہے امی! جب تک فرح اور تنزیلہ باجی پھوپو کی برین واشنگ کرتی رہیں گی، پھوپو اگر ٹھیک ہونے بھی لگتی ہیں تو فرح ہے نا ماں کا دماغ خراب کرنے والی، اور وہ صہیب تو اپنے آگے کسی کو سمجھتا ہی نہیں ہے کچھ۔"

عائشہ بے حد دکھی تھی۔ ایک سال ہو رہا تھا شادی ہوئے، اور ان بارہ مہینوں میں پھوپو سمیت اس گھر کے ہر فرد نے خوب اصلیت دکھائی تھی اپنی۔

"کیا کر سکتے ہیں بیٹا اب، یہی تمہاری پھوپو ہیں جو تمہاری رخصتی کے وقت رو رو کر تمہارے ابو سے گلے لگی کہہ رہی تھیں۔

"بس اشتیاق، عائشہ اب میری امانت ہے، تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"اور اب دیکھو جی بھر کے خیانت کر رہی ہیں۔" شمیم بیگم بھی اپنی بیٹی کے لیے فکر مند تھیں۔

"مجھے تو سمجھ نہیں آتی، اچھی بھلی ہوتی ہیں پھوپو، لیکن جب تنزیلہ باجی آ جاتی ہیں پنڈی سے، پھوپو کے رنگ ڈھنگ ہی بدل جاتے ہیں۔ اللہ جانے مائیں کیوں اور کیسے اپنی شادی شدہ بیٹیوں اور دامادوں کو بیٹیوں کے گھریلو معاملات میں دخل دینے دیتی ہیں۔ ابھی تو پھوپو کو سمجھ نہیں آ رہی نا، آپ بس ایک بار صہیب اور فرح کی شادی ہو لینے دیں، اگر تنزیلہ اور یاسر بھائی کا یہی حال رہا نا، تو پھر دیکھیے گا کیسے تماشے لگتے ہیں اس گھر میں اور پورا محلّہ دیکھے گا۔ میں اور فرحان تو بے وجہ ہی بدنام رہتے ہیں۔" عائشہ کو بھی عرصے بعد ماں سے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع ملا تھا۔

"نا بیٹی! اللہ ہمارا تماشہ لگوائے نہ ہم کسی کے تماشے دیکھیں...... سب کی بیٹیاں خوش رہیں اپنے گھر میں...... فرحان کا رویہ ٹھیک ہے نا

تمہارے ساتھ...... بس تم ابراہیم کی پرورش میں دل لگاؤ...... اور فرحان کے ساتھ اپنی ساس نندوں کی باتیں نہ کیا کرو۔ تھوڑا صبر سے کام لو، وقت بدلے گا، آج ان کا ہے، کل تمہارا آئے گا۔ آزمائش کا وقت ہے گزر جائے گا۔

''شاید ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں امی آپ...... چلیں میں فون رکھتی ہوں۔ ابراہیم کو بھوک لگی ہے۔ اپنا خیال رکھیے گا آپ...... اللہ حافظ۔''

وقت کے خزانے میں سے یونہی بیش قیمت لمحات پھسلتے جا رہے تھے۔ وہی فرح کی دل جلا دینے والی نظریں...... تنزیلہ باجی جب بھی گرمیوں کی چھٹیوں میں آتی، پوری دوپہر تینوں ماں بیٹیوں کی محفل جمی رہتی، دوپہر کے علاوہ رات کے کھانے کی ذمہ داری بھی عائشہ پر تھی، اور پھوپو جان بوجھ کر سبزی تب لاکر دیتیں جب فرحان کے آفس سے آنے کا ٹائم ہوتا۔ ایسی بہت سی چھوٹی چھوٹی حرکتیں پھوپو کرتی رہتیں، جو حقیقتاً دل چیر دینے والی ہوتیں۔ مگر عائشہ نے بھی سوچ لیا تھا جب صبر کرنا ہی تھا تو واویلا کر کر کے اس نیکی کو ضائع کیوں کرتی، اب وہ امی کو گھنٹہ گھنٹہ فون نہیں کرتی تھی سسرال والوں کی غیبت کرنے کے لیے، پھوپو نے ہمیشہ سے بڑے بیٹے پر چھوٹے کو فوقیت دی۔

بی اے کی جعلی ڈگری سے اُسے پرائیویٹ کمپنی میں بہت اچھی جاب ملی ہوئی تھی۔ میڈیکل فری اور ایک عدد گاڑی بھی سو پھوپو کیوں نہ صہیب کا دم بھرتیں۔ جبکہ فرحان اصل ڈگری کے ساتھ کم تنخواہ پر گزارہ کر رہا تھا۔ بیوی بچے سمیت لہٰذا انہیں بڑے بیٹے سے کوئی خاص ہمدردی نہیں تھی۔

حالات کروٹ لے رہے تھے اور پھر دیکھنے والوں نے تماشا دیکھا اور خوب دیکھا، صہیب اور فرح کی شادی ہوگئی تھی، صہیب اپنا گھر بسانے پر بضد تھا اور فرح اجاڑنے پر، بالآخر وہ دونوں کامیاب ہوگئے، فرح کی شادی اُس کے پھوپو کے بیٹے سے ہوئی تھی اور شادی کے ایک ماہ بعد

ہی اس نے اپنے شوہر پر بانجھ پن کا الزام لگا کر خلع لے لی...... عائشہ کے اب تین بیٹے ہو چکے تھے اور اب فرحان کا ارادہ تھا کہ وہ لوگ اوپر والا پورشن نئے سرے سے بنا کر وہیں رہائش اختیار کر لیں۔

''ویسے صہیب کو امی کا تو خیال کرنا چاہیے، تنزیلہ باجی سے ناراضگی اپنی جگہ، مگر امی ابو کو کیوں اکیلا چھوڑ رہا ہے وہ۔'' فرحان کو اپنے چھوٹے بھائی کی حرکت پر افسوس تھا۔'' امی ابو نے صہیب کا خیال کیا ہم تو تھے ہی برے فرحان......

لیکن صہیب تو بڑا لاڈلا اور فرمانبردار تھا اُن کا، پھر تنزیلہ باجی اور پھوپو نے کیوں کوشش کی صہیب کے بسے بسائے گھر میں آگ لگانے کی......لوگ تو دس دس سالوں تک اولاد کے لیے انتظار کرتے ہیں [illegible] یہاں تو صرف ایک سال ہی ہوا تھا، کیا گزری ہوگی صہیب کی بیوی پر، اپنی ساس اور نند کے منہ سے یہ الفاظ سن کر کہ یہ لڑکی تمہیں اولاد نہیں دے سکتی اسے طلاق دے دو۔ حالانکہ باجی کی اپنی تین بیٹیاں ہیں پھر بھی خدا خوفی نہیں کی انہوں نے......''

''صحیح بات ہے امی کو کم از کم اپنی عقل استعمال کرنی چاہیے، اپنی بیٹی اور داماد کی خوشنودی میں بیٹے سے بیر باندھ رہی ہیں۔ یہی تنزیلہ باجی تھیں جن کے آنے پر صہیب آفس سے چھٹیاں لے لیتا تھا، پورا شہر گھماتا تھا اُن کی بیٹیوں کو اور یاسر بھائی کو اپنا آئیڈیل کہتا تھا۔

''کہنا ہی تھا سگا بھائی تو غریب ٹھہرا اور بہنوئی فزکس کا مشہور پروفیسر اپنی گاڑی، بنگلہ، تلوے تو چاٹنے ہی تھے بہن بہنوئی کے......''

لیکن اب عقل ٹھکانے آئی ہے ساری...... امی نے الگ سے پورے محلے میں عزت گنوائی ہے اپنی فرح کی وجہ سے......اور محترمہ کی اکڑ پھر بھی ختم نہیں ہوئی۔'' فرحان کو بھی یاد تھے اپنے سگے بہن بھائیوں کے رویے، ابو تو شروع سے بے دام کے غلام رہے تھے امی کے، اور امی ہمیشہ سے بڑی بیٹی کی شے پر بہو سے بغض رکھتی آئی تھیں۔

لیکن وقت نے سب کو ایک دوسرے کے سامنے لا کر ایک ایک کی اصلیت دکھا دی تھی۔ چھوٹی بیٹی کی من مانی کی وجہ سے رشتے دار تو چھوٹے ہی تھے، محلّہ والوں نے بھی سلام دعا کرنا چھوڑ دی تھی اور صہیب نے بیوی کو لے کر علیحدہ گھر میں رہنا شروع کر دیا تھا۔

بوڑھے ماں باپ جائیں بھاڑ میں......

شروع شروع میں امی نے نائمہ کے خلاف صہیب کے بھی کان بھرنے کی کوشش کی، صہیب نے کیا دفاع کرنا تھا اُسی بیوی کا...... نائمہ نے ایسی زبان کی ندرت دکھائی کہ ساس صاحبہ کے چودہ طبق روشن ہو گئے اور اوپر کھڑی عائشہ نے بھی کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔ پھر کچھ مہینوں بعد فرح کی شادی اُس کی خالہ کی طرف طے ہو گئی۔

لڑکا نا صرف کنوارہ تھا بلکہ فرح سے دو سال چھوٹا تھا اللہ جانے پھوپو نے اپنی بہن کو کیسے منایا تھا اور بہن نے اپنے بیٹے کو......مگر جو بھی تھا یہ اکیسویں صدی کا معجزہ ہو گیا تھا کہ پورے خاندان میں...... اب امی کو اپنے سے زیادہ بیٹیوں کی فکر تھی کہ اُن کا میکہ چھوٹ رہا تھا۔

تنزیلہ باجی تو اس سال گرمیوں میں آئی ہی نہ تھیں اور فرح نے بمشکل ہفتہ گزارا تھا، پہلے تو سارے خرچے، سارے عیش صہیب کراتا تھا لیکن اب تو وہ اپنی بہنوں کی شکل دیکھنے کا روادار نہ تھا۔

اور پھوپو کو اب بارہ سال بعد پچھتاوؤں نے بڑے بیٹے کی یاد دلائی تھی۔ اکثر و بیشتر وہ اوپر عائشہ کے پاس چلی آتیں۔ فرحان ہوتا تو اس سے صہیب کی شکایتیں کر کے دل کا غم ہلکا کرلیتیں اور کبھی کبھار یوں شرمندہ نظر آتیں جیسے اپنی اور بیٹیوں کی غلطیوں کی تلافی چاہ رہی ہوں۔ فرحان اور عائشہ دیکھتے تھے، مگر بے بس تھے، سو نظریں چرالیتے...... پھر ایک دن پھوپو نے واقعتاً معافی مانگی، لیکن فرحان کے سوالوں نے انہیں لاجواب کردیا۔

''میرے معاف کرنے سے کیا ہوگا امی...... میری زندگی کے وہ سنہری دس سال تو واپس نہیں آسکتے نا، آپ لادیں گی مجھے اور عائشہ کو وہ گزرے دس سال، وہ خوب صورت پل جب ابراہیم کو میری شفقت کی ضرورت تھی لیکن آپ لوگوں کی زیادتیوں کا غصہ میں اس پر نکالتا رہا۔ آپ لوگوں کی دی گئی ٹینشنز کی وجہ سے عائشہ حمزہ اور علی کے ٹائم آپریشن تھیٹر جا پہنچی۔''

فرحان کے لہجے کا دکھ عائشہ کو رلا رہا تھا اور آنسو اب ماں کے دل پر گر رہے تھے۔ وہ اتنا ولی اللہ کہاں تھا کہ اپنی ماں کے لیے جزا و سزا کا فیصلہ کرتا۔ اگر اس کی ماں کو اب بھی اپنی غلطیوں کا احساس نہ ہوتا۔

تو فرحان اور عائشہ کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گزرا وقت واپس کہاں آسکتا تھا، البتہ اُس کی تلخیاں زندہ تھیں۔ لیکن ضروری نہیں ہے کہ جو اذیتیں لوگ آپ کو دیں۔ جو خوشیاں لوگ آپ سے چھین لیں۔ اپنا وقت آنے پر آپ سود سمیت وہ واپس لے لیں۔ گو کہ یہ اب عائشہ کے اختیار میں تھا مگر اس نے یہ اختیار واپس اپنے رب کو سونپ دیا تھا کہ جو شبِ تاریک اُس کے نصیب میں لکھی تھی وہ آزمائش اس نے کاٹ لی تھی۔ اور پھوپو اپنے حصے کی سزا کاٹ رہی تھیں۔

☆☆......☆☆

مکمل ناول

صدف آصف

کس جہاں میں کھو گئے

جب سے گھر میں رشتہ ختم ہونے کی بات ہوئی، اس نے کھانا پینا کم کر دیا، آفس سے واپسی پر بس منہ بنا کر کمرے میں پڑا غمگین غزلیں سنتا رہتا، حالت یہ ہونے لگی تھی کہ وہ اکثر راتوں کو خواب میں ایمل کو دلہن بنا دیکھتا، جو اس سے دور جا رہی ہوتی، وہ ایک دم.....

خواب دیکھنے کے بعد، اس کی من چاہی تعبیر حاصل کرنا بہت اچھا لگتا ہے، پر جس کے سپنے آنکھوں میں سجائے گئے ہوں، اس کا انتظار۔ ہمیشہ کوفت میں مبتلا کر دیتا ہے، ایمل بھی اسی قسم کی کیفیت سے بدمزہ ہوئی جا رہی تھی۔

''کافی شاپ میں داخل ہوتے ہی اس نے، چاروں طرف نگاہیں گھمائیں، عابس علوی کہیں دکھائی نہ دیا۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ موصوف آج بھی حسب روایت لیٹ لطیف ثابت ہوئے۔ ایمل توصیف مجبوراً کونے میں دھری دو افراد کے لیے مختص میز کی طرف بڑھی اور کرسی پر بیٹھ گئی، شدید تنہائی کا احساس جاگا۔ گاڑی کی چابی سے کھیلتے ہوئے اس نے بے دلی سے سب پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ باہر کی سرد فضاء اور یخ بستہ ہواؤں کے مقابلے میں اندر کا نیم گرم ماحول بہت اچھا محسوس ہوا، اس نے ہاتھ میں تھامے ٹشو پیپر سے اپنا چہرہ تھپتھپایا اور مومی انگلیوں سے بالوں کو سنوارنے کی کوشش کی، حلیہ درست کرنے کے بعد کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ اس وقت تو اس کے پاس شاپ میں موجود لوگوں کو خوش گپیوں میں مصروف دیکھنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا، یہاں کی کافی اتنی مزیدار ہوتی ڈھلتی شام کے ساتھ رش بڑھنا شروع ہو جاتا۔ تھوڑی دیر بعد پیروں کو جنبش دیتی ادھر تا کا جھانکی کرنے کے بعد، وہ اس مشغلے سے بھی اکتا گئی۔

''توبہ۔ یہ کہاں رہ گیا'' وہ بالوں کو انگلیوں سے سنوارتی ہوئی بڑبڑائی، ممی کی جلد گھر پہنچنے کی تاکید یاد آئی تو ذہن پر فکر سوار ہونے لگی، آج اس پھوپھو کی پوری فیملی کو انوائیٹ کیا گیا تھا، وہ لوگ ایک جگہ جمع ہو کر شادی کے مختلف معاملات فائنل کرنا چاہ رہے، اسی ضمن میں اس کے گھر پر یہ ڈنر رکھا گیا۔ ایمل اسی وجہ سے یہاں آنا نہیں چاہ رہی تھی پر ساری باتیں ایک طرف اور عابس کی

ضدیں دوسری طرف۔ ایمل کو بے چینی نے آگھیرا۔
''صاحب لگتا ہے یہاں بلا کر خود ہی بھول گئے ہیں۔اگر مجھ سے ایسی کوئی بھول چوک

ہو جاتی تو خوب شور مچایا جاتا ہے۔مگر خود کو تو سات خون معاف ہیں۔نا۔' اس نے جھنجھلا کر براؤن لیدر کے قیمتی بیگ کی زپ کھولی، اس میں سے سیل فون نکال کر ٹائم چیک کیا اور بڑبڑائی

اتنی دیر تو ہو گئی ہے۔ جانے کب آئیں گے؟
اب ایمل پر جھنجھلاہٹ سوار ہونے لگی، عابس کے دیے ہوئے وقت سے تیس منٹ اوپر ہو چکے تھے۔ گھر کی فکر نے الگ ہلکان کیا ہوا تھا۔ سفید نرم مومی پاؤں مسلسل حرکت میں تھے۔ تھک ہار کر کال ملائی، دوسری طرف سے لائن کاٹ دی گئی، وہ بھنا اٹھی۔

کہیں عابس نے مجھے ستانے کے لیے کوئی مذاق تو نہیں کیا۔ اگر ایسا ہوا تو میں اسے چھوڑوں گی نہیں۔'' ایک اندیشہ من میں لہرایا، اس نے مٹھی بھینچتے ہوئے من میں فیصلہ کیا۔

وہ دوبارہ، وقت گزاری کے لیے شفاف شیشے کے دروازے سے لوگوں کو اندر داخل ہوتا دیکھنے لگی۔ اچانک۔ ایک نیا شادی شدہ جوڑا، اندر داخل ہوا، گجرے لگائے۔ سجی سنوری لڑکی کی ناز و ادا۔ آہا۔ کیا کہنے؟۔ اس پر لڑکے کا فدا انداز۔ ایمل کی ہنسی چھوٹ گئی

''نئی نئی شادی کے بعد، انسان خود کو بادلوں پر تیرتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ زمین پر چلنے میں دشواری ہوتی ہے۔ ایک سال بھی گزر نہیں پاتا کہ ضرورت زندگی اور حالات کی تلخیاں۔ چودہ طبق روشن کر دیتے ہیں۔ اگر اولاد ہو جائے بس پھر تو چھنے کی بات نہیں۔ شوہر گجروں اور پھولوں کی جگہ۔ پیمپرز اور دودھ کے ڈبوں کی خریداری کرتا نظر آتا ہے'' اس کے کانوں میں اپنی ایک شادی شدہ کزن کا فلسفہ گونجا اور ہونٹ مسکرا دیے، خیالات کی دھارا نے رخ موڑا اور چشم تصور میں عابس کو پیمپرز کا پیکٹ اٹھائے دیکھا۔ اس کی ہنسی نکل گئی۔

☆......☆......☆

پچھلے ہفتے عرشیہ کے نکاح کی تقریب کی وجہ سے بہت مصروف رہی نادانستگی میں عابس کو اگنور کرنا پڑا، جس پر وہ خاصہ برہم ہوا۔

وہ اسکی کالج فرینڈ تھی، اسی وجہ سے۔ ایمل نے ڈھولکی سے لے کر نکاح کے دن تک ہر لمحے کو بڑے جوش و خروش سے انجوائے کیا۔ سہیلی کی زندگی کے ایسے خوشگوار لمحوں پر اس نے دانستہ ان تلخ یادوں کو بھلا ڈالا۔ جو ان دونوں کے بیچ در آئے تھے۔ ماں کے سمجھانے پر ایمل نے اپنا بڑا پن دکھایا۔ کارڈ ملنے کے بعد۔ وہاں خوش دلی سے پہنچ گئی۔ ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ساری سجاوٹ اپنے ہاتھ سے کرتے ہوئے، اس نے خاندان سے خوب تعریفیں سمیٹیں، شاید وہ گناہ ناکردہ کی تلافی کرنا چاہ رہی تھی۔ اسی وجہ سے زیادہ وقت عرشیہ کے ساتھ گزارا، اتنی مصروفیت کی وجہ سے وہ چاہتے ہوئے بھی عابس سے ڈھنگ سے بات نہ کر پائی، وہ گھر آتا تب بھی موجود نہ ملتی، صاحب کا منہ تو پھولنا ہی تھا۔ شادی سے فارغ ہوتے ہی دل پر شدت سے عابس کی یادوں نے یلغار کر دی، اس نے بات کرنے کے لیے کال ملائی۔ اس نے لائن کاٹ دی۔

اب اس کے اکڑنے کی باری جو تھی بس ماش کے آٹے کی طرح اینٹھ گیا۔ زندگی میں پہلی بار ہوا جو ایمل نے اسے اتنے دنوں تک مسلسل نظر انداز کیا۔ وہ جو ہمیشہ سے اس پر رعب جماتا آیا، اپنی منواتا آیا۔ بھلا ان باتوں کا کہاں عادی تھا؟۔ بس۔ بچوں کی طرح منہ بنائے پھرتا رہا۔ ایمل سے بھی برداشت نہ ہوا، کئی فون کیے، بہانے سے پھوپھو کے گھر کا چکر بھی لگا آئی۔ منانے کی لاکھ کوشش کی مگر وہ اتنا بھنایا ہوا تھا کہ جو پٹڑی سے اترا تو اسے واپس ٹریک پر لانا دشوار کا رہو گیا۔

☆......☆......☆

ایک دن قبل وہ اپنی خالہ کے گھر گئی تو، فرشی نشست پر باسط کے ساتھ عابس کو بھی براجمان خوش گپیوں میں مصروف پایا، اس کے دل کی کلی کھل اٹھی۔ اس کے خالہ زاد بھائی عرفان ہاتھ میں چائے کے کپ تھامے برآمد ہوئے اور اسے دیکھ کر مسکرا دیئے، گھر تو اس کی خالہ کا تھا، مگر یہاں عابس آنا جانا زیادہ تھا، اس کی وجہ اس کے کزن سے بہت زیادہ دوستی تھی۔

خالہ نے ان سب کو کھانے پر روک لیا، وہ بھی کچن میں ان کی مدد کروانے چل دی۔ کھانے کے بعد، اس نے عابس سے جان بوجھ کر گھر چھوڑنے کی فرمائش کر دی۔ خالہ کی موجودگی میں وہ انکار نہ کر سکا۔

''صاحب جی۔ تلافی کی کوئی گنجائش ہے کہ نہیں۔'' گاڑی میں اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھتے ہی ایمل نے لاڈ سے پوچھا۔

''بیگم صاحبہ۔ معافی اسی صورت ملے گی۔ جب آپ میری پسندیدہ جگہ کی کافی پلوانے کی حامی بھریں۔'' عابس نے اسٹیئرنگ گھماتے ہوئے ترنگ میں آ کر فرمائش کر دی۔

''پکے بلیک میلر ہو۔ وہ دانت کچکچا کر بولی۔ اس کا زوردار قہقہہ گونجا تو پچھلی سیٹ پر بیٹھے باسط نے چونک کر دیکھا۔

''اوکے۔'' دل میں آیا منع کر دے پر اس کے بغیر گزارا بھی مشکل تھا۔ مجبوراً حامی بھری۔

اب سزا کے طور وہ یہاں ملنے آئی ہوئی تھی۔ پر وہ خود غائب ہو چکا تھا۔

''عابس۔ تم ہمیشہ دیر کر دیتے ہو، آج تو وقت پر آ جاتے، تاکہ میں پھپھو کے آنے سے پہلے گھر پہنچ جاتی'' اس کے خیالوں کی ڈوری چھناکے سے ٹوٹی، جو سامنے والی میز پر بیٹھے ایک بچے کے ہاتھ سے کپ گر کر ٹوٹنے سے ہوا۔ وہ بڑبڑائی، خود کو کمپوز کرنے کے لیے ایک طویل سانس بھری۔

عابس لیٹ ہو جانے کی وجہ سے ڈرتا ہوا۔ کافی شاپ میں داخل ہوا تو کونے میں شیشے کی دیوار کے ساتھ تنہا بیٹھی ایمل کو دیکھ کر اس کے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی۔ بغور جائزہ لیا، بلیک اور ریڈ سوٹ میں پھولوں کی ڈالی سی نرم و نازک ایمل کے لمبے سنہرے بالوں کی ایک لٹ جھولتی ہوئی اس کے گلابی گالوں کو چومے جا رہی تھی۔ براؤن آنکھوں میں کھویا کھویا سا تاثر، وہ اپنے دھیان میں گم ایک حسین مومی مجسمہ سے مشابہہ دکھائی دی۔

''بنانے والے نے کوئی تو کمی چھوڑی ہوتی' ۔ عابس کا دل شرارتی ہوا۔

''اے میرے دل، رک جا ذرا۔ کچھ مہینوں کی بات ہے اس نے میرا ہی ہونا ہے'' عابس نے دل کے مقام پر ہاتھ تھپتھپا کر دلاسہ دیا اور تیز قدموں سے اس کی جانب بڑھا۔

''ہائے۔ کیسی ہو؟'' وہ زور سے کرسی کھینچتا ہوا، اس کے کان کے پاس جھک کر بولا۔

''اوہ۔ شکر ہے۔ آپ۔ آ گئے۔''، ایمل اس افتاد پر چونک کر سیدھی ہوئی۔

کیا بات ہے؟، جب سے تمہاری دوست سے تعلقات بحال ہوئے، ہمیں ایک دم بھلا ہی دیا۔ اپنے اکلوتے منگیتر پر یوں ظلم ڈھاتے تمہیں حیا نہ آئی، اس نے پرسکون انداز میں ٹانگیں پھیلا کر کرسی پر دراز ہوتے ہوئے پوچھا۔

''تم یہ باتیں چھوڑو اور۔ میری بات کا جواب دو کہ۔ اتنے۔ لیٹ کیوں ہو گئے۔ پتا ہے

نا، آج مجھے جلدی گھر جانا ہے۔اور۔'' اس کے لہجے کی تیزی میں چھپی نوخیزی اور الھڑ پن اپنے عروج پر تھا۔۔وہ جب پانچ منٹ تک نان اسٹاپ بولتی رہی، تو مجبوراً عابس کو اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر روکنا پڑا۔

''اچھا۔ بابا۔ اب تو لیٹ ہوگیا نا، کچھ ہوسکتا ہے؟ نہیں نہ۔ اب بس بھی کرو۔ اور۔ کتنا سناؤں گی؟'' وہ آنکھیں نکال کر تھوڑا سختی سے بولا، ایمل ڈر کر خاموش ہوگئی۔

ایمی۔ جان۔ میں ان خوبصورت لمحوں کو فضول کی باتوں میں ضائع کرنا نہیں چاہتا، بس بات اتنی سی ہے کہ کراچی کے ٹریفک پر بھلا کسی کا کیا اختیار۔ بس چلتا تو اڑ کر وقت سے پہلے یہاں پہنچ جاتا۔ مگر۔ میری گاڑی ایک جگہ بدترین ٹریفک جام ہونے کی وجہ سے پھنس کر رہ گئی تھی۔''

اس کے منہ لٹکا کر بیٹھنے پر عابس کو تھوڑا ترس آیا تو نرمی سے سمجھایا۔ وہ پھر بھی کچھ نہ بولی اور اپنی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے لٹ سلجھانے لگی۔

''یار۔ تم۔ بھی نا۔ ذرا ذرا سی باتوں پر منہ بنا لیتی ہو۔ شادی کے بعد میرا۔ پتا نہیں کیا ہونے والا ہے؟۔ اتنے دنوں تک، تمہاری ڈھنگ سے صورت دیکھنے کو ترس گیا۔۔میری برداشت کے دیے کی لو جب ٹمٹمانے لگی تو مجبوراً یہاں بلایا۔'' عابس نے اپنے لیے کافی اور اس کے لیے آئس کریم کا آرڈر دینے کے بعد بڑے گہرے لہجے میں حال دل بیان کرنا چاہا، ایمل نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ سچائیاں، آنکھوں میں ہلکورے لیتا پیار۔ اس کی ناراضی اڑن چھو ہوگئی۔ محبت کی طاقت جسم میں خون کی جگہ دوڑتی محسوس ہوئی۔

''اچھا۔ نا۔ میں کچھ کہہ رہی ہوں کیا؟'' اس نے نگاہیں چراتے ہوئے کہا

''ایمی۔ جاناں۔ زندگی میں۔ مجھے صرف ایک چیز سے ڈر لگتا ہے۔ وہ تمہاری جدائی۔ میں شاید اس دن جی نہ پاؤں۔ جس دن تمہیں مجھ سے علیحدہ کردیا جائے۔'' وہ ایمل کا نرم و نازک ہاتھ اپنے بھاری مردانہ ہاتھوں میں لے کر گویا ہوا۔ وہ شرما کر سرخ ہوگئی۔۔اس بات کا ادراک اسے بہت پہلے سے تھا کہ اگر کبھی زندگی میں ان کے جذبوں کے حساب کتاب کا موقع آیا تو عابس کا پلڑا ہمیشہ جھکا رہے گا۔

تم مجھ سے اتنا پیار کرتے ہو؟۔'' اپنے خوبرو منگیتر کو نگاہ بھر کر دیکھ کر خود پر اترائی، اور ناک سکیڑ کر ایک ادا سے وہ سوال کیا جس کا جواب پہلے سے جانتی تھی۔

''ایمی۔ تمہارے تصورات سے بھی بڑھ کر میری محبت کی حد ہے'' اس کا لہجہ گھمبیر ہونے لگا، کافی شاپ کا خواب ناک ماحول اور خوبصورت ہوگیا۔

''آبی۔ میں تو صرف اس لیے کہہ رہی تھی کہ آپ کی ممی شام کو گھر آنے والی ہیں، اور میں۔ دیر سے گھر پہنچوں گی تو کوئی نیا فضیحتہ نہ کھڑا ہوجائے۔ میں شادی تک مزید کوئی ایشو کھڑا نہیں کرنا چاہتی۔'' ایمل نے دبے لہجے میں سمجھایا،

ایمل اپنے اور آبص کے رشتے کے معاملے میں بہت حساس ہوچکی تھی۔ کوئی ان پر انگلی اٹھائے۔ ایسا بالکل نہیں چاہتی تھی۔ ویسے بھی زریں ''اچھا۔ میری زندگی۔ فکر نہ کرو۔ ہم یہاں سے جلدی اٹھ جائیں گے' تم گھر جاکر اپنی ہونے والی ساسو ماں کو امپریس کرنے کے لیے ان کی پسند کی ایک آدھ ڈش بنا کر شہیدوں میں

اپنا نام لکھوالینا' وہ۔ شرارتی انداز میں دوبارہ اس کا ہاتھ تھامنے کی سعی کرنے لگا۔ ایمی نے جلدی سے اپنا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے زبان چڑائی اور، کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ وہ شوخی سے کھلکھلایا ۔اس کی یہ ہی ادائیں تو دل میں اس کا مقام بلند کرتی تھیں۔

''ایمی۔ تم۔ واقعی۔ بہت اچھی ہو''۔ عابس نے سچائی سے اقرار کیا۔

''تھینک یو۔'' ایمل نے آنکھیں مٹکائیں مگر اس کی نگاہوں میں بسی محبت کا قطرہ قطرہ اپنے دل میں اتارتے ہوئے دل عجیب انداز میں دھڑک اٹھا۔ وہ اس کے مسلسل دیکھنے پر سرخ پڑنے لگی،۔

۔ دونوں کو یوں لگا ۔ جیسے۔ ان کے اردگرد جیسے حسین لمحوں کی برسات سی ہونے لگی ہو، سب باتوں کو بھلا کر وہ دونوں ان میں چپ چاپ بھیگتے چلے گئے، ان کہی باتوں کا لطف اٹھاتے ، ایک دوسرے کی محبت اور خلوص کی شدت کو محسوس کرتے۔

☆......☆......☆

ایمل توصیف اس کی ماموں زاد کزن تھی ، عابس شروع سے ہی اپنی ایمی پر فریفتہ تھا، وہ کہیں چلی جاتی تو دنیا کے سارے رنگ اسے پھیکے دکھائی دیتے۔ ویسے تو ان کے پورے خاندان میں ایک سے ایک حسین وجمیل لڑکیاں موجود تھیں، مگر ایمل حسن کی مورت تھی جو اسے ایک بار دیکھتا ، دوسری بار دیکھنے کو بے چین ہوجاتا، ادھر عابس علوی بھی کسی سے کم نہ تھا ، مردانہ وجاہت اور نفاست کا امتزاج، بے انتہا ہینڈسم ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی نشست و برخاست میں بھی یکتا، اس کی مقناطیسی کشش کسی بھی لڑکی کو پل میں اپنا دیوانہ بنانے کی صلاحیت رکھتی، پر اسے کسی سے کوئی مطلب نہیں تھا؟۔ اس کی تو ساری دنیا۔ اپنی ایمی پر آکر ختم ہوجاتی۔ بلا مبالغہ دونوں کی چاند سورج جیسی جوڑی تھی،۔

ان دونوں کے بیچ یہ رشتہ بچپن میں زبانی طور پر قائم ہوا تھا۔ زریں نے بھائی کے سامنے دامن پھیلایا۔ توصیف کو بہن پر اعتبار تھا ، اسی لیے باقاعدہ رسم کرنے کی جگہ آپ میں ہی بات چیت کرلی۔ ایمل کی ماں عارفہ کا خیال تھا کہ۔ وقت آنے پر شادی کردی جائے گی۔ اس لیے۔ وقت سے پہلے زمانے بھر میں کیا ڈھول پیٹنا۔ اسی لیے۔ یہ بات صرف ان دو خاندانوں تک ہی محدود رہی، اس بات کا نقصان یہ ہوا کہ، اس کی کالج فرینڈ عرشیہ۔ نے جب عابس کو دیکھا تو اس کے عشق میں گرفتار ہوگئی۔ جس دن اسے یہ حقیقت پتا چلی کہ عرشیہ بھی ان لڑکیوں میں شامل ہوگئی ہے جو عابس کی شخصیت کے سحر میں مبتلا ہیں،۔ ایمل کا دل دکھوں سے بھر گیا۔ سہیلی کے منہ سے کڑوا یہ سچ سن کر۔ وہ بے قرار ہو اٹھی۔ عرشیہ کی بھلائی کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے سچائی بتانے کی کوشش کی کہ ان دونوں کی منگنی ہوچکی ہے۔ عرشیہ نے جوش میں آکر کچھ سننے سے انکار کردیا اور اس سے ناراض ہوکر قطع تعلق اختیار کرلی تھی۔

☆......☆......☆

''سر۔ کچھ اور چاہیے'' ویٹر نے کنکھار کر یادوں کا طلسم توڑا وہ حال میں لوٹی۔

''اگر۔ ساری دنیا کی سیر کرلی ہو۔ تو۔ یہ ختم کرو۔ ورنہ پگھل جائے گی تو پینا پڑے گا'' عابس نے اس کو چھیڑا، کرسٹل کے پیالے میں دو پسندیدہ فلیور کے کئی اسکوپ دیکھ کر ایمی کی آنکھوں کی

چمک بڑھ گئی، فوراً کھانے میں مشغول ہوگئی۔ گرمی ہو یا سردی۔ اسے آئس کریم کھانے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ عابس نے ٹھنڈی سانس بھر کر اپنی منگیتر کو دیکھا، جس نے اس کے مقابلے میں ہمیشہ آئس کریم کو فوقیت دی۔

''عرشیہ کا دلہا کیسا ہے؟۔کیا۔ دونوں کی لو میرج ہوئی ہے؟'' گرم کافی کا پہلا سپ عابس کی زبان جلا گیا، اس نے جلدی سے کپ میز پر رکھ کر پوچھا۔ ایمی کے ہاتھ سے چمچہ چھوٹ گیا۔ وہ چونک اٹھی۔

''خیریت تو ہے۔ آپ کو کیا دلچسپی پیدا ہوگئی؟'' ایمل نے اسے ٹٹولا۔ وہ ہنس دیا۔

''ارے بھئی۔ مجھے کیا۔ نہ بتاؤ۔ خود ہی دوست کے پیچھے پاگل ہو رہی تھی تو میں نے بھی اخلاق دکھا دیا'' وہ لاپرواہی سے باہر دیکھتا ہوا بولا تو ایمی نے سکون کا سانس لیا۔

''نہیں سب کچھ۔ ارینج۔ ہے۔ اریب بھائی عرشیہ کی بڑی بہن کے دیور ہیں۔'' اس نے چمچہ بھر کر آئس کریم کھاتے ہوئے جوش سے بتایا۔

''چلو۔ یہ تو اچھی بات ہے۔ میاں بیوی کے ساتھ گھر والے بھی راضی۔ زندگی گزارنے کے لیے یہ ہی بات اہم ہے۔ سب میری طرح بے وقوف تھوڑی ہوتے ہیں کہ محبت میں پڑ کر زندگی خراب کرلیں'' اس نے جان بوجھ کر چھیڑا۔ مگر۔ وہ آئس کریم کا مزہ خراب کرنا نہیں چاہتی تھی اسی لیے ہنس کر ٹال گئی۔

''عابس۔ اریب بھائی بہت اچھے اور سلجھے ہوئے انسان۔ میں ان سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ سمجھیں میرے دل سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے'' وہ بے خیالی میں بولتی چلی گئی۔ ایک دم دانتوں تلے گلابی زبان دبا کر خود کو مزید کچھ کہنے سے روکا۔

وہ بھول گئی کہ عرشیہ کی عابس سے یکطرفہ محبت کی کہانی اس سے چھپاتی آئی تھی، دوست کا بھرم رکھنا بھی ضروری تھا۔

''چلو۔ یہ تو اچھی بات ہے'' وہ کافی کا کپ تھام کر بولا، شکر ہے اس نے بھی غور نہیں کیا۔ ویسے بھی اسے ان باتوں میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ بس اس کا دل رکھنے کو پوچھ لیا۔ اسے تو ایمی کے کھلتے بند ہوتے نازک ہونٹوں کو دیکھنے میں مزہ آرہا تھا۔

''چلو۔ سب کچھ۔ اچھا ہوگیا نا۔ میری ایمی خوش تو میں بھی خوش۔'' اس کی سنہری آنکھیں چمک اٹھیں تو ایمل کو اس کے پیار پر پیار آیا۔

''ہونہہ۔ میں تو بہت خوش ہوں، ایک فکر سے آزادی جو مل گئی۔ عرشیہ کی شادی سے۔ دماغ سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا'' ایمل نے آنکھیں بند کر کے کہا، گالوں کا بھنورا اٹھلایا۔

''تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے، دوست کی شادی کی ذمہ داری، اس کے والدین کی جگہ تمہارے نازک کاندھوں پر ہوں''، اس نے ہنسی کو دباتے ہوئے کہا، ایمی نے ناک اچکائی۔

''چلو۔ اماں۔ جی کا ایک فرض ادا ہوا۔'' ایمی کو چھیڑنے میں اسے ہمیشہ مزہ آتا تھا۔ وہ دیر تک اس کا ریکارڈ لگاتا رہا۔ آخر وہ برا مان بیٹھی۔

''مذاق۔ تو۔ نہ اڑائیں۔ نا۔ میں عرشیہ سے بہت پیار کرتی ہوں۔ اسی لیے، خوش ہوں۔'' ایمی نے ایک بار پھر منہ بنا لیا اور خاموشی سے اپنی آئس کریم ختم کرنے لگی۔

''اللہ جی نے کرم کیا کہ عرشیہ کی شادی ہوگئی، ورنہ بے گناہ ہوئے بھی میں اس کی نظروں مجرم بنی رہتی'' اس نے سوچا تو چہرے پر گھمبیر تا پھیل

گئی۔

"یہ روٹھتی ہے، تو ننھی سی بچی لگتی ہے۔ جلدی سے منالوں۔ اگر ایک آنسو بھی ٹپکا تو مشکل ہو جائے گی۔" ایمل کی خاموشی بہت دیر تک برداشت نہ ہو سکی۔ منانے کی تدابیر سوچنے لگا۔

"اچھا۔ بابا۔ یہ دیکھو۔ کان پکڑ لیا" عابس نے معصومیت سے کان پکڑے تو وہ ہنس دی۔

"کیا۔ کافی۔ پی نہیں جا رہی؟" ۔ ایمی کا آئس کریم کا بڑا والا کپ ختم ہوا تو عابس کے سامنے رکھے کپ میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ وہ جان گیا۔ اب کافی پر نظر ہے۔

"ایمی۔ کافی ختم ہی نہیں ہو رہی، پلیز۔ شیئر کرو نا، اس نے کپ بیچ میں رکھا، اور پیار سے بولا تو وہ ٹشو سے انگلیاں پونچھتی جلدی سے میدان میں کود پڑی۔

"دل تو نہیں چاہ رہا۔ مگر آپ کے پیسے ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتی، اسی لیے پی لیتی ہوں" اس نے نخرے دکھا کر کپ فوراً اپنے قبضے میں لیا۔ باری باری ایک ایک گھونٹ بھرتے وہ دونوں ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ ایمل داستان امیر حمزہ کی طرح عرشیہ کی شادی کا آنکھوں دیکھا حال سنائے جا رہی تھی۔ عابس منہ بند کیے، اس کی خوشی کی خاطر سر دھنتا ہوا اس کی باتوں پر زبردستی دلچسپی دکھانے لگا۔

"سوری۔ آپ یہ چوڑی مہندی کی باتوں سے بور ہو گئے ہوں گے" جب ساری باتیں ختم ہو گئیں تو ایمی کو ایک دم خیال آیا۔ اس کے معصومانہ انداز پر عابس کا جاندار قہقہہ فضا میں گونجا۔ وہ ہنستا ہوا بہت پیارا لگتا تھا۔

"چلیں۔ پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے" ایمل بیگ لٹکا کر کھڑی ہوئی۔ وہ سیٹ چھوڑ کر کھڑا ہوا تو پورے ہال میں اپنے دراز قد کی وجہ سے نمایاں دکھائی دیا۔ وائٹ شرٹ اور بلیک جینز اس پر ہمیشہ کی طرح بہت جچ رہی تھی، ایمل کی نگاہوں نے لمحے بھر کو اسے اپنے حصار میں لیا، دل نے نظر اتاری۔" کافی شاپ سے باہر نکلتے ہوئے اس پر سرشاری کا غلبہ تھا۔

☆......☆......☆

زرین اپنی فیملی کے ساتھ بھائی کے گھر لیٹ پہنچیں تو ایمل نے شکر ادا کیا۔ عابس نے اپنا عہد نبھایا اور انہیں اس کے گھر پہنچنے کے کافی دیر بعد یہاں بھیجا۔ حالاں کہ وہ ڈرتے ڈرتے گھر پہنچی تو ماں نے خوب جھاڑ پلائی، ایمی کپڑے چینج کر کے کچن میں بھاگی، اور جلدی جلدی ڈنر کے لیے دو تین اضافی ڈش کی تیاری کی۔

اس کے پیچھے بھی عابس کی عقلمندی پنہاں تھی، اس نے کافی شاپ سے نکلتے ہی باسط کو کال کر کے ہدایت کر دی کہ جب تک وہ گھر نہ پہنچ جائے، ماں کو لے کر ماموں کی طرف نہ نکلے، باسط نے ہمیشہ کی طرح بڑے بھائی کا مکمل ساتھ دیا اور عین ٹائم پر ضروری کام کا بہانہ بنا کر اپنے دوست کے گھر چلا گیا۔ پیچھے سے زرین کی بڑ بڑ شروع ہو گئی۔

دراصل ایمل کو پھوپھو اور ہونے والی ساس کی متلون مزاجی سے بہت ڈر لگتا تھا، ان فیکٹ، اس کے سر پر ایک تلوار سی لٹکتی رہتی۔ وہ انہیں خود سے کوئی موقع فراہم کرنا نہیں چاہتی تھی کہ بات مزید خراب ہو۔ اتنی مشکلوں کے بعد تو۔ دونوں گھرانوں کا میل جول دوبارہ ہوا۔ بہن سے تعلقات کی بحالی پر صرف۔ اس کے پاپا توصیف احمد۔ ہی خوش نہیں تھے بلکہ عابس کے چہرے کی مسکراہٹ بھی لوٹ آئی۔ وہ ان دونوں

سے جتنی محبت کرتی تھی، پھوپھو کو باتیں بنانے کا ایک بھی موقع نہیں دینا چاہتی تھی، اسی لیے کافی شاپ جاتے ہوئے بھی کترا رہی تھی۔

زرین کا کچھ بھروسا نہیں تھا شادی سے قبل کوئی نیا مسئلہ کھڑا کر کے وہ ایک بار پھر شادی کو ٹال دیتی۔ ایمی کو اپنے سے زیادہ عابس کی فکر تھی وہ زندگی میں بہت کچھ برداشت کر سکتی تھی لیکن اس کے چہرے کا غم۔ ناقابل تلافی نقصان ہو جاتا۔

☆......☆......☆

گھر کے پورچ میں گاڑی کھڑی کرتے ہی عابس نے باسط کو فون گھما کر اپنے پہنچنے کی اطلاع دی تو اس نے شکر ادا کیا، مما کے فون نے اس کو بیزار کر دیا تھا، بہانہ بنا بنا کر اس کی جان نکلی جا رہی تھی، اس پر ڈانٹ الگ کھانی پڑ رہی تھی۔

''اچھا۔ یار۔ چلتا ہوں۔'' باسط نے بھائی کا فون رکھتے ہی دوست سے اجازت طلب کی اور فوراً ہی بائیک اٹھا کر گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

زرین علوی کافی روایتی سی خاتون تھیں، بھائی جب سے سمدھی بنے مکمل پروٹوکول حاصل کرتیں۔ عابس کو بھی ان باتوں کا بڑے اچھے طریقے سے اندازہ تھا اسی لیے کافی محتاط ہو گیا تھا۔ ویسے بھی چند دنوں قبل جس طرح سے ان کا دماغ گھوما تھا اور وہ یہ منگنی توڑنے پر تل گئی تھیں، یہ بات بھولنا مشکل تھا

''مما نے ہم دونوں کے ایک دوسرے تک پہنچنے والے راستوں کو اپنے ہاتھوں سے بند کرنے کی تیاری مکمل کر لی تھی،'' وہ جب بھی یہ بات سوچتا دماغ میں ٹیسیس اٹھنے لگتی، اس وقت بھی گاڑی سے اترتے ہوکر یہ سب سوچنا خاصہ ناخوشگوار لگا۔

''وہ تو۔ شکر ہے قسمت نے ساتھ دیا۔ حالاں کہ۔ اس وقت کتنی مشکلات در پیش آئیں، تاہم ۔ ہمارے حوصلہ اور ہمت نے کامیابی کی صورت دکھائی'' عابس نے سوکھے پتے کو ہتھیلی پر رکھ کر چرمرا دیا۔

ان دنوں جب ۔ اس کی اپنی مما ان دونوں کے بیچ دیوار کھڑی کرنے میں پیش پیش ثابت ہوئیں، ۔ وہ پاگل ہوا اٹھا۔ مگر شکر ہے کہ خاندان بھر کی نوجوان پارٹی نے ایسے جانکسل لمحوں میں نہ صرف ان دونوں کو سہارا دیا بلکہ انہیں ملوانے کے لیے باقاعدہ جنگ لڑی۔ یہ گھڑی ان کے دلوں پر اس وقت گزری جب زرین علوی لالچ کا شکار ہو کر بھائی کو دی ہوئی اپنی برسوں پہلے کی زبان سے پھر گئیں۔ انہوں۔ ایمل کو بہو بنانے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ سب سننے کے بعد ان کے بھائی توصیف احمد نے بہن سے قطع تعلق کا اعلان کر دیا۔، دونوں گھرانوں میں وقتی طور پر آنا جانا بند ہو گیا۔ تاہم بڑوں کے بیچ تعلقات میں پڑنے والی دراڑ نے نئی نسل کے بیچ قائم ہم آہنگی کو مزید توانا کر دیا۔

ایمی کو کھونا۔ یہ بات سوچ کر ہی اس کا دل بند ہونے لگتا۔ اس وقت بھی وہ ماضی کو یاد کرتے ہوئے تھرتھرایا۔

☆......☆......☆

کئی سالوں بعد فاروق علوی کی بڑی بہن اور زرین کی نند نزہت رفیق جو شروع سے امریکا میں مقیم تھیں۔ رشتے داروں سے ملنے اور گھومنے پھرنے پاکستان آئیں۔ وہ خوب رو اور قابل بھتیجے سے مل کر بہت متاثر ہوئیں۔ عابس کو اپنا داماد بنانے کے لیے مچل اٹھیں، بھابھی کی فطرت کو

شروع سے جانتے ہوئے انہوں نے سنہرا پانسہ بھی پھینکا اور شادی کے بعد عابس کو ہمیشہ کے لیے امریکا میں سیٹل کرانے کا عندیہ دیا۔ یہ آفر سن کر زریں لالچ میں ایسی مبتلا ہوئی کہ اپنے پرانے عہد بھلا بیٹھیں، جلدی سے نزہت کی لولوچپو میں لگ گئیں۔

روپے پیسے کی کمی نہ ہونے کے باوجود زریں پر امریکا کا ایسا چارم طاری ہوا کہ وہ کوئی معقول بات سننے کو تیار ہی نہیں تھیں۔ سب کی مخالفت مول کر بھی اپنی جگہ سے ایک انچ پیچھے نہ ہٹیں، عابس کی زندگی سے بہاریں رخصت ہوگئیں اور خزاں بھری شام چھا گئی۔ اس کے دونوں بھائی اور تینوں بہنوں نے ماں کو سمجھانے کی سرتوڑ کوشش کی، پر وہ سب کو نولفٹ کا بورڈ دکھاتی، نند کے آگے پیچھے پھرنے لگیں۔ ان کے شوہر فاروق علوی نے بھی بیٹے کی ردی حالت دیکھ کر بیوی کو خوب باتیں سنائیں۔ وہ سنی ان سنی کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ ان کی ہٹ دھرمی پر دونوں میں بات چیت بھی بند ہوگئی، مگر وہ اپنے موقف سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہ ہوئیں۔

☆......☆......☆

دونوں بھائی بہن سرسبز لان میں بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے، زرین کہیں اندر مصروف تھیں، فاروق علوی نے موقع کا فائدہ اٹھایا۔

''دیکھو۔ نزی۔ زرین تو بے وقوفی کر رہی ہے، پر میں عہد کا پاس رکھنے والا انسان ہوں۔ سالوں پہلے۔ ان دونوں کی بات طے کردی گئی تھی۔ اب یوں اچانک بلا جواز رشتہ ختم کردینا۔ مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں آئی'' انہوں نے ابہن کو عابس کے رشتے والی بات یاد دلائی۔

''میں کہتی ہوں۔ بھائی جان۔ آپ بھی بہت سیدھے ہیں۔ صرف بات ہی کی گئی تھی۔ باقاعدہ منگنی یا نکاح تو نہیں کیا تھا نا۔ جو ختم کرنے میں پریشانی ہو'' نزہت بھی اپنے مطلب کے لیے بھابھی کا پڑھایا ہوا سبق رٹنے لگیں ساتھ ہی بھائی کی خوشامد کی۔

فاروق علوی خواتین کی ''کچن پالیٹکس'' پر سرپیٹ کر رہ گئے۔

''نزی۔ تمہارے خیالات جان کر مجھے۔ بڑا دکھ پہنچا۔ تم کتنے آرام سے بات ختم کرنے کا بول رہی ہو۔ خیر۔ تم لوگ کچھ بھی کرلو میں۔ اس معاملے میں زریں کا قطعی ساتھ نہیں دینے والا'' وہ چھوٹی بہن سے بھی مایوس ہوگئے۔ افسردگی، ان کے چہرے پر پھیل گئی۔ خاموشی سے چائے پینے لگے۔

''کیا۔ آپ کے لیے اپنی بھانجی نورینہ سے بڑھ کر بھی کوئی دوسرا ہوسکتا ہے؟'' نزہت نے پہلے گلا کنکھارا۔ توصیف نے توجہ نہ دی تو اسکارف کے کونے سے آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے گلوگیر لہجے میں بھائی پر دباؤ ڈالا۔

''بے شک۔ بہن نورینہ مجھے بہت عزیز ہے۔ پر بات یہاں صحیح اور غلط کی ہے۔ میں بھی بیٹیوں کا باپ ہوں۔ آج کسی لڑکی پر ڈھایا گیا ظلم کل کو ان کے سامنے بھی آسکتا ہے'' فاروق علوی نے مجبوراً بہن سے دوٹوک انداز میں بات کی اور گھاس کو روندتے ہوئے وہاں سے چل دیے۔ نزہت اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔ انہیں پوری امید تھی کہ وہ بھائی کو قائل کر پائیں گی۔ مگر وہ تو خفا ہوگئے۔

''بھائی۔ صحیح تو نہیں کہہ رہے ہیں۔ میری بھی تو ایک ہی بیٹی ہے۔ کہیں ایمل اور عابس کی بدعا۔ نہ لے ڈوبے۔ کچھ برا نہ ہوجائے'' ان کی

پرسوچ نگاہوں نے ،خلاؤں میں گھورا، شاید بھائی کے سمجھانے کا کچھ اثر ہوا۔

رات کو کھانے کی ٹیبل پر عابس کو دیکھا،۔ بڑھی ہوئی شیو، ملگجے سے لباس میں پہلے دن کے مقابلے میں بہت اجڑا اور کمزور سا دکھائی دیا۔انہیں ملال نے آگھیرا۔مگر زرین نے باتیں بنا کر پھر انہیں گھیر لیا۔

☆......☆......☆

وہ ایمل کے معاملے میں حد سے زیادہ پکّا تھا،''کیوں؟'' اس سوال کا جواب عابس کو کبھی نہیں مل سکا،

جب سے گھر میں رشتہ ختم ہونے کی بات ہوئی، اس نے کھانا پینا کم کر دیا، آفس سے واپسی پر بس منہ بنا کر کمرے میں پڑا غمگین غزلیں سنتا رہتا، حالت یہ ہونے لگی تھی کہ وہ اکثر راتوں کو خواب میں ایمل کو دلہن بنا دیکھتا، جو اس سے دور جا رہی ہوتی، وہ ایک دم ہڑ بڑا کر جاگ جاتا ،۔ بہت دیر تک نیند کی دیوی اس سے روٹھی رہتی ۔اس کے لیے۔ایمی کی جدائی کا تصور ہی نا قابل برداشت تھا۔مگر زرین ماں ہو کر بیٹے کی حالت پر ترس نہیں کھا رہی تھیں۔

بڑے اپنے اپنے محاذ پر سر گرم عمل تھے ۔تو چھوٹے بھی خاموش نہیں بیٹھے، دونوں گھرانوں کے بچے بڑوں سے چھپ کر سر جوڑے ان دونوں کو اس مصیبت سے نکالنے کی تدبیر ڈھونڈنے میں مصروف ۔ہوگئے ۔ان لوگوں نے ۔سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ ،۔ایمل کی خالہ شبانہ کے گھر کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا، ایمل کی چھوٹی بہن شامل ، آبس کا بھائی باسط اور خالہ زاد بھائی عرفان ۔اس معاملے کو سلجھانے میں پیش پیش تھے ۔سارے کزنز عرفان کی دعوت پر ان کے یہاں جمع ہو کر نت نئی تراکیب لڑاتے ۔

ایمل کا ان دنوں بس ایک ہی کام تھا۔رونا ۔وہ آنسو بہا بہا کر عابس کا حوصلہ بھی توڑ دیتی ،۔ شامل بہن کی ایسی بزدلی پر چار باتیں سنانے لگ جاتی تو۔عابس سے برداشت نہ ہوتا۔سب کے سامنے ۔شامل کی کلاس لگانے لگتا۔ایک نیا جھگڑا شروع ہو جاتا۔ان کو۔ہدف سے ہٹتا دیکھ کر۔ سارے کزنز صلح صفائی کرانے میں لگ جاتے ۔

آخر روز روز کی چخ چخ سے تنگ آ کر اپنے طور پر باسط نے ہی اس کیس کو حل کرنے کی ٹھانی ۔سب سے صلح ومشورے کے بعد امریکا کال ملائی گئی ۔نورینہ سے بات کرتے ہوئے۔سب کو خوف تھا پتا نہیں وہ کیسے ردعمل دکھائے ، اسی لیے اسے ڈرتے ڈرتے ساری بات بتائی گئی۔شامل اور باسط نے جوش میں آ کر دونوں خواتین کے ساز باز کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا۔توقع کے برخلاف وہ ان سب باتوں سے بالکل نا آشنا تھی۔

اس نے ساری تفصیل جاننے کے بعد ماں اور ممانی کی خود غرضی پر برہمی کا اظہار کیا تو۔ان کی جان میں جان آئی۔ باسط نے موبائل کان سے لگائے لگائے برابر میں کھڑی شامل کے سر پر ہاتھ رکھ کر وکٹری کا نشان بنایا۔تو سارے کزنز خوشی سے اچھل پڑے ،۔نورینہ نے ترنت عابس سے بات کرنے کی خواہش کی تا کہ ان سب حالات کے پر معذرت کر سکے۔یہ سن کر ایمی کے چہرے کی رونق بحال ہونے لگی۔لڑکے فورا ہی جوش میں آ کر ڈانس کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔کمرے میں اتنا شور مچا کہ عابس کو نورینہ کی بات سمجھنا مشکل ہوگئی، اس نے ہاتھ جوڑ کر سب سے خاموش رہنے کی استدعا کی۔

''سوری۔ عابس بھائی۔ یہاں رہتے ہوئے بھی پاکستان میں میری سب سے گپ شپ رہتی ہے۔ مجھے آپ دونوں کی محبت کا بخوبی انداز ہے۔'' وہ نرمی سے گویا ہوئی۔

''شکریہ۔ نوری۔ جو تم نے بات کو سمجھا'' اس نے اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے اپنی کزن کو سراہا۔

''میرے لیے ایسا سوچنا بھی ممکن بھی نہیں ہے ''۔ پلیز ٹرسٹ می ۔ میں۔ ان سب باتوں سے لاعلم ہوں۔ ممی مجھ سے پوچھ کر یہ شوشہ چھوڑتی تو اس کی نوبت ہی نہیں آنے دیتی۔ آج کل۔ اپنی اسٹڈیز میں بہت زیادہ بزی ہوں ۔اس لیے ان سے بھی بات نہیں کر پا رہی ہوں۔ خیر یو ڈونٹ وری۔ میں ماما اور ممی کو خود ہینڈل کر لوں گی۔'' اسکی تسلی سے ان سب کی جان میں جان واپس آ گئی۔ نورینہ ایک صاف گو اور پیارا سا دل رکھنے والی لڑکی تھی ،اسے ماں کی یہ باتیں ذرا پسند نہ آئیں،

نورینہ نے ماں کے امریکا لوٹتے ہی اپنا وعدہ نبھایا۔ اس رشتے سے انکار کرتے ہوئے گھر میں ایسا طوفان مچایا کہ نزہت کو فون پر بھابھی سے معذرت کرتے بنی، امریکا والوں نے ہری جھنڈی کیا دکھائی، زریں کے لالچ بھرے غبارے کی ساری گیس نکل گئی۔ وہاں سے انکار کے بعد گھر کے ماحول کو معمول پر لانے کے لیے انہوں نے بیٹے کی بات ماننے میں ہی عافیت جانی۔ کچھ اپنی زیادتی کا احساس بھی کچوکے لگانے لگا۔ بھائی کی یاد نے بے قرار کیا تو سب کو لے کر ایمل کے گھر معافی مانگنے پہنچ گئیں ۔توصیف بھی زیادہ دیر تک آنسو بہاتی بہن کو نظر انداز نہ کر سکے اٹھ کر گلے لگا لیا۔ عارفہ نے البتہ نند کے ساتھ چند دنوں تک سرد مہری برتی۔ زریں نے عابس کے مجبور کرنے پر شادی کی تاریخ مانگنے پہنچ گئیں۔ تو رہے سہے گلے شکوے بھی دور ہو گئے۔

اتنی مشکلیں سہنے کے بعد یہ ٹوٹے رشتے دوبارہ جڑے تو ان دونوں کو لگا کہ مر کر زندہ ہو گئے ہوں۔

اس واقعے کے بعد سے وہ دونوں ایک خوف اور ڈر میں مبتلا رہنے لگے، خاص طور پر عابس نے ضد کر کے خاندان بھر میں اپنی بات طے ہونے کی مٹھائی بٹوائی۔ زریں بیٹے کی حرکتوں پر دانت پیس کر رہ جاتیں۔ فاروق علوی ہر معاملے میں اپنے بیٹے کا مان رکھتے چلے گئے، عابس کے دل میں پھر بھی، ایک کسک سے اٹھتی، پتا نہیں کیوں وہ ایمل کے بچھڑنے کے خوف میں مبتلا ہو گیا، دماغ ہزار دلائل پیش کرتا، پر اپنے دل کو کہاں لے کر جاتا۔ وہ ایمل کو کسی قیمتی شے کی طرح سنبھالے رکھتا۔ وہ ذرا بھی ادھر ادھر ہوتی زمین سر پر اٹھا لیتا۔

''کہیں ۔ایسی کوئی بات دوبارہ نہ ہو جائے۔ کہ۔ ہم بچھڑ جائیں'' عابس کے دماغ میں جب بھی کوئی ایسا خیال کوندیں مارتا وہ ایمل کے لیے مزید دیوانہ ہوتا، چلا جاتا۔

☆......☆......☆

آج عرشیہ شادی کے بعد پہلی بار ان کے گھر آئی تو عارفہ نے بیٹی کی دوست اور اس کے شوہر کے لیے پر تکلف دعوت کا اہتمام کر دیا۔

وہ دونوں کافی دیر ٹھہرے، اچھے ماحول میں کھانا کھایا گیا، اس کے بعد قہوہ پیتے ہوئے خوش گپیوں کی گئیں، اچانک ایمل کی شادی کا سن کر عرشیہ کا چہرہ لمحے بھر کو تاریک ہو گیا، شامل بغور

اس کی حرکات وسکنات تک رہی تھی۔ عارفہ نے سوچا ان دونوں کو انویٹیشن کارڈ ابھی دے دیں۔ عارفہ اندر سے اس کی شادی کا سنہرا جھلملاتا کارڈ تھامے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں، کارڈ پر عابس کا نام پڑھ کر وہ پھیکی پڑ گئی۔

''تم۔ ہمیشہ مجھے سرپرائز کردیتی ہو'' عرشیہ نے ماضی کے حوالے سے طنز کیا تو ایمل پہلو بدل کر رہ گئی۔۔

''بیٹا۔ اگر برا نہ مانو تو۔ اگلے مہینے۔ ایمی کی شادی ہے۔ عرشیہ اس کی اکلوتی سہیلی ہے۔ پلیز۔ تم اسے ساری رسموں میں شریک ہونے کی اجازت دے دینا'' عارفہ نے اریب خان کے ہاتھ میں کارڈ دیتے ہوئے کہا۔ وہ ان کے انداز پر پاس کھڑی بیوی کو دیکھنے لگا۔

عرشی نے دل میں اٹھتے درد کو دبایا، اور چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجائی۔ مگر اس لمحے اس کا موڈ تھوڑا خراب لگا۔

''اچھا تو یہ مزے ہیں۔ ویسے اللہ ہر ایک کو تمہاری طرح لکی بنائے۔ جسے چاہا، اسے ہی پالیا۔'' کچھ سوچ کر تھوڑی دیر بعد عرشیہ نے خود پر قابو پایا اور آنکھیں مٹکا کر پاس کھڑی ایمل کے چٹکی بھرلی۔ وہ دوست کی شرارت پر تھوڑا شرما گئی۔

''آنٹی۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں تو بزنس کے بکھیڑوں میں الجھا رہتا ہوں۔ صرف شادی کی تقریب میں ہی شرکت کر سکوں گا، انشاء اللہ۔ عرشیہ۔ ایمل بہن کی ساری خوشیوں میں آئے گی۔ اس معاملے میں۔ میری طرف سے کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔'' اریب خان نے مسکرا کر سعادت مندی سے عارفہ کو جواب دیا۔

''ہاں۔ بیٹا۔ میں سمجھتی ہوں۔ مردوں کی جان کو سو جھمیلے لگے ہوتے ہیں۔ خیر میں۔ تمہارے لیے تو اصرار بھی نہیں کروں گی۔ ہاں۔ ہماری بیٹی آکر تمہاری کمی پوری کردے گی' عارفہ نے بڑے سبھاؤ سے کہا۔ ماں کے اشارے پر۔ ایمل اندر تحائف لینے چل دی۔ عرشیہ نے سہیلی کی شادی پر کسی جوش وجذبے کا اظہار نہیں کیا۔ عرشیہ کی لاتعلقی محسوس کی جانے والی تھی، شامل نے اچھنبے سے اس کی طرف دیکھا۔

''اچھا۔ اب اجازت دیں۔ ایک بات ضرور کہنا چاہوں گا اگر۔ میرے لائق۔ کوئی کام ہو بلا جھجک ایک فون کردیجیے گا۔ میں وقت ضرورت دست یاب ہو جاؤں گا'' اریب نے بڑے احترام سے عارفہ کے سامنے سر جھکاتے ہوئے کہا، انہوں نے سر پر ہاتھ پھیرنے کے بعد دعا دی۔ شگن کے طور ایک لفافہ اس کے ہاتھ میں زبردستی تھمایا، جس میں ہزار کا کرارا نوٹ تھا۔ نوکر نے مٹھائی کا ڈبہ اور عارفہ کی جانب سے دیے جانے والے تحائف، اریب کی گاڑی میں لے جاکر رکھ دیے۔ ماں بیٹیاں، ان دونوں کو دروازے تک رخصت کرنے آئیں۔

☆......☆......☆

ایک تھکا دینے والے دن کے خاتمے کے بعد ایمل سست سی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ فوراً ہی نرم بستر پر دراز ہو گئی۔

''عرشی پر گلابی کامدار سوٹ کتنا سج رہا تھا۔ اریب بھائی بھی بیوی کے دیوانہ بنے ہوئے تھے۔ اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ وہ کتنی خوش اور مطمئن دکھائی دے رہی تھی''، ایمل نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے اپنی دوست کی خوشیوں بھری زندگی کے لیے دعا مانگی۔

''آپ کی شادی کے ذکر پر عرشیہ آپا بڑی چپ چپ دکھائی دے رہی تھیں۔'' شامل جو اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی تھی، الماری سے اپنا کالج کا یونیفارم نکالتے ہوئے ایک دم بولی۔

''نہیں تو۔ تمہیں ایسا کیوں لگا؟'' وہ چونک کر چھوٹی بہن کا منہ تکنے لگی۔

''یہ تو سامنے کی بات ہے۔ پورے دن وہ خوب چہک رہی تھی، زوردار ٹھٹھا، ہنسی مذاق۔ مما نے جیسے ہی آپ کی شادی کا ذکر چھیڑا، گونگے کا گڑ کھا کر ایک دم گم سم کھڑی کی کھڑی رہ گئیں، یہ تک نہیں پوچھا کہ پروگرام اگلے مہینے کی کون سی تاریخ سے شروع ہو رہا ہے۔ نہ کوئی جوش نہ ولولہ ۔ ٹس۔ ان سے اچھے تو اریب بھائی نکلے محفل کے آداب نبھاتے ہوئے مما کو ٹھیک طرح سے رسپانس تو دیا'' وہ قمیض پر استری کرتے ہوئے عادت کے مطابق صاف گوئی سے بولی۔ اس کی باتیں سن کر ایمل سوچ میں پڑ گئی۔ اندیشوں نے دوبارہ اس کے اندر اپنی جگہ بنانا شروع کر دی۔

''اچھا۔ میں نے تو ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی؟'' ایمل نے دوست کا بھرم رکھا۔ اور شکر ادا کیا کہ شامل کی پیٹھ تھی ورنہ نگاہیں ملا کر جھوٹ بولنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔

''آپی۔ آپ بھی نا۔ بڑی بھولی اور صاف دل کی ہیں، سچ میں مجھے تو ان کے رویے پر بڑی حیرت ہوئی۔ ایک آپ تھیں، ان کی ڈھولکی تک میں بھی بڑے اہتمام سے جاتی۔ ایک وہ ہیں ۔ ذرا جو دلچسپی دکھائی ہو۔ مجھے تو ان کے طنز کی ہی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ خیر ہر انسان اپنی فطرت کے حساب سے ہی چلتا ہے'' شامل نے یونیفارم استری کر کے ہینگر کرنے کے بعد مڑ کر بہن کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں۔ تھک گئی ہوگی۔ اسی لیے چپ چپ لگی، ورنہ بھلا وہ میری شادی پر خوش کیوں نہیں ہوگی؟'' ایمل نے بلاوجہ کی صفائی دیتے ہوئے کہا تو شامل سر ہلاتی باہر نکل گئی۔

''کیا۔ عرشی کے دل میں اب بھی عابس کے نام کا کانٹا چھبا ہوا ہے۔ وہ۔ ان کو بھول نہیں پائی ہے؟'' اس کے سامنے کئی سوالات ناچنے لگے۔ عرشیہ کے بارے میں سوچتے ہوئے ماضی کے سمندر میں غوطے لگانے لگی۔

☆......☆......☆

وہ دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتی تھیں۔ ایمل جتنی نرم مزاج اور شرمیلی طبعیت کی تھی، عرشیہ اتنی ہی بے باک اور نڈر، اسے اپنے حسن کا زعم بھی بہت تھا۔ جانے کیسے دو الگ مزاجوں کی لڑکیوں کو ایک دوسرے کی سنگت بھانے لگی۔ دن بہ دن ان کی دوستی کی گانٹھ مضبوط ہوتی چلی گئی۔ اتنی قربت کے باوجود اس نے کبھی اپنی دوست کو عابس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا، ۔ زریں پھوپھو کی سرد مہری اور نورینہ والا معاملے کے بعد سے وہ اپنی منگنی کی بات کسی کے سامنے نکالنے سے بھی ڈرتی تھی، اکثر تو وہ اس رشتے کی بات۔ اپنے آپ سے بھی چھپا جاتی،

عابس کے لیے اس کی بے تحاشہ۔ محبت۔ ہی ان دونوں کو ایک انوکھا اعتماد بخشے ہوئی تھی،

ایمل نہیں جانتی تھی کہ عرشیہ سے اس بات کو چھپانا۔ ان دونوں کی دوستی کے خاتمے کا سبب بن سکتی ہے۔

عرشیہ نے ایک دن منہ کھول کر اس کے کزن سے شادی کی خواہش کا اظہار نہیں کر دیا۔ ایمل کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، وہ کزن عابس ہی تھا۔

''پلیز۔ ایمی۔ ہیلپ می۔ میری۔ محبت کی نیا

۔ تیری مدد کے بغیر کنارے تک نہیں پہنچ پائے گی۔'' عرشیہ نے ایمل کا ہاتھ زور سے دبا کر کہا ''عرشی۔تم۔یہ کیا کہہ رہی ہو؟''۔ایمل میں اپنی جگہ سے ہلنے کی بھی طاقت نہ رہی۔بس وہ ایک ٹک دوست کے ہلتے ہونٹوں کو دیکھے جارہی تھی۔ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اسے پھانسی کی سزا سنارہی ہو۔عرشی اس کا ردعمل دیکھے بغیر اپنی داستان محبت سنانے میں مشغول رہی۔

''ایمی یقین مانو۔میں نے بہت کوشش کی، مگر تمہارے کزن کو ایک دن بھی نہ بھلا سکی۔'' عرشیہ۔نے کھوئے ہوئے انداز میں سر جھکا کر اعتراف کیا۔

''عرشیہ۔پلیز۔میری بات تو سنو'' ایمل کے ہاتھ پاؤں برف کی طرح سرد ہونے لگے۔اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

''دوست ماننے۔کی بات ہے۔تیرے کزن کا جادو مجھ جیسی پتھر دل پر بھی چل پڑا، دیکھتے ہی دل دے بیٹھی۔مگر بات ہے رسوائی کی۔'' عرشیہ نے ایمل کی بات سننے کی کوشش ہی نہیں کی۔شرارتی موڈ طاری تھا۔اس نے گنگناتے ہوئے گم سم بیٹھی ایمل کو گلے لگایا۔

''عرشی۔وہ۔ایک منٹ'' ایمل ہکلائی۔مگر عرشیہ تو اس وقت بادلوں پر چل رہی تھی۔

''اس۔بھری دنیا میں ایک تم ہی میری اپنی ہو۔کچھ کرونا۔اور سوچو۔اتنی حسین بیوی دلانے پر عابس بھی تمہارا گرویدہ ہوجائے گا'' عرشیہ کی شوخی عروج پر تھی۔وہ کیا جانتی تھی کہ عابس تو پہلے ہی پورپورا ایمل کے عشق میں گرفتار ہے۔

''کیا بات ہے ایمی؟۔سوری شاید میں کچھ زیادہ ہی بے شرمی دکھادی۔پر کیا کروں۔عشق پر زور نہیں'' ایمل کی مسلسل خاموشی پر اسے تشویش ہوئی۔

''ایسی کوئی بات نہیں عرشی۔پر تم نے عابس سے بھی پوچھا ہے، ہوسکتا ہے وہ کسی اور۔سے۔میرا مطلب ہے اس کے دل میں ایسی کوئی بات بھی نہ ہو'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ سچائی کیسے بتائے، پاس لگے پودے کا سبز پتہ نوچتے ہوئے تمہید باندھی۔

''ایمی۔۔ایسا مت کہو۔کہیں میری جان نہ نکل جائے۔اچھا۔اب باقی کی باتیں تم جانو، ناولوں میں نہیں پڑھا، سہیلی کیسے اپنی دوست کی مدد کر کے شہنائیاں بجواتی ہیں۔تم بھی کچھ کرو نا'' عرشی کھکھلائی، ایمل کو گدگدی کرتے ہوئے بولی۔

''عابس کا جادو اس پر بھی چل گیا۔مگر۔اس بیچاری کا کیا قصور۔میں خود بھی تو اسی راہ پر چل رہی ہوں''۔ایمل نے سر اٹھا کر عرشی کو دیکھا جو کھلا گلاب بنی کچھ سوچتے ہوئے آپ ہی آپ مسکرائی۔

''عرشی مجھے تم سے ایک سچائی شیئر کرنی ہے جو میں نے آج تک تم سے چھپائی'' ایمل نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔اسے لگا اب منگنی کی بات مزید چھپانا دوست کے ساتھ زیادتی ہوگی۔دل پر پتھر رکھ کر دھیرے دھیرے اسے ساری حقیقت بتادی۔اب سکتے میں آنے کی باری عرشیہ کی تھی۔

''تم۔تم۔دوستی کے نام پر دھبہ ہو، اتنی بڑی سچائی مجھ سے چھپا رکھی تھی۔میں کتنی بدقسمت ہوں، جو مجھے تم جیسی دوست ملی۔کتنی خوش قسمت ہو تم جس سے پیار کیا، وہ ہی تمہارا مقدر بنے گا۔ایک میں۔آہ۔'' وہ ایک دم چیخی۔غصہ آخر حسرت میں ڈھل گیا اور وہ رونے لگی۔

اور پھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''پلیز عرشی۔اس میں میرا کیا قصور ہے ؟۔میں نہیں جانتی تھی کہ تم اسی شخص سے محبت کر بیٹھو گی جو مجھ سے منسوب ہے۔اگر میں ۔تمہارے راستے سے ہٹ بھی جاؤں۔تب بھی وہ تم سے شادی نہیں کرے گا۔وہ مجھ سے پیار نہیں ۔عشق کرتا ہے۔پلیز مجھے معاف کردو دوست۔اس معاملے میں۔تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتی'' ایمل مجرم نہ ہوتے بھی گڑگڑانے لگی۔اس کی نرم دلی۔آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔وہ عرشی کے سامنے ہاتھ باندھ کر معافی طلب کرنے لگی۔عرشی نے اس کی مزید بات سننے سے انکار کردیا۔وہ اس وقت سمجھ بوجھ کی منزل سے بہت دور جا چکی تھی۔

''ایمی تم دنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی ہے۔میں کتنی بدنصیب ہوں۔جسے چاہا، وہ کسی اور کا نکلا''۔دماغ میں ایک ہی بات گردش کررہی تھی۔وہ مڑ کر دیکھے بغیر روتی ہوئی کالج کا دروازہ پار کرگئی۔

☆......☆......☆

عرشیہ اور عابس کی پہلی ملاقات کالج کے باہر ہوئی، جب گاڑیوں کی ہڑتال کی وجہ سے وہ ایمل کو لینے آیا تو، اسی کے اصرار پر عرشیہ کو بھی راستے میں اس کے گھر ڈراپ کردیا۔بس وہ ایک لمحہ تھا، جب عرشیہ اس کو دل دے بیٹھی، بغیر کچھ جانے بوجھے اس کی ہی ہوگئی۔اسی لیے اب یہ صدمہ برداشت کرنا مشکل ہورہا تھا۔

''اگر۔تم بیچ میں ہوتی تو میں دیکھتی کہ وہ کیسے مجھ سے منہ موڑتا'' عرشیہ ہونٹ کاٹتے ہوئے ایک ہی بات سوچنے لگی، ایمل اسے اپنی راہ کا کانٹا دکھائی دی۔

اس دن سے دونوں کے بیچ ان دیکھی دراڑ قائم ہوگئی۔ایمل نے اسے کئی فون کرکے منانا چاہا مگر وہ یا تو کال اٹینڈ نہیں کرتی یا رسمی سی بات کرکے لائن کاٹ دیتی، اس کے لہجے میں وہ گرمجوشی بھی مفقود ہوگئی جس کی ایمل عادی تھی ۔آخر وہ بھی عرشی کو فون کرنے سے ہچکچانے لگی۔

دونوں دھیرے دھیرے ایک دوسرے سے دور ہوتی چلی گئیں۔اچانک ایک دن، عرشیہ کی مما کا فون آگیا۔انہوں نے اس کی بات طے ہونے کی خوش خبری سنا کر شادی کی تیاریوں میں ایمل کو شریک ہونے کی تلقین کی۔وہ خوشی سے جھوم اٹھی ۔پر۔اس کے گھر جانے کی ہمت خود میں پیدا نہ کرسکی۔جس دن عرشیہ کی بڑی بہن صبیحہ اس کے نکاح کا کارڈ دینے ان کے گھر آئیں۔عارفہ نے بیٹی کو سب کے سامنے ڈانٹا۔کہ دوست کو مبارک باد دینے کیوں نہیں گئی۔

۔صبیحہ نے چلتے وقت اسے گلے لگایا اور بڑے مان اور خلوص سے اسے دعوت دی۔ایمل کے دل سے جیسے کوئی بھاری پتھر ہٹ گیا۔وہ ان دونوں کے بیچ قائم سرد مہری بھلا کر خود دوسرے دن وہاں جا پہنچی۔عرشیہ بھی ایسے موقع پر ایمی کی کمی شدت سے محسوس کررہی تھی۔ایک دم اس سے لپٹ کر رو دی۔آنسوؤں نے دل پر چھائی کثافتوں اور غبار کو دھو ڈالا۔ٹوٹے بندھن ایک بار پھر بندھ گئے ایمل سب کچھ بھول کر عرشیہ سے پہلے کی طرح ملنے لگی مگر عرشیہ کے دل میں کیا چھپا تھا، یہ تو رب ہی جانتا تھا۔

ایمل ۔عشاء کی نماز پڑھ کر سونا'' عارفہ کی آواز پر وہ ماضی کے سفر سے حال میں لوٹ آئی۔آنسو پونچھتی ہوئی، واش روم کی طرف بڑھی ،وضو کرنے لگی۔

☆......☆......☆

ایمل۔کی شادی کے لیے کوئی شاپنگ کرنی ہوتو کرلو' اریب آج جلدی گھر واپس آیا تو اس نے کافی پینے کے بعد بیوی کو آفر دی۔

''نہیں۔ایسی تو کچھ خاص تیاری نہیں کرنی۔شادی کے سارے کپڑے نئے ہی ہیں۔ان ہی میں سے کچھ پہن لوں گی'' عرشیہ نے بے زاری سے کہا تو اریب کو تھوڑا برا لگا۔وہ عارفہ کے خلوص کا گرویدہ ہوگیا تھا۔اسی لیے عرشیہ پر زور دیا۔وہ دونوں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تھے۔

''بیوی۔سنو۔وہ ہم لوگوں کو کتنا مان سمان دیتی ہیں۔ایک تم ہو،شادی کے دن قریب آگئے،اس کا بھائی کارڈ بھی دے گیا،پر تم ایک دفعہ بھی وہاں نہیں گئی۔چلو میں تو کام دھندے میں مصروف ہوں۔تمہیں تو جانا چاہیے۔بلکہ میں تو کہتا ہوں روزانہ جانا چاہیے۔'' اریب نے اس کے کبوتر جیسے ہاتھوں کو تھام کر نرمی سے سمجھایا تو عرشیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔منہ سے کچھ نہیں بولی۔

۔اچھا۔میرا ارادہ ہے کہ شادی کے بعد،نئے نویلے جوڑے کو فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر پر انوائیٹ کیا' جائے۔بولو۔تم کیا کہتی ہو؟۔میں نے اچھا پلان بنایا ہے نا؟' وہ بڑے مزے اس کی طرف دیکھے بناء بولے چلا جارہا تھا،عرشیہ کے چہرے کی رنگت مدہم ہوتی چلی گئی،آخر میں داد طلب وصولنے کے لیے بیوی کی طرف دیکھا تو پریشان ہوگیا،وہ تمتماتے سرخ چہرے سے غصے میں بھری اسے گھورے جارہی تھی۔

''پلیز۔بس کردیں۔دوست میری ہے۔فکر آپ کو ہورہی ہے۔جو منا سب لگا کرلوں گی۔لگتا ہے آپ بھی اس کی خوبصورتی سے گھائل ہوگئے ہیں'' وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر تنک کر بے سوچے سمجھے بولے چلی گئی،۔اریب کا دماغ گھوم گیا۔عرشیہ بات مکمل کرنے کے بعد وہاں رکی نہیں،پیر پٹختی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔اریب ایک دم افسردہ ہوگیا،جی میں آئی کہ اتنی بیہودہ بات کرنے پر جاکر عرشی کا منہ تھپڑوں سے لال کردے۔نئی نئی شادی ہوئی تھی۔برداشت کا ہاتھ تھام کر۔ایک گہری سانس لی۔خود کو سنبھالا،اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں گیا۔غلط فہمی دور کی جائے۔

وہ اسے صحیح بات سمجھانا چاہ رہا تھا،پر وہ کسی طور سمجھنے کے موڈ میں نہ تھی۔برداشت کی طنابیں ہاتھ سے کیا چھوٹیں۔ان دونوں کے درمیان خوب جم کر لڑائی ہوئی۔اریب غصے میں بھرا۔اسے روتا دھوتا چھوڑ کر گھر سے باہر نکل گیا۔

''ایمل۔مجھے تم سے آج ایک بار پھر بہت نفرت محسوس ہورہی ہے،تمہاری وجہ سے میری شادی شدہ زندگی میں تلخیاں گھل گئیں'' اپنی غلطی ماننے کی جگہ وہ پاگلوں کی طرح روتے ہوئے چیخ کر بولی۔

''تم۔کتنی خوش قسمت ہو،جس کو چاہا،اسے پالیا۔ایک میں ہوں،اسے بھول ہی نہیں پاتی،زندگی میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ایک کسک سی رہتی ہے۔کچھ کمی سی لگتی ہے''۔عرشیہ غائبانہ طور پر ایمل سے مخاطب ہوئی۔جب رورو کر دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو اسے ایک دم اریب کا خیال آیا،پچھتاوا بھی ہوا کہ بے جا جذباتیت نے بات کو اس حد تک آگے بڑھایا،فوراً اٹھی اور واش روم میں جاکر منہ دھونے لگی،تاکہ حلیہ درست کرکے اریب کا پتا کرے۔

''عرشیہ اریب ایک شادی شدہ عورت ہوتے ہوئے کسی نامحرم کے بارے میں اس انداز سے سوچنا تمہیں زیب نہیں دیتا،غیر بھی کون۔وہ جو اکلوتی دوست کا ہونے والا شوہر ہے'' اس کا

ضمیر مسلسل کچوکے لگانے پر تل گیا، منہ دھو کر جب آئینے میں خود کی شکل دیکھی تو چہرہ بہت برا لگا، نفی سوچ پر شرم محسوس ہونے لگی۔ فوراً۔ آئینے کے عکس سے نگاہیں چرائیں۔

''کاش میری زندگی میں وہ دن ہی نہیں آیا ہوتا، جب عابس کو پہلی بار دیکھا، کتنی پرسکون زندگی تھی۔ خوشیاں خریدنے نکلی اور۔ دکھوں کا سودا کر بیٹھی۔'' عرشیہ کی آنکھیں ایک بار پھر بھر آئیں، چہرہ پونچھتے ہوئے، وہ خیالوں میں کھوگئی۔

☆......☆......☆

عرشیہ کو اپنے آپ پر بہت فخر تھا، وہ خاندان کی سب سے حسین لڑکی کہلاتی تھی، ہرنی سی کھوئی کھوئی آنکھیں، دودھ میں شہد گھلی رنگت، چوڑی پیشانی، ننھی سی کھڑی ناک خوبصورت لہریے دار کمر کو چھوتے کالے سیاہ بال، سرو قد اور متناسب سراپا، وہ ایک شاہکار تھی۔ جوان ہونے کے بعد کئی لڑکوں نے اس کے حسن سے متاثر ہوکر پیش قدمی کرنا چاہی، پر وہ سب کو نظر انداز کرتی چلی گئی، محبت تو دور کی بات اس نے کسی کا دوستی کے لیے بڑھایا ہوا ہاتھ بھی نہ تھاما۔ ایک منفرد خیالات کی لڑکی تھی۔ ذہن میں ایک دھندلی سی تصویر بسائے، کسی کی جستجو میں مگن خوش باش زندگی گزارے جارہی تھی۔ جہاں چاہنے والے اپنا ہاتھ بڑھاتے نگاہیں، ان میں اپنا آئیڈیل تلاشتی مگر، کوئی اس کے معیار تک نہ پہنچ سکا۔ وہ مایوس ہوکر صبیحہ کے دیور اریب خان سے شادی کے لیے ہاں کرنے کا فیصلہ کر بیٹھی، کہ غیر متوقع طور پر اس کا سامنا عابس سے ہوگیا، عرشیہ گنگ سی رہ گئی۔

وہ اردو ایڈوانس کی کلاس میں تھی کہ اچانک فائرنگ کی آواز سے علاقہ گونج اٹھا، پتا چلا کہ ایک سیاسی کارکن کی ہلاکت پر ان کے حامیوں نے شہر کو بند کروانا شروع کر دیا ہے، ٹرانسپورٹ بند کردی گئی ہے۔ حالات اچانک خراب ہوگئے، کالج کی انتظامیہ نے چھٹی کردی، لڑکیاں تیزی سے گھر روانہ ہونے لگی سب کے گھر سے کوئی نہ کوئی لینے آرہا تھا۔ اتفاق سے عرشیہ کے پاپا ان دنوں شہر سے باہر گئے ہوئے تھے، بھائی سارے چھوٹے تھے۔ جب تک کوئی انتظام نہیں ہوجاتا۔ مما نے پریشان ہوکر فون پر کالج میں رکنے کی تاکید کی۔

''پورا علاقہ بند کرادیا گیا ہے۔'' ایک لڑکی نے اطلاع دی۔ یہ سنتے ہی اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، ،سڑکوں پر پبلک ٹریفک نہ ہونے کے برابر رہ گیا، بسوں کا بھی دور دور تک پتا نہ تھا، لوگوں کی حالات پر کمنٹری جاری تھی۔ وہ پریشان ہوکر کیفے ٹیریا میں جا بیٹھی، درود شریف کا ورد زبان پر جاری ہوا،

عرشیہ کو اس وقت ایمی پر بھی غصہ آیا جو بغیر بتائے چلی گئی، اچانک اسے ڈھونڈتی ہوئی ایمل کیفے ٹیریا میں داخل ہوئی، بخت سنا کر اس کا ہاتھ تھاما۔

'جلدی چلو۔ ست لڑکی۔ عابس باہر کھڑا ہے، وہ مجھے لینے آیا ہے، اس کو کہہ دیا ہے، پہلے تمہیں گھر چھوڑے گا،'' وہ جلدی جلدی بے ترتیبی سے بولی۔

''عابس۔ بھلا۔ یہ کون نمونہ ہے؟'' ایمل کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی، مسکرا کر پوچھا۔

''افوہ۔ میرا کزن ہے'' اس کی شوخیاں زہر سے بدتر لگی۔

باہر گاڑی میں بیٹھے عابس کا موڈ بڑی بری طرح سے آف ہوچکا تھا۔ ایمی کا ڈر کے مارے برا حال تھا، بڑی مشکلوں سے اسے منایا تھا کہ وہ عرشی کو گھر چھوڑ دے۔

''افہ۔ بلقیس ایدھی۔ حالات دیکھ رہی ہو'' عابس جھنجلایا۔ اتنے خراب حالات میں اسے

صرف ایمل کی فکر تھی، پر اس کی بے جا ضد اور انسانیت کی دہائیاں سن سن کر وہ بادل نخواستہ عرشیہ کو گھر چھوڑنے پر راضی ہوا، اب ایمی کا ڈر کے مارے برا حال تھا کہ وہ کہیں سہیلی کے سامنے کسی بداخلاقی کا مظاہرہ نہ کر بیٹھے۔

''سوچ کیا رہی ہو۔ جلدی چلو، نیکی کے فرشتے کو اتنا انتظار کروانا ٹھیک نہیں'' گھر جانے کا مسئلہ کیا حل ہوا عرشیہ نے سکون کا سانس لیا، اس نے سوچوں میں ڈوبی ایمی کو جھنجھوڑا تو سچویشن کا اندازہ کرتے ہوئے ان دونوں نے دروازے کی جانب دوڑ لگائی،

،عرشیہ جیسے ہی بلیک لیانا کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھی۔ ایک مسحور کن مردانہ خوشبو نے اسے اپنی لپیٹ میں لیا، وہ جھوم اٹھی۔

''واؤ۔ کیا بندہ ہے؟۔ بڑی زبردست خوشبو استعمال کرتا ہے''، وہ دل ہی دل میں اس کزن کے اعلیٰ ذوق کی قائل ہوگئی۔ ایمل فرنٹ سیٹ پر خاموشی سے جا بیٹھی۔ عرشیہ نے گاڑی چلانے والے کا بغور جائزہ لینا شروع کر دیا۔

''یہ۔ تو بڑی سنجیدگی سے ڈرائیونگ میں مشغول ہے۔ لڑکیوں سے الرجک ہے کیا؟'' عرشیہ اس کی بے توجہی پر اداس ہوئی۔ عابس نے ایک بار بھی نگاہیں اٹھا کر ان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ پہلی بار احساس ہوا کہ کوئی اس کے حسن بلاخیز کو یوں نظرانداز بھی کر سکتا ہے۔

عابس بلیک گلاسز آنکھوں پر لگائے، جینز اور ٹی شرٹ میں ہلکی سی بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ رفتہ رفتہ اس کے دل پر قبضہ جماتا چلا گیا، سب سے متاثر کن بات، اس کی سنجیدگی اور پروقار انداز۔ وہ کب سے متلاشی تھی۔ پہلی نظر کی محبت کا سنا تو بہت تھا۔ خود پر گزری تو یقین ہو چلا۔ دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ وہ تو اجنبی تھی پر ایمل سے بھی اس نے ہونہہ ہاں کے سوا کوئی بات نہ کی۔ عرشیہ پورے راستے بے دھیانی میں بس اسے دیکھتی رہی۔ عابس ان دونوں سے بے نیاز بنا خاموشی کے ساتھ چوکس انداز میں گاڑی چلاتا رہا۔ شہر کے حالات کافی خراب تھے۔ ان دونوں لڑکیوں کو گھر پہنچانے کی ذمہ داری اس کے کاندھوں پر تھی۔ اسے سنجیدہ ہونا ہی تھا۔

یہ میرا آئیڈیل ہے، ضرور میری قسمت بدلے گا۔ مگر ایسا نہ ہوسکا۔ اس نے جب ایمل کے سامنے حال دل سنایا تو یہ سن کر دل ڈوب گیا کہ وہ تو سہیلی کا منگیتر نکلا۔

''کاش وہ نہیں ملا ہوتا تو زندگی آزاروں کی نذر نہیں ہوتی'' ایمل سے سچائی جاننے کے بعد جب وہ گھر لوٹی تو کمرہ بند کر کے اپنی پہلی محبت کی موت کا جی بھر کر سوگ منایا، خوب روئی، قسمت کو سا۔ ایمل سے قطع تعلق کر لیا۔ اس کے باوجود۔ عابس کو نہ بھلا سکی۔ زندگی سے بیزار ہونے لگی تو۔ مجبوراً بہن کی بات مان لی۔

مما کے پوچھنے پر اریب خان سے شادی کی حامی بھر لی۔ کبھی کبھی اسے یہ سوچ کر بھی شرم آتی کہ اگر ایمی نے اس کی یک طرفہ محبت کے بارے میں عابس کو بتا دیا ہو تو وہ اس کے بارے میں کیا سوچتا ہوگا؟، اسے کتنا ہلکا تصور کرتا ہوگا، وہ جتنا سوچتی اتنا ہی پاگل ہونے لگتی۔ یوں لگتا کہ یہ دکھ ایک شعلہ سا ہے جس نے اس کے ہر پہلو کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اسی لیے اس کی شادی میں جاتے ہوئے جھجک رہی تھی، اس پر اریب کی طرف داری نے اندر تک آگ لگا دی۔

☆......☆......☆

عابس خود تو مصروف تھا، مگر باسط کو بھی مسلسل

نئے نئے کاموں میں مصروف کیا ہوا تھا، یہ پہلا دلہا تھا جو شادی کی ہر چیز کو اپنی زیر نگرانی تیار کروانے پر تلا بیٹھا تھا، فاروق بیٹے کے پاگل پن پر ہنستے تو زرین ناک بھوں چڑھاتی مگر اس حسین موقع پر کوئی کمی دیکھنا اس کے اختیار سے باہر تھا۔ اس وقت بھی وہ کانوں سے فون لگائے، ٹہل ٹہل کر اپنے خاندانی جوہری کو جھاڑ پلانے میں مصروف تھا۔

انور بھائی۔ آپ نے اچھا نہیں کیا، ابھی تک رنگ تیار نہیں ہوئی۔ چار چکر لگا چکا ہوں۔ کتنے چکر لگوائیں گے؟۔ وہ منہ بنا کر بولا۔

''چار دن پہلے انگوٹھی دینے کا وعدہ کیا، جواب تک وفا نہ ہو سکا۔ شادی کا دن آ گیا ہے۔ منہ دکھائی کا تحفہ۔ ویسے میں دینے سے رہا۔ مجھے پتا ہوتا کہ اتنا لیٹ ہو جائے گا۔ تو آرڈر کینسل کر کے، بنی بنائی انگوٹھی خرید لیتا''۔

چھوٹی بہن زارا پاس ہی کرسی پر بیٹھی بھائی کی بے چینیوں سے لطف اٹھانے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ عابس نے ایمی کو منہ دکھائی میں دینے کے لیے سب سے چھپا کر ایک نازک سی ڈائمنڈ کی رنگ بنوائی ہے، وہ سرپرائز کے چکر میں مارا گیا۔ اب رنگ کی ڈیلیوری اتنی لیٹ ہو گئی کہ شادی کا دن سر پر آ پہنچا، بھائی اسی لیے بڑا پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

''اچھا، ٹھیک ہے۔ میں دو بجے تک آتا ہوں، پلیز مکمل فنشنگ کے ساتھ اسے سرخ رنگ کے ایک وی آئی پی باکس میں تیار رکھیے گا'' عابس نے دوسری طرف کی بات سن کر سکون کی سانس لی اور مزید ہدایات جاری کی۔

عابس نے وائٹ گولڈ کی رنگ میں تین ہیرے جڑوائے تھے۔ اسے یقین تھا کہ ایمی نازک اور نفیس انگوٹھیوں کی دیوانی ہے، منہ دکھائی میں یہ تحفہ پا کر خوشی سے جھوم اٹھے گی۔

''بھائی۔ آپ تاریخ کے وہ پہلے دلہا ثابت ہوں گے، جس نے اپنی دلہن ڈھونڈنے کے لیے نہیں، بلکہ منہ دکھائی کے گفٹ کو حاصل کرنے کے لیے اپنے جوتے گھسوا ڈالے'' زارا کھلکھلائی۔ بھائی کو چھیڑا۔

''بلی۔ تم چھپ کر میری باتیں سن رہی تھی'' وہ چونکا۔ بہن کی شرارتی نگاہوں کی تاب نہ لا کر جھینپ اٹھا،

''نہیں۔ بھائی۔ چھپ کر نہیں۔ کانوں سے سن رہی تھی۔ آپ بھی تو اتنی زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ پڑوس والوں تک بھی یہ سرپرائز پہنچ گیا ہوگا'' زارا نے مبالغہ آرائی کی حد کرتے ہوئے، بھائی کو ترنت جواب دیا، کچھ اور نہ بن سکا تو بہن کے سر پر پیار سے چپت لگاتے ہوئے ہنس دیا۔

☆......☆......☆

''یہ۔ اس وقت تم کہاں چلے؟، بارات لے جانے میں چند گھنٹے رہ گئے ہیں۔ جانتے بھی ہو کہ ہمارے خاندان کی برسوں پرانی ریت۔ شادی کے دن دلہا صرف اپنی بارات کے ساتھ گھر سے باہر قدم نکالتا ہے۔ ورنہ بڑی بدشگونی ہو جاتی ہے''۔ عابس خاموشی سے گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل رہا تھا کہ پکڑا گیا۔ زریں کی نظر پڑ گئی۔ وہ وہیں سے چیخ اٹھیں۔

''افوہ۔ مما۔ دنیا کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ آپ لوگ اس طرح کی توہم پرستی میں ہی اٹکے ہوئے ہیں۔ کچھ نہیں ہوتا۔ ایک گھنٹے میں آتا ہوں'' عابس جو جیولرز کے پاس جا رہا تھا یوں ٹوکنے پر چڑ گیا، جھنجلا کر ماں سے بولا اور چوڑی کلائی پر بندھی گھڑی میں ٹائم دیکھا،

''میری جان۔ آج باہر کے سارے کام چھوڑ دو۔ تھوڑی دیر کی تو بات ہے''، انہوں نے پیچھے

سے ہی آواز لگائی، مگر وہ سنی ان سنی کرتا نکل گیا۔ زریں کا جی ہول اٹھا، سوچا کہ دوڑ کر بیٹے کی راہ میں کھڑی ہوجائیں، اسے جانے نہ دیں۔ جتنی دیر میں وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتی اس کی گاڑی کی مخصوص آواز کانوں میں پڑی، پہیوں کی چڑاچڑاہٹ پر ان کا دل ڈر گیا۔ وہ بہت تیز ڈرائیونگ کرتا ہوا نکلا تھا۔

☆......☆......☆

ایک ہفتہ ہوگیا، وہ عابس سے بات کرنے کو ترس گئی۔ مگر۔ دونوں اپنی اپنی ماؤں کی پابندیوں کی نشانے پر تھے۔

''اب ۔تم دونوں ۔شادی کے بعد ہی بات کرنا۔ ہمارے زمانے میں تو منگیتر سے باقاعدہ پردہ کرایا جاتا تھا، اب تو بھیا۔ کسی کو کیا کہیں۔ کم ازکم ایک مہینہ تو بات چیت سے پرہیز کرلو، ورنہ جب دلہن بنو گی تو چہرے پر پھٹکار برسے گی'' عارفہ نے ہفتہ بھر قبل بیٹی کو کانوں سے فون لگائے دھیرے دھیرے باتیں کرتا دیکھا ڈانٹ لگائی۔ اس کے ہاتھوں سے گھبراہٹ میں سیل فون چھوٹ گیا۔ شامل منہ دبا کر ہنس دی، دوسری طرف موجود عابس بھی مسکرادیا۔

ایمل اپنے سرخ کامدار بھاری برائیڈل ڈریس کو چیک کر رہی تھی، پارلر کانے کا وقت ہوچکا تھا، چوڑیوں کا سیٹ اٹھاتے ہوئے، وہ چھچھنا اٹھیں تو اس کے دل میں عابس کی یاد گنگنائی، اچانک شامل فون ہاتھ میں لیے کمرے میں داخل ہوئی۔

ہیلو۔ ایمی۔ ڈارلنگ۔ کیا کررہی ہو؟'' شامل نے اس کے قریب پہنچ کر کانوں سے موبائل لگادیا، دوسری طرف عابس تھا۔ اس کا محبت بھرا لہجہ۔ ساری تکان ہوا ہوگئی ۔ اندکی توانائیاں جاگ اٹھیں۔

''جی ۔ٹھیک ہوں۔ بس جانے کی تیاری۔ کیا کوئی کام تھا؟'' بہن کی موجودگی کی وجہ سے وہ دبی آواز میں بولی۔

''نہیں۔ آپ کی یاد آنے لگی، دل ناداں کو بہت سمجھایا، بات کیے بناء رہ نہیں پایا، ۔ اچھا۔ سنو میرے لیے۔ خوب سجنا سنورنا، تاکہ۔'' عابس کا لہجہ معنی خیز ہونے لگا۔ وہ گھبرا اٹھی۔

''عابس۔ آپ بھی نا'' ایمی نے بیچ میں ٹوکنا مناسب سمجھا۔

چلو ۔جان۔ بیسٹ آف لک ۔ پریشان نہ ہونا۔ ۔اب۔ آپ کے جملہ حقوق اپنے نام کروانے کے بعد ہی بات کروں گا'' اس کے ذہن کے پردے پر ایمی کی شرمائی ہوئی تصویر ابھری تو وہ محبت سے گندھے لہجے میں بولا۔

ایمل کے چہرے پر شرم کی لالی بکھرتی چلی گئی ۔جواب دینا بھی مشکل ہوگیا۔ پلکیں لرزنے لگی۔ شامل جو اس سچویشن سے محظوظ ہورہی تھی ۔اس نے بڑی بہن کو زبان چڑائی اور ایمی کے اشارے پر لائن کاٹ دی۔ پیار سے بہن کو گلے لگا کر بالوں میں بوسا دیا۔ اس کے وجود سے اٹھتی ۔ابٹن کی بھینی بھینی مہک۔ وہ زرد لباس میں گیندے کا پھول بنی ہوئی تھی۔

اللہ جی۔ میری بہن کو بری نظروں اور ہر مصیبت کی گھڑی سے بچانا'' شامل نے دل ہی دل میں بہن کی خوشیوں کے لیے دعا مانگی، مگر شاید وہ وقت قبولیت کا نہیں تھا۔

کیوں کہ کبھی کبھی قسمت کا لکھا ہوکر رہتا ہے۔ دعاؤں سے بھی تقدیر نہیں بدلتی۔

☆......☆......☆

مما۔ بس۔ بس۔ دس منٹ میں گھر پہنچ جاؤ

ں گا۔ پریشان نہ ہوں۔ آپ کے بیٹے کی بارات وقت پر ہی نکلے گی'' عابس جیسے ہی ''شاہ جیولرز'' کے یہاں سے انگوٹھی لے کر نکلا۔ اس کا سیل فون بج اٹھا، گھر کا نمبر دیکھ کر مسکرایا۔ زریں نے بغیر کچھ سنے بیٹے کی کلاس لگانا شروع کر دی، وہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے بھی، ان کی پیار بھری ڈانٹ سنتا رہا۔ جب تھک کر چپ ہوئیں۔ تو اس نے دلاسہ دے کر لائن کاٹ دی۔

''اف۔ یہ۔ ماؤں کا دل بھی۔ چوزے جیسا ہوتا ہے۔'' وہ سائیڈ گلاس سیٹ کرتا ہوا بڑبڑایا۔

یہ ٹرک والا پاگل تو نہیں۔ الٹے ٹریک پر آرہا ہے'' عابس نے عادت کے برخلاف گھر پہنچنے کی جلدی میں کار کی اسپیڈ کافی بڑھا رکھی تھی اچانک غلط سمت سے ایک تیز رفتار ٹرک نمودار ہو۔ اس نے رفتار کم کرنے کی کوشش کی۔ بریک پر پاؤں کا دباؤ ڈالا۔ ٹرک کے پہیوں کی زوردار آواز فضاء میں گونجی۔ ہونی کو کون ٹال سکتا تھا۔ دونوں گاڑیاں بے قابو ہو کر دھماکے سے۔ ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔ اتنا بڑا حادثہ دیکھ کر لوگوں میں شور بلند ہوا، سڑک پر منٹوں میں ہجوم جم غفیر لگ گیا۔ کسی نے عابس کا سیل فون اٹھا کر لاسٹ کال ملائی اور اس کے گھر حادثے کی خبر دی۔ جہاں صف ماتم بچھ گیا۔

☆......☆......☆

''پلیز۔ آپ ریلکس ہو کر بیٹھیں،'' ایمل نے کرسی پر ایک بار پھر بے چینی سے پہلو بدلا تو شوبی نے اسے ٹوک ہی دیا۔ یہ شہر کا ایک معروف بیوٹی پارلر تھا، جہاں وہ دلہن بننے آئی تھی۔ شوبی یہاں کی مالکن تھی۔ عابس کی خواہش تھی کہ ایمل آج اپسرا کا روپ دھارے،۔ صبح تک تو وہ بہت خوش تھی۔ جانے کیا بات ہوئی، اب اسے اچانک سے گھبراہٹ شروع ہوگئی۔ کسی پل قرار نہیں آرہا تھا۔ کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

''میم۔ پلیز ایک منٹ'' ایمل نے اپنا سیل فون اٹھایا اور شوبی کی گھورتی نگاہوں کی پرواہ کیے بغیر سائیڈ میں جا کر عابس کا نمبر ملایا۔ کافی دفعہ ٹرائی کیا، بیل جا رہی تھی مگر کوئی رسپانس نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ فون ملائے اور عابس نہ اٹھائے۔ دل تھام کر رہ گئی۔ سامنے لگے بڑے سے آئینہ میں خود کو دیکھا، سرخ زرتار لباس میں شعلہ جوالہ بنی ہوئی تھی، مگر پتا نہیں چہرے پر کہاں سے زردیاں سی کھنڈ گئیں۔

''یار۔ جس دن میں اس دنیا میں نہیں ہوں گا۔ بس تب تمہاری کال ریسیو نہیں کروں گا'' ۔ ایمل ہمیشہ اس کے پہلی بیل پر فون اٹھانے کا ریکارڈ لگاتی تو وہ یہ دعویٰ کرتا۔ ایسے بدفال نکالنے پر وہ اس سے خوب لڑائی کرتی۔ پرانی بات کیا یاد آئی۔ اس کو لگا جیسے دل پاتال کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا ہو، صبح سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا، ایسا زور کا چکر آیا کہ پاس پڑی کرسی پر گر گئی۔

''نہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ پلیز۔ کہہ دو۔ یہ جھوٹ ہے'' شامل جو بہن کے ساتھ آئی ہوئی تھی، وہ فون پر کسی سے بات کرتے ہوئے ایک دم چیخنے لگی۔

''یا اللہ۔ خیر'' ایمل نے دل پر ہاتھ رکھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا۔

''تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے، ہم بھری دنیا میں تنہا ہوگئے'' مغنیہ کی صدا نے دل چیر دیا، جانے کب آنکھوں سے آنسو کی قطار در قطار خودبخود بہے جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

''آؤ۔ عرشی بیٹھو۔ کیسی ہو؟'' ایمل نے

نگاہیں اٹھا کر دوست کو دیکھا اور کھسک کر بستر پر اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔ وہ چند دنوں میں ہی سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھی پھیکے رنگ کے لباس میں خود بھی پھیکی سی ہو رہی تھی۔ دوست کی حالت پر عرشیہ کا دل پھٹا جا رہا تھا۔

میں ٹھیک ہوں۔ پر تم نے اپنی یہ کیا حال بنالیا ہے؟۔ جانے والا تو چلا گیا۔ پلیز جان اپنے آپ کو سنبھالو''۔ وہ ایک دم جذبات میں آ کر پھٹ پڑی۔ ایمل یوں ہی پتھر کی مورت بنی اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔ جو کچھ اس کے ساتھ پیش آچکا تھا، اتنا دکھ دینے والا تھا، کہ اب کسی دوسری بات پر تکلیف کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ عرشیہ کے آنسو بہتے چلے گئے۔

عابس کی جوان موت کے بعد سے عرشیہ ہر دوسرے دن اس کے گھر پہنچ جاتی۔ وہ سہیلی کی حالت پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتی۔ وقت بھی کیسے کیسے کھیل دکھاتا ہے۔ انسان کی سوچ سے بھی بالا قسمت کے فیصلے ہوتے ہیں۔

''عرشی یاد ہے۔ جب میں نے تمہیں اپنی اور عابس کی محبت کے بارے میں آگاہ کیا تو تم کتنا بھپر اٹھی، خود کو بد نصیب اور مجھے خوش قسمت ٹھہرایا۔ ایمل نے ویران نگاہوں سے دوست کو دیکھا اور سرسراتی آواز میں بولی۔ عرشی نے شرمندگی سے سر جھکا لیا، کہتی بھی تو کیا، کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں۔

''میری بہن آج کے بعد ایک بات یاد رکھنا۔ تقدیر لکھنے والا، ہی جانتا ہے کہ کس کے نصیب میں کیا ہے؟۔ وہ ہی جانتا ہے۔ تمہیں کتنے سکھ ملنے والے تھے، مجھے اتنے دکھ۔ غم۔ تکلیف۔ پریشانی۔ ہر ایک کی زندگی میں اپنے وقت پر آتے ہیں۔ اس کے لیے ایک دوسرے کو الزام دینا، رشتوں کی ڈوریں کاٹنا، ملنا ملانا چھوڑ دینا صحیح نہیں۔ آج مجھے دیکھو۔ میں جس غم میں مبتلا ہوں، اللہ نے تمہیں ان سے محفوظ رکھا ہے'' ایمل نے اپنی سوجی ہوئی سرخی مائل نگاہوں کو اٹھایا، کیا نہیں تھا ان میں، کسی اپنے کو کھونے کا دکھ، بچھڑنے کی تکلیف، ایسا لگتا تھا کہ، اداسیوں، نے اس کے موتی سے وجود کو دھندلا کر رکھ دیا ہو، عرشی کے لیے اپنی دوست سے نگاہیں ملانا، ایک کڑا امتحان ثابت ہوا، اس نے ایمی کے لرزتے ہاتھوں کو تھام کر محبت سے دبایا۔ ایک زبردستی کی پھیکی سی مسکراہٹ ایمی کے خشک پپڑی زدہ لبوں پر چھا گئی، یوں لگا مسکان کے پردے میں کئی درد اس کے ہونٹوں کو چھو گئے ہوں۔

''کاش۔ میرے اختیار میں ہوتا۔ تو میں تمہارے لیے وہ کچھ کرتی جس سے تمہارے دل کو سکون حاصل ہو جاتا'' عرشیہ نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

''نہیں۔ عرشی۔ تقدیر کے سارے فیصلے تو اوپر ہو جاتے ہیں، یہ تو ہمارا رب ہی جانتا ہے کہ کس کے لیے کیا بہتر ہے؟۔ ہمارا کام تو اس کی رضا کے آگے سر جھکانا، ہر حال میں صبر و شکر کا دامن تھامے رکھنا ہے'۔ میں تو شکر ادا کرتی ہوں کہ مجھے عابس جیسی سچی محبت کرنے والا انسان ملا۔ جس نے مجھے جینا سکھا دیا۔ اتنا چاہا کہ۔ اب زندگی میں مزید چاہے جانے کی کوئی حسرت باقی نہیں رہی''۔ ایمل نے ٹھنڈی سانس بھر کر سامنے دیوار پر لگی عابس کی تصویر کو دیکھ کر کہا۔ عرشی کی نگاہ تصویر پر پڑی تو ایسا لگا کہ وہ ابھی فریم سے نکل کر ان کے سامنے آ کھڑا ہوگا۔ بعض لوگ اتنے بھرپور اور پر اثر ہوتے ہیں کے ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی۔ ان کی موت

کا یقین نہیں ہوتا یوں لگتا ہے کہ وہ یہیں کہیں۔آس پاس موجود ہیں۔بس ہمیں دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔

''امی۔میرے پاس وہ الفاظ نہیں ،جو تمہاری تشفی کرا سکیں۔یہ وہ غم ہے ،ایسا نقصان ہے جس کا مداوا مشکل ہے'' عرشیہ کا چہرہ اداسی میں ڈھل گیا۔،آنسو موتیوں کی طرح ٹوٹ کر اس کے دامن کو بھگونے لگے۔

''پلیز۔عرشی چپ ہو جاؤ۔یوں نہ رو۔ورنہ عابس کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔اس کی مغفرت کی دعا کرو۔آج تمہیں مجھ سے ایک وعدہ بھی کرنا پڑے گا کہ کبھی کسی کی زندگی پر رشک کرتے ہوئے خود کو بد قسمت نہ ٹھہرانا۔اللہ جی۔تمہیں اور اریب بھائی کی زندگی کو خوشیوں سے بھرا رکھے۔دوسروں کے لیے ایک ہی دعا کرنا کہ کسی کی قسمت ایسی نہ لکھی جائے کہ دکھ اور تکلیف کا موسم ہمیشہ کے لیے اس کے من آنگن میں ٹھہر جائے'' ایمل نے ایک سرد آہ بھری۔عرشیہ کے وجود کو سہیلی کی حسرت نے جکڑ لیا۔اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میرے رب کا شکر ہے کہ میں تنہا نہیں۔میری زندگی کا اثاثہ عابس کی یادیں ہیں۔وہ میرے زخموں پر مرہم کا کام دیں گی''۔ایمل نے ہاتھ میں پہنی رنگ کے ڈائمنڈز پر اپنی انگلی پھیرتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا، یہ انگوٹھی عابس کی گاڑی کے ڈیش بورڈ سے نکلی تھی۔جو اس خوف ناک حادثہ کا شکار بنی ،جس کی وجہ سے کئی دلوں کی دھڑکن بند ہوتے ہوتے رہ گئی۔

''ڈیئر'تم۔ٹھیک کہتی ہو۔میں اپنی منفی سوچ پر بہت شرمندہ ہوں۔آج نصیب کے لکھے کی قائل ہوگئی ہوں۔ہم لوگ شدت جذبات میں آ کر نادانی کرتے ہیں۔رب کی مرضی کو بے چوں و چراں ماننے کی جگہ اپنی ناقص عقل کے حساب سے زندگی میں درپیش واقعات پر خوش قسمتی یا بد قسمتی کے ٹھپے لگاتے ہیں۔جانے کیوں۔یہ بھول جاتے ہیں؟ کہ پتہ بھی اس کی مرضی کے بناء نہیں ہلتا۔دعاؤں کی مدد سے نصیب بدلنے کی جگہ لوگوں سے حسد کرنے لگتے ہیں۔عرشیہ کی ندامت ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی ،وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی ،تاہم اس کے دل کو یقین تھا کہ اللہ جی اپنے بندوں کی برداشت سے بڑھ کر انہیں دکھ نہیں دیتا۔نے ایمل کی زندگی کے اندھیروں کو دور کرنے کے لیے ،اس کی قسمت میں یقیناً کچھ اور اچھا لکھا ہوگا۔

عرشیہ کافی دیر دوست کے پاس بیٹھنے کے لیے اریب کے ساتھ گھر جانے کو اٹھی تو عارفہ نے ایک بار پھر اسے روک کر ایمل کی شادی کا انویٹیشن دیا ،مگر آج حالات کل جیسے نہیں تھے۔نہ ہی ان کا چہرہ خوشیوں سے تمتما رہا تھا ،نہ ہی در و بام جگمگا رہا تھا ،ہر سو دکھ کی چادر پھیلی ہوئی تھی ،اس کی آنکھوں سے موتی گرنے لگے۔

بیٹا۔کل ایمل اور باسط کا سادگی سے نکاح ہے ،وہ پاگل تو کسی طرح سے مان نہیں رہی تھی ،ساری عمر عابس کے نام پر گزارنا چاہتی ہے۔مگر زندگی یوں نہیں گزرتی۔بڑی مشکلوں سے اسے سمجھا کر راضی کیا ہے۔تم بھی شریک ہونا اور اپنی دوست کو خوشیوں کی نئی شروعات کے لیے آمادہ کرنا'' عارفہ نے عرشیہ کا ہاتھ تھام کر کہا تو وہ سر ہلاتی بے اختیار ان کے گلے لگ گئی ،بعض اوقات الفاظ بے معنی ہو جاتے ہیں۔اس سے کچھ کہا ہی نہیں گیا ،ہاں ایمل کے اچھے نصیب کے لیے دل سے دعائیں نکلتی چلی گئیں۔

☆☆......☆☆

"میں تمہارے سامنے جواب دہ نہیں ہوں مسٹر دلاور اور میں اپنے بھائی کے ساتھ گئی تھی۔ تمہارے ہاں بھائی کے ساتھ باہر جانے کو آوارہ گردی کہا جاتا ہوگا مگر ہمارے ہاں ایسا نہیں ہے۔" ذویا نے تیز لہجے میں جواب دیا تو وہ مجوبز سا ہوگیا۔ "دھی رانی، تُو جا اپنے کمرے میں آرام کر۔" بے جی نے ذویا سے کہا تو......

اپنے نفس کی بھوک پیاس مٹانے کی لذت اُٹھا کے بھی اُن کو چین نہیں ملتا اور معصوم لڑکیوں کو کسی بے گناہ کے ساتھ بدنام کر کے اُسے بدکردار ظاہر کر کے موت کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں۔ سر سے پیر تک گناہوں کی دلدل میں دھنس چکے ہیں یہ لوگ۔ نادان، کم عقلے تے کم علمے یہ نہیں جانتے کے اگر تم کسی کی دھی، بہن کی عزت مٹی کرو گے، تو اس کی سزا تمہاری اپنی بہن، بیٹی، بیوی کو ملے گی۔ یہ تو وہ گناہ ہے جو پلٹ کر اُس آدمی کے اپنے ہی گھر میں داخل ہو جاتا ہے۔ توبہ توبہ...... اللہ سائیں معاف کرے ہمیں۔ برائی سے بچا کے رکھے نیکی کی ہدایت دے، ہم سب کو۔"

مولوی رحمت اللہ نے سرائیکی لہجے میں اپنی بات اردو زبان میں بہت کامیابی سے اُن تک پہنچائی تھی۔ ذویا اور بوبی مولوی صاحب کے تفکر و خیال سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔

ورنہ تو اُن کا خیال تھا کہ مولوی صاحب کو ملکی حالات اور قصبے کے معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں ہوگی وہ صرف رَٹی رٹائی واعظ اور تقریر کریں گے اُن کے سامنے بھی...... مگر وہ انہیں ایک حساس دل رکھنے والے باعلم شخص محسوس ہوئے۔

"آمین۔" بوبی نے کہا تو ذویا نے اُن سے پوچھا۔

"مولوی صاحب! آپ کی کتنی بیٹیاں ہیں؟"

"میری ایک دھی تھی۔"

"تھی۔" اُن دونوں نے حیرانگی سے اُنہیں دیکھا تو وہ دکھ سے آہ بھر کے بولے۔

"آہ ہا...... مرگئی شودی (بے چاری)۔"

"مگر کیسے؟" ذویا نے پوچھا۔

"وڈیرے رُستم کے ہاتھوں لٹ گئی تھی۔ عزت تو بچی نئیں تھی۔ بدنامی اور رسوائی کا خوف اندر ہی اُس کو چاٹنے لگا۔ اُسے پتا تھا کہ اُسے بھی کالی کر کے مار دیں گے۔"

اپنی عزت کے لٹنے کی خبر تو بس گھر کے آنگن میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ سرگوشیاں...... آوازوں کے شور میں بدل جاتیں۔

آمنہ دھی نے پنڈ کے کنویں میں کود کے اپنی جان دے دی۔ پنڈ کے لوگ تو یہی سمجھتے ہیں کہ وہ کنویں میں پانی بھرنے گئی تھی بے دھیانی میں کنویں میں گرگئی اور مرگئی۔

وہ کیا جانیں؟ کہ وہ شودی (بے چاری) اپنی ذلت کا راز اپنے سینے میں لے کر ہی اس دنیا سے چلی گئی۔ اور وڈیرے بھی مطمئن ہوگئے کہ اُن کے سر سے بلا ٹل گئی۔ انہیں جھوٹی پنچائیت کا ڈھونگ رچانے کی لوڑ (ضرورت) بھی نہیں پڑی۔

مولوی رحمت اللہ نے دُکھ میں ڈوبی آنسوؤں سے بھیگی آواز میں یہ درد انگیز انکشاف کیا تو وہ دونوں ششدر رہ گئے۔

''اوہ مائی گاڈ! یہ تو اندھیر نگری ہے۔'' بوبی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا تو ذویا بھی دکھ سے بولی۔

''بہت دکھ ہوا مولوی صاحب! اللہ آپ کو صبر دے، آمنہ کو جنت میں جگہ دے...... اور ظالم اپنے انجام کو ضرور پہنچے گا۔''

''انشاء اللہ! رب سوہنا ظالماں گوں سزا دے سی ضرور دے سی۔'' مولوی رحمت اللہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''کھانا تیار ہے۔'' ہاجرہ اور عظمت اللہ نے

درمیان میں بچھے پلنگ پر دستر خوان بچھا کے کھانا چُن دیا۔ مرغی کا سالن اور مرغ پلاؤ، ساتھ میں ہری چٹنی کا رائتہ، تازہ گرم گرم روٹیاں تھیں۔ ذویا اور بوبی شرمندہ ہوگئے اس قدر اہتمام دیکھ کر۔

''اتنا کچھ چاچی، آپ نے بہت زحمت کی۔ ہمیں شرمندگی ہو رہی ہے۔'' ذویا نے ہاجرہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہ پُتری ایسی بات نئیں کرتے، ہمیں تو بہت خوشی ہے کہ تُوساں ساڈے گھر آئے ہو۔ بسم اللہ کریں۔'' ہاجرہ نے مسکراتے ہوئے بہت محبت سے کہا تو انہوں نے کھانا شروع کیا۔

''بہت مزیدار کھانا ہے چاچی، پلاؤ تو بہت ہی مزیدار ہے۔ بہت بہت شکریہ سچ مزا آ گیا کھانے کا۔'' ذویا نے میٹھا کھاتے ہوئے کہا میٹھے میں ہاجرہ سویاں بنا لائی تھی۔

''مہربانی تُوساں کو پسند آیا میڈی محنت وصول ہوگئی۔'' ہاجرہ نے خوش ہو کر کہا اُس کا بیٹا نعمت اللہ آیا تو بوبی نے اسے ہزار کا نوٹ دیا۔ مولوی صاحب اور ہاجرہ دونوں منع کرتے رہ گئے۔

''اُف! آج تو بہت تھک گئی میں۔'' وہ دونوں مولوی رحمت اللہ کے گھر سے باہر نکل آئے تھے۔

''میں بھی۔'' بوبی نے اُس کو دیکھا۔

''کتنے اچھے اور مہمان نواز ہیں یہاں کے لوگ اسپیشلی مولوی صاحب اور اُن کی فیملی۔'' ذویا نے اُس کے ساتھ پیدل چلتے ہوئے کہا۔ گاؤں میں رات اتر چکی تھی۔ ذویا نے ریسٹ واچ پر نگاہ ڈالی پونے آٹھ بج رہے تھے اور گاؤں میں سناٹا سا چھا گیا تھا۔ بس اِکا دُکا دکانیں کھلی تھیں۔

''ہاں، پھر کیا خیال ہے کل واپس چلیں میں تو کل ہر صورت چلا جاؤں گا واپس۔'' بوبی نے گاڑی کے قریب پہنچ کر کہا۔

''تم چلے جانا میں ابھی رُکوں گی۔ میں تو یہاں ایک فیچر لکھنے آئی تھی۔ لیکن یہاں کے حالات دیکھ کر اور حقیقت جان کر مجھے لگتا ہے کہ پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ اِن فیکٹ ایک ڈرامہ سیریل بنانا چاہیے ہمیں اس گاؤں کے رسم ورواج اور وڈیروں کے مظالم پر۔''

ذویا نے اُس کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا کے بولا۔

''آج تک بیسیوں ڈرامے بن چکے ہیں مائی ڈیئر سس، مگر کسی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تم بھی ٹرائی کرلو۔ مگر اِس جاگیردار اور وڈیرا سسٹم کی جڑیں بہت گہری ہیں انہیں اتنی آسانی سے کاٹا یا اکھاڑا نہیں جاسکتا۔

ہاں تم اپنے حصے کا کام کرتی رہو شاید کسی پر اثر ہو ہی جائے۔ مگر ایک بات کا خیال رکھنا جو مولوی صاحب نے ہمیں چلتے وقت کہی تھی۔ اُن کی بیٹی کے حوالے سے کسی سے کوئی سوال مت کرنا اور نہ ہی اُس کمینے رستم کا کہیں ذکر کرنا ورنہ مولوی صاحب کی فیملی تو زیرِ عتاب آئے گی ہی...... ساتھ میں تم بھی ماری جاؤ گی اور ہم یہ برداشت نہیں کرسکیں گے۔''

''ڈونٹ وری بھائی! انشاء اللہ سب بہتر ہوگا۔ میں جانتی ہوں کہ مجھے بہت محتاط انداز میں اپنا کام کرنا ہے۔ لیکن سچ کہوں دل تو چاہتا ہے اُس گھٹیا رستم کو اُلٹا لٹکا دیا جائے اور پورا گاؤں اُس پر سنگ باری کرے تب اُسے پتا چلے کہ جان، اور آن کے لٹنے کا درد کیا ہوتا ہے؟''

''ہاں دل تو میرا ابھی یہی چاہ رہا تھا مولوی صاحب کی باتیں سُن کر لیکن...... وہی بات ہے کہ ہم خاموش رہنے پر مجبور ہیں۔'' بوبی نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے جس دن پڑی نا تو ان سب کی چیخیں نکل جائیں گی۔'' ذویا بھی گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کردی۔

وہ حویلی پہنچے تو بوبی اپنے کمرے کی طرف چلا گیا اور ذویا اندر زنان خانے کی طرف آ گئی۔

بے جی اُسے وہیں لاؤنج میں مل گئیں۔ ذویا تو اس کمرے کو لاؤنج ہی کہتی تھی کیونکہ وہاں ٹی وی، ڈی وی ڈی وغیرہ سیٹ تھے۔ شاندار صوفہ سیٹ اور ڈیکوریشن پیسز سے سجا ہوا کمرہ تھا یہ اور کافی کشادہ بھی تھا۔

''پتری کھانا لگواؤں کیا؟'' بے جی نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا۔

''نہیں بے جی بہت شکریہ، کھانا ہم کھا کے آئے ہیں۔ آپ جا کر سو جائیں۔ معافی چاہتی ہوں ہماری وجہ سے آپ کو پریشانی ہوئی۔''

''میرا بھائی کل صبح واپس شہر چلا جائے گا۔ میں بھی جلد ہی واپس چلی جاؤں گی۔'' ذویا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میری دھی، ناراض ہو کے جا رہی ہے، کھانا بھی نہیں کھایا حویلی کا۔''

بے جی نے شرمندگی سے کہا انہیں احساس تھا کہ وہ دلاور خان کے صبح کے رویے کی وجہ سے بدظن ہو کر دونوں وقت کا کھانا باہر کھا کے آئی ہے اور صبح بھی ناشتہ کیے بغیر حویلی سے باہر نکلی تھی۔

ایسا تو کبھی کسی مہمان کے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ اور یہ سب دلاور خان کے رویے کی وجہ سے ہوا تھا جبھی بے جی اُس سے بہت خائف بھی تھیں۔

''بے جی، آپ کیوں فکر کرتی ہیں انہیں کھانا کھلانے والے بہت ہیں یہاں۔'' دلاور خان کی آواز اُس کے کانوں میں پڑی تھی۔ ذویا اسی وقت لڑنے یا بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ کیونکہ وہ رات کی جاگی ہوئی تھی اور سارا دن گاؤں میں مٹر گشت کرنے کے بعد وہ بری طرح تھک چکی تھی۔

''بے جی، میں سونے جا رہی ہوں شب بخیر۔''

ذویا نے دلاور خان کی بات اَن سنی کرتے ہوئے بے جی سے کہا۔

''کیوں؟ جہاں گئی تھیں وہاں کسی نے تمہیں بستر نہیں دیا رات کو سونے کے لیے؟'' دلاور خان کا لہجہ تلخ اور طنزیہ تھا وہ سُلگ گئی۔

''دلاورے، چپ کر جا۔'' بے جی اُسے غصے اور بہت لاڈ میں 'دلاورے' کہہ کر پکارتی تھیں۔ اس وقت انہیں اس پر شدید غصہ آ رہا تھا۔

''بے جی' اس سے پوچھیں سارا دن کہاں آوارہ گردی کر کے آئی ہے؟''

''میں تمہارے سامنے جواب دہ نہیں ہوں مسٹر دلاور اور میں اپنے بھائی کے ساتھ گئی تھی۔ تمہارے ہاں بھائی کے ساتھ باہر جانے کو آوارہ گردی کہا جاتا ہوگا مگر ہمارے ہاں ایسا نہیں ہے۔'' ذویا نے تیز لہجے میں جواب دیا تو وہ جُز بز سا ہو گیا۔

''دھی رانی، تُو جا اپنے کمرے میں آرام کر۔'' بے جی نے ذویا سے کہا تو وہ دلاور کو غصہ سے دیکھتی وہاں سے سیدھی اُس کمرے میں چلی آئی جہاں اُسے ٹھہرایا گیا تھا۔

''کتنا بدتمیز، شکی مزاج اور بدلحاظ شخص ہے یہ میں ایسے ہی اُسے دل میں جگہ دے بیٹھی، بھاڑ میں جائے اب دلاور خان اب تو یونیورسٹی میں بھی اِس کو اگنور کروں گی۔ شکل بھی نہیں دیکھوں گی اُس کی۔ ایک اچھی صورت کے سوا ہے ہی کیا اُس کے پاس؟ اور اچھی پرسنالٹی، اچھی شکل صورت تو اللہ کی دین ہے اس میں دلاور خان کا کیا کمال ہے جو تنا اتراتا پھرتا ہے، مغرور، بدتمیز اور گھمنڈی آدمی ہے یہ۔''

ذویا قریشی اَپ ہوتے ہوئے بھی غصے سے اُس کو سوچتی رہی اور آ کر بستر پر لیٹ گئی۔ سارا دن کی تھکی ہوئی تھی۔ رات بھر کی جاگی ہوئی بھی تھی۔ آنکھیں نینداور درد سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ آیت الکرسی پڑھتے ہوئے اُس نے آنکھیں موندلیں۔ اور ذرا سی دیر میں اُس کی آنکھ لگ گئی۔

ابھی دو گھنٹے ہی گزرے تھے اُسے سوئے کے اچانک اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اور پھر ہزار کوشش کے باوجود سو نہ سکی۔

''جنت بی بی کے پاس جاؤں کیا؟'' ذویا نے خود سے سوال کیا۔ وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔ رات کے پونے ایک بج رہے تھے۔ وہ بالوں کو کیچر میں سمیٹتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئی۔

راہداری میں لائٹ جل رہی تھی۔ وہاں سے ہوتی ہوئی وہ جنت بی بی کے کمرے کے قریب پہنچی تو دروازہ اُدھ کھلا دیکھ کر وہ وہیں رُک گئی اندر لائٹ بھی آن تھی اور اُسے کسی کے بولنے کی آواز بھی آرہی تھی۔ ذویا نے غور کیا تو وہ آواز دلاور خان کی تھی۔ اُسے حیرت اور تجسس نے اُن کی باتیں سننے پر اُکسایا کہ آخر دلاور خان اِس وقت جنت بی بی کے کمرے میں کیا کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ دونوں میاں بیوی ہونے کے باوجود الگ الگ کمرے میں رہتے تھے۔

''آپ جانتی ہیں نا کہ آپ میرے لیے کیا ہیں؟'' دلاور خان کہہ رہا تھا اور ذویا کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔

''اس لیے آپ کو اپنا خیال رکھنا ہے میرے لیے، میری خاطر آپ میری بات مانیں گی۔ میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ آپ کسی بات کی فکر نہ کریں۔ میں ہوں ناں۔''

ذویا نے ذرا سا آگے ہو کر کھلے دروازے کی اوٹ سے دیکھا تو جنت بی بی اور دلاور خان آمنے سامنے کھڑے تھے۔ دلاور خان نے جنت بی بی کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں سمو رکھا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر ذویا کی سانسیں رُکنے لگیں۔

''آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں آپ سے کتنی محبت کرتا ہوں، میرے دل میں آپ کے لیے کتنا احترام ہے، عزت ہے۔ جانتی ہیں ناں؟'' دلاور خان محبت کی مٹھاس سے پُر لہجے میں اُن سے مخاطب تھا۔

ذویا کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ دلاور خان کو سُن رہی ہے۔ جو اُس سے جب بھی بولا کڑوا بولا۔ ہمیشہ انگارے چباتا ہوا، اُسے بے عزت اور بے توقیر کرتا ہوا...... اور اس وقت کیسے اُس کے لب و لہجے سے لفظوں سے شہد ٹپک رہا تھا۔ اُس کے لفظ امرت رس میں گھلے اور ڈوبے ہوئے تھے۔

''ہاں جانتی ہوں۔'' جنت بی بی کی مدھم آواز ذویا کے کانوں میں پڑی۔ اُس نے دیکھا اُن کے لب مسکرا رہے تھے۔

''بس تو پھر میری خاطر اپنا خیال رکھا کریں اور خوش رہا کریں۔ آپ کو اُداس دیکھ کر میرا دل بہت دُکھتا ہے۔'' دلاور خان نے شہد آگیں لہجے میں کہا اور اپنے لب اُن کی پیشانی پر رکھ دیے۔ ذویا کے تو پسینے چھوٹ گئے۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے دبے قدموں واپس پلٹ آئی۔

اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ اُس نے دیکھا اور سنا وہ سب حقیقت تھا۔ دلاور خان کا یہ کون سا روپ تھا؟

''اُن دونوں کے بیچ تو میاں بیوی والا رشتہ ہی استوار نہیں ہوا تھا پھر دلاور خان جنت بی بی سے کس محبت کا اظہار کر رہا تھا؟ اور جنت بی بی اُس کی کن

محبتوں کی گواہی دے رہی تھیں؟"
"اُف یہ سب کیا ہے؟" ذویا کے ذہن میں اٹھنے والے سوالات نے اُسے جھنجلا کے رکھ دیا تھا۔ وہ جلے پیر کی بلی کی طرح کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ اُس کے پورے وجود میں آگ دہک اٹھی تھی۔ ہاتھوں میں نمی اُتری ہوئی تھی اور دھڑکنیں خوب شور مچا رہی تھیں۔

"وہ اظہارِ محبت وہ پیار تو دلاور خان نے جنت بی بی سے کیا ہے پھر میری یہ حالت کیوں ہو رہی ہے؟" ذویا نے خود سے پوچھا۔

"ذویا احتشام، جنت بی بی دلاور خان کی بیوی ہیں وہ دونوں اگر رات کے اس سمے ایک ساتھ ہیں اور ایک دوسرے کو اپنی محبتوں کا یقین دلا رہے ہیں تو اس میں برائی کیا ہے؟"

تمہیں برا اس لیے لگ رہا ہے کیونکہ تم نے دلاور خان سے محبت کی تھی اور اُس نے جواب میں تمہیں ہمیشہ ذلت دی۔ وہ تو جنت بی بی کا شوہر ہے، اُن سے محبت کرتا ہے تو بھلا وہ تمہیں کیوں لفٹ کرائے گا۔ اُس کی نظر میں تم ایک بری لڑکی ہو، کیریکٹر لیس لڑکی سمجھتا ہے وہ تمہیں...... اور تم اُسے دل میں سجائے بیٹھی تھیں۔

دلاور خان تمہاری منزل نہیں ہے۔ وقت اور قدرت نے تمہیں سراب کے پیچھے بھاگنے سے اور مزید خوار ہونے سے بچا لیا ہے۔ اب تم اپنے دل و دماغ کو صاف کر کے اپنے کام اور اپنی تعلیم کی طرف مرکوز کرو۔ اور محبت اگر تمہارے نصیب میں ہے تو وہ تمہیں ضرور ملے گی اور...... عزت کے ساتھ ملے گی۔ انشاء اللہ۔"

ذویا کے دماغ نے اُسے سمجھایا۔ صحیح سمت اُس کی رہنمائی کی۔ اور بات اُس کی سمجھ میں آ بھی گئی تھی۔ جبھی اُس نے لمبے لمبے سانس لے کر اپنا غصہ ٹھنڈا کیا۔ ایک گلاس پانی پیا اور اپنا لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ گئی۔ کیونکہ نیند کا دور دور تک نام و نشان تک نہیں تھا۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے اُس نے لیپ ٹاپ پر کام کیا۔ اس ایک دن میں جو کچھ گاؤں میں دیکھا، سنا اور تجزیہ کیا تھا وہ سب ایک خوبصورت فیچر کی شکل میں لکھ کر محفوظ بھی کر لیا اور مونٹی کے والد ساجد نظامی کو بھی بذریعہ ای میل بھیج دیا۔

مونٹی کا اصل نام (موحد) تھا اور اُسے پیارے سب مونٹی کہتے تھے۔ ساجد نظامی کا اپنا اخبار تھا۔ جس میں ذویا بھی اکثر کالم اور فیچرز لکھا کرتی تھی اور وہ اُس کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔

فجر کی نماز ادا کر کے وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ کیونکہ حویلی میں بھی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ذویا کو اس وقت شدید بھوک کا احساس ہو رہا تھا مگر وہ خود سے کچھ مانگ کر کھانا نہیں چاہتی تھی۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا میں اُسے تازگی کا احساس ہوا۔ وہ زنان خانے کی سائیڈ پر بنے پائیں باغ میں آ گئی۔ باغ رنگ برنگے پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ ذویا کے ہونٹ آپ ہی آپ مسکرانے لگے۔

"لگتا ہے تُو ساں کو نیند نئیں آندی۔" رضیہ جوس کا گلاس چھوٹی سی ٹرے میں رکھتے وہیں چلی آئی۔ ذویا اُسے دیکھ کر مسکرا دی۔

"السلام علیکم صبح بخیر۔"

"علیکم السلام، یہ جوس پی لو۔ ناشتہ تُو ساں دے کمرے اِچ لگاندی پئی اے کریماں! دلاور خان کی وجہ نال۔" رضیہ نے ٹوٹی پھوٹی اردو سرائیکی میں مکس کرتے ہوئے بات کی۔

"اچھا...... شکریہ مہربانی۔" ذویا ہنس دی اور جوس کا گلاس اُٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

"آپ کے خاندان اور حویلی کے مرد سارے ایسے ہی ہیں کیا؟" میرا مطلب ہے غصے والے اور

کئی کئی شادیاں کرنے والے؟'' ذویا نے جوس پیتے ہوئے وہاں بچھی کرسی پر بیٹھ کر پوچھا۔

''ہاں ذویا بی بی، غصہ تو حویلی کے مردوں کے ناک پر دھرا رہتا ہے ہر ویلے (وقت) پر یہ دلاور خان پہلے ایسا نہیں تھا۔ وہ تو جب سے جنت بی بی سے اُس کا ویاہ ہوا ہے نا...... تب سے ہر ویلے غصے میں بھرا پھرتا ہے۔ پہلے تو ہنس بول بھی لیتا تھا۔

اور شادیاں تو مردوں کا شوق اور شغل ہیں......

چھ سال پہلے میری شادی ہوئی تھی۔ بختاور خان سے...... وہ جو نکی (چھوٹی) کُڑی (لڑکی) ہے نا ایمن وہ میری دھی ہے...... دلاور اُس سے بہت پیار کرتا ہے۔ مجھ سے پہلے زہرہ آئی تھی خان سائیں کی ووٹی (دلہن) بن کے اس حویلی میں...... سُنا ہے کوئی گانے، ناچنے والی تھی۔ سائیں کا دل آ گیا تھا اُس پر۔ سو خرید لائے۔ نکاح پڑھا لیا اُس کے ساتھ، پر وہ وچاری سال سے زیادہ نہیں جی سکی اس حویلی میں...... بچہ جننے چلی تھی دنیا سے ای چلی گئی۔ نہ بچہ بچ سکا نہ زہرہ۔

کوئی کہتا ہے وچاری کی حیاتی ای اتنی تھی۔ کوئی کہتا ہے وڈے سائیں شمروز خان جو بختاور خان کے والد تھے انہیں بہت غصہ تھا اُن کے ایک کوٹھے والی سے شادی پر اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ حویلی کا کوئی وارث پیدا کرے اس لیے، اُسے زچگی کے دوران کچھ کھلا پلا دیا جس کی وجہ سے اُس وچاری کی موت ہو گئی بچے سمیت، اب اللہ سائیں جانے کے سچ کیا ہے؟ اور جھوٹ کیا ہے؟''

رضیہ نے مدھم آواز میں اُسے بہت حیرت اور دکھ بھری باتیں بتائیں۔ وہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔

''جوس کا شکریہ۔'' ذویا نے جوس ختم کر کے گلاس اُسے دے دیا۔

''آپ یہ باتیں کسی کو بتانا نہیں...... ورنہ میری شامت آ جائے گی۔'' رضیہ نے اُسے ملتجی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''فکر نہ کرو تمہارا نام کہیں نہیں آئے گا۔'' ذویا نے اُسے یقین دلایا۔

''بی بی، ناشتہ آپ کے کمرے میں رکھ دیا ہے۔'' کریماں نے آ کر بتایا۔ تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''ارے واہ تم تو بہت صاف اُردو بول لیتی ہو۔''

''او جی، ٹی وی ریڈیو سن کے کچھ جملے بول لیتی ہوں۔'' کریماں نے جواب دیا۔

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' ذویا نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔

وہ دونوں اپنے اپنے کام کے لیے چلی گئی تھیں۔ آلو بھرے پراٹھے، اچار، چٹنی دہی اور لسی کے ساتھ ٹرے میں سجے تھے۔ ذویا نے مزے لے لے کر ناشتہ کیا۔ پھر نہا کر تیار ہو گئی۔

سفید ٹراؤزر بلو لمبی سی اسٹائلش قمیض پر رائل بلو چُنری پرنٹ کا جارجٹ کا دوپٹا شانوں پر پھیلائے وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔ بے جی کو سلام کر کے وہ اُن کے پاس سے بوبی کو سی آف کرنے آ گئی۔ وہ واپس شہر جا رہا تھا۔ قاسم اُسے چھوڑنے جا رہا تھا اڈے تک، وہاں سے بوبی کا بس میں جانے کا ارادہ تھا۔ اُس نے بھی کافی عرصے سے بس یا کوچ میں سفر نہیں کیا تھا۔

''کوئی پرابلم ہو تو فوراً مجھے یا پاپا کو کال کر دینا اور واپس آ جانا۔'' بوبی نے جاتے جاتے کہا۔

''او کے ڈونٹ وری، تم اپنا خیال رکھنا اور گھر پہنچتے ہی مجھے انفارم کر دینا۔ میں بھی انشاء اللہ دو ایک روز میں ہی آ جاؤں گی۔'' ذویا نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوکے، ٹیک کیئر، اللہ حافظ۔''

بوبی گاڑی میں بیٹھ گیا اور ڈرائیور قاسم نے گاڑی اسٹارٹ کردی۔ اُن کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی ذویا واک کرتی ہوئی گندم کے کھیتوں کے قریب پہنچ گئی۔ دور سے اُسے ایک جیپ آتی دکھائی دی۔ قریب آنے پر پتا چلا کہ اس جیپ میں رستم خان سوار تھا۔

اُسے دیکھ کر فوراً جیپ سے نیچے اترا۔ ذویا گھبرا کر تیزی سے واپس مڑ گئی اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔

''واہ سائیں واہ اپنے پنڈ (گاؤں) میں تو حور اُتر آئی ہے۔ خوش آمدید شہری حسینہ مس ذویا احتشام، ہمیں بھی تو مہمان نوازی کا موقع دیں ناں۔'' رستم خان تیزی سے قدم اٹھاتا اُس کے سامنے آرُکا اور ذویا کا راستہ روک لیا۔

''شکریہ! میں حویلی والوں کی مہمان ہوں۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''اوہاں، ہاں مجھے خبر مل گئی تھی کہ آپ یہاں ٹھہری ہو اور یہ بھی کہ کل آپ نے کہاں کہاں کی سیر کی؟ ویسے آپ کے حویلی والوں نے آپ کو اپنے الیکشن مہم کے لیے تو نہیں بلایا؟''

رستم خان اُس سے سوال پوچھنے کے ساتھ ساتھ اُسے جتا بھی رہا تھا کہ وہ اُس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ ذویا کا دل تو چاہ رہا تھا کہ اُس کا منہ نوچ لے مگر وہ اُس پر کچھ بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی جبھی بہت ضبط سے کام لے رہی تھی۔

''کیا مطلب؟'' ذویا نے ناسمجھی سے اُسے دیکھا۔

''مطلب یہ ذویا بی بی کے اشتہار اچھا ہو تو پبلسٹی بہت اچھی ہوتی ہے۔ تم اُن کے لیے ووٹ مانگنے تو نہیں آئیں یہاں؟''

''نہیں تو مجھے ان معاملات کا نہ تو علم ہے نہ ہی کسی نے مجھے اس سلسلے میں کچھ کہا ہے۔ میں تو گاؤں کی سیر کو آئی تھی بس۔'' ذویا نے پُراعتماد لہجے میں سنجیدگی سے جواب دیا۔

''اچھا! تو پھر سب کے انٹرویو اور لکھت پڑھت کی کیا ضرورت تھی؟ تم ایک اسٹوڈنٹ ہو۔ اسٹوڈنٹ ہی رہو...... کسی اخبار یا چینل کی رپورٹر مت بنو۔ خواہ مخواہ نقصان اٹھاؤ گی۔'' رستم خان اُسے ہوس زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے معنی خیزی سے کہتا اُسے بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔

''کیسا نقصان؟'' وہ انجان بنی تھی۔

''بہت بھولی ہو تم حُسن اگر معصوم اور بھولا بھالا بھی ہو...... تو قیامت دو آتشہ ہو جاتی ہے۔ تم ہمارے پنڈ میں مہمان ہو تو ہماری بھی مہمان ہو۔ کیا خیال ہے رات کا کھانا ہماری حویلی میں ہو جائے؟'' رستم خان کی نظریں ذویا کے جسم کے آرپار ہو رہی تھیں۔ اُس کی آنکھوں کی شیطانی چمک کو وہ خوب پہچانتی تھی۔ اسی لیے ڈر رہی تھی اندر ہی اندر۔

''تھینک یو...... میری پہلے سے کمٹمنٹ ہے۔ پھر کبھی سہی۔'' ذویا نے سنجیدگی سے جواب دیا اور آگے بڑھ گئی۔ وہ اپنی داڑھی میں کھجلی کرتا جیپ میں جا بیٹھا اور تیز رفتاری میں جیپ اُس کے قریب سے گزار کے لے گیا۔ کچی سڑک نے خوب دھول اڑائی تھی۔

''کمینہ، شیطان، خبیث!'' ذویا دھول اڑاتے ہوئے رستم کو گالیاں دے رہی تھی۔ دلاور خان اپنی زمینوں پر جانے کے لیے نکلا تھا۔ ذویا اور رستم خان کو دور سے ہی باتیں کرتے دیکھ کر اُس کا خون کھول اٹھا تھا۔ وہ رستم خان اور اُس کے باپ بدفطرت

سے اچھی طرح واقف تھا جبھی ذویا کا وہاں اکیلے چلے جانا اُسے غصہ دلا رہا تھا۔
"السلام علیکم! ذویا بیٹی۔" منشی کریم بخش سامنے سے چلے آئے۔ ماسٹر جی کا چھوٹا بیٹا گڈو بھی اُن کے ساتھ تھا۔
"وعلیکم السلام منشی چاچا کیا حال ہے؟" ذویا نے انہیں فوراً پہچان لیا۔ کیونکہ وہ اکثر زمینوں کے حساب کتاب کے سلسلے میں گھر آیا کرتے تھے۔ احتشام الحق نے اپنی زمین ٹھیکے پر دے رکھی تھی اور منشی جی پیسے کا فصل کا حساب کتاب رکھتے تھے۔
"کرم ہے سوہنے رب کا بیٹی میں آپ سے ہی ملنے حویلی جا رہا تھا۔ اچھا ہوا کہ آپ اِدھر ہی مل گئیں۔ ایک تو ہم نے آپ کو ماسٹر جی کی بیٹی کی شادی میں شرکت کے لیے پیغام دینا تھا۔"
"گل بانو بیٹی کو مہندی لگے گی پرسوں شادی ہے۔ آپ یہاں ہیں تو یہ ماسٹر جی کی اور اُن کی بیوی کی بھی خواہش ہے کہ آپ اُن کی بیٹی کی شادی میں شرکت کریں۔" منشی کریم بخش نے سنجیدگی سے تفصیل بتائی۔
"منسی چاچا، میں ضرور شرکت کروں گی اس مہندی شادی میں کیونکہ میں نے کبھی گاؤں کی شادی اٹینڈ نہیں کی۔"
"سچ باجی، آپ آئیں گی ناں بہت مزا آئے گا۔" سولہ سالہ گڈو نے خوش ہو کر کہا تو وہ ہنس پڑی۔
"ہاں ضرور۔"
بیٹی میں نے صاحب سے بات کر لی ہے انہوں نے بھی بخوشی اجازت دے دی ہے کہ آپ دو تین دن میرے غریب خانے میں رُک کر ہمیں بھی عزت بخشیں گی۔" منسی کریم بخش نے بہت پُرجوش لہجے میں بتایا۔

"منشی چاچا میں ضرور چلوں گی آپ کے گھر اور یہ تو میری عزت افزائی ہے کہ آپ لوگ مجھے اپنا مہمان بنانا چاہتے ہیں۔"
پاپا سے میری بھی بات ہوئی تھی انہوں نے بھی مجھے تاکید کی تھی کہ میں آپ کے گھر ضرور جاؤں۔" ذویا نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"اچھا تو پھر میں کب لینے آجاؤں؟" منشی جی خوش ہو کر پوچھنے لگے۔
"اُس کی ضرورت نہیں ہے چاچا...... میرا ڈرائیور اور گاڑی ہے نا میرے ساتھ میں اُس کے ساتھ کسی وقت آجاؤں گی آپ اپنا موبائل نمبر مجھے بتا دیں میں فون کر لوں گی ہوسکتا ہے آج ہی آجاؤں۔"
"یہ تو بہت اچھی بات ہے، لیں آپ میرا نمبر نوٹ کر لیں۔"
منشی جی نے خوشی سے مسکراتے ہوئے کہا ذویا نے اُن کا موبائل نمبر اپنے قیمتی موبائل میں سیو کر لیا۔ ذویا بھی دلاور خان کو دیکھ چکی تھی جبھی اُس نے منشی جی کو آج ہی آنے کا کہہ دیا تھا کیونکہ دلاور خان کا ہتک آمیز سلوک اور گستاخ رویہ اُسے اُس سے بدظن کر چکا تھا۔ اور اُسے دیکھتے ہی ذویا کی آنکھوں میں رات والا منظر گھوم گیا۔ جب وہ جنت بی بی کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں سموئے اُن سے اظہارِ محبت کر رہا تھا۔

لمبی مسافتوں نے چپکے سے یہ کہا
تنہا جو آرہے ہو محبت سے کیا ملا؟

ذویا کو رہ رہ کر اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا کہ آخر اُس نے دلاور خان جیسے بے حس اور پتھر دل شخص سے دل کیوں لگایا؟
"ذویا احتشام دلاور خان کی اصلیت جان کر جو دُکھ تمہیں پہنچا ہے اُس کو بار بار تازہ کرنے کا

مطلب ہے ایک نئے دکھ میں اضافہ کرنا۔ انسان سے غلطی ہو جاتی ہے تم سے بھی ہو گئی لیکن تمہیں بروقت پتا چل گیا کہ تم دلاور خان سے محبت کر کے غلطی کر رہی ہو سو اب بھول جاؤ اُسے۔'' ذویا کے دماغ نے اُسے مشورہ دیا۔

''بھول جاؤں گی ایک دن مگر کیسے؟'' ذویا نے خود سے سوال کیا۔

''ملٹن کہتا ہے کہ محبت کو نہ تو دلائل سے حاصل کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی فراموش کیا جاسکتا ہے۔''

''ہاں مگر دلاور خان کی زندگی کی حقیقت اور اُس کا میرے ساتھ رویہ اُسے محبت سے دل سے بے دخل کرنے کے لیے کافی ہے۔'' ذویا نے زیر لب کہا اُسی وقت اُس کے موبائل کی بیپ نے توجہ منتشر کر دی۔ مونٹی کی کال تھی۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کال ریسیو کی۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ، کیا حال ہے ذویا دی گریٹ کا؟'' مونٹی نے بہت جوشیلے اور دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

''بالکل ٹھیک تم سناؤ کیسے ہیں سب وہاں انکل آنٹی ٹینا؟''

''اللہ کا شکر ہے سب اے ون ہیں مگر تمہیں بہت مس کر رہے ہیں۔'' مونٹی نے ایمانداری سے جواب دیا۔

''مس تو میں بھی تم سب کو بہت کر رہی ہوں سچ مونٹی تم سب بھی میرے ساتھ یہاں آتے تو خوب انجوائے کرتے ہم۔''

''آئی نو، ہم تو اُس 'روڈ مین' کی وجہ سے نہیں آئے سناؤ تمہارے ساتھ کیسا سلوک ہے اُس کا؟''

''ایکدم گھٹیا لگتا ہے کھا ہی جائے گا مجھے، میں تو منشی چاچا کے گھر جانے کا شوق رہی ہوں ویسے بھی چند گھنٹے رات کو سونے کے لیے جاتی ہوں حویلی اگر چوبیس گھنٹے وہاں رہتی تو اب تک وہ میری روح قبض کر چکا ہوتا۔'' ذویا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''ارے ایسے کیسے؟ ہاتھ تو لگائے وہ تمہیں ہاتھ توڑ دوں گا سالے کے۔'' مونٹی نے دوستانہ محبت میں جوشیلے لہجے میں کہا۔

''دوبار ہاتھ اُٹھا چکا ہے مجھ پر۔''

''واٹ؟'' مونٹی شاک سے اُچھلا تھا۔

''اُس کی اتنی ہمت اور تم نے کسی کو بتایا تک نہیں۔''

''پلیز مونٹی تم بھی کسی کو کچھ مت بتانا میں واپس آکر تمہیں سب کچھ بتاؤں گی۔'' ذویا نے اُسے ملتجی لہجے میں کہا۔

''تم ابھی واپس آؤ بلکہ تمہیں تو بوبی کے ساتھ ہی واپس آجانا چاہیے تھا۔ میں آ رہا ہوں تمہیں لینے کے لیے۔''

بوبی کو بھی کچھ مت بتانا پلیز میں یہاں ایک شادی اٹینڈ کر کے دو دن بعد انشاء اللہ واپس آجاؤں گی۔''

''او کے تمہاری ای میل بابا جان کو مل گئی ہے بہت سراہا ہے انہوں نے تمہارے کام کو۔'' مونٹی نے بات کا رُخ بدل دیا۔

''اچھا، گڈ، تمہیں پتا ہے یہاں جو مولوی صاحب ہیں ناں اُن کی گفتگو نے مجھے حیران کر دیا وہ بہت دردمند انسان ہیں۔''

''تم مولوی صاحب سے بھی مل لیں۔''

''ہاں!''

''کون سے مولوی سے دم درود والے یا بم بارود والے؟''

''مونٹی!'' وہ اُس کی بات پر ہنس پڑی دلاور

خان اُس کے بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ ذویا نے مونٹی سے اجازت چاہی۔
''اوکے مونٹی، پھر بات ہوگی۔ اپنا خیال رکھنا، اللہ حافظ۔''
''اوکے ٹیک کیئر ذونی بائے۔'' مونٹی کا جواب سُن کر ذویا نے موبائل کان سے ہٹالیا۔
''بوبی کیا دو دن اور نہیں رُک سکتا تھا گاؤں ذویا کو چھوڑ کر آرہا ہے۔ بہن کی کوئی فکر ہی نہیں ہے۔'' فائزہ نے احتشام کو آفس فون کر کے بوبی کی واپسی کا بتاتے ہوئے شکایت کی۔
''بیگم صاحبہ، پریشان مت ہوں ذویا کی دیکھ بھال کے لیے وہاں منشی صاحب کی فیملی بھی ہے میں نے انہیں فون کر کے کہہ دیا ہے کہ وہ ذویا کو اپنے پاس بلالیں۔'' احتشام الحق نے انہیں مطمئن کرنا چاہا۔
''میرا تو دل ہول رہا ہے پتا نہیں حویلی میں وہ کیسے رہ رہی ہوگی؟'' اُسے کہاں عادت ہے گاؤں میں رہنے کی وہاں کا ماحول اُس کے مزاج اور ماحول سے قطعی مختلف ہے۔''
''اچھا تم فکر مت کرو میں ابھی صدقہ خیرات دیتا ہوں اپنی بیٹی کے سر کا۔ انشاء اللہ وہ خیریت سے لوٹ آئے گی۔'' احتشام الحق نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا۔
''تمہیں ہماری عزت کا کوئی خیال نہیں ہے۔'' دلاور خان اُس کے سر پر کھڑا خشمگیں نظروں سے اُسے گھورتا ہوا بولا۔
''کیوں؟ ایسا کیا کر دیا میں نے؟'' ذویا پگڈنڈی کے قریب چلنے لگی۔
''تم حویلی کی مہمان ہو اس طرح سے منہ اُٹھائے باہر کیسے گھوم پھر سکتی ہو اور ہر ایرے غیرے سے راہ چلتے گپیں مارتے ہوئے شرم نہیں آتی تمہیں؟'' وہ اُس کے ساتھ چلتے ہوئے برس رہا تھا۔
''نہیں آتی مجھے شرم۔'' وہ تیز لہجے میں بولی۔
میں اپنے باپ کی عمر کے شخص سے بات کر رہی تھی جسے میں چاچا کہتی ہوں اور جو مجھے بیٹی کہتا ہے سنا تم نے...... اور تم کس حویلی کی بات کر رہے ہو؟ اُس حویلی کی جہاں ایک مہمان لڑکی کو ذلیل کیا جاتا ہے یا اُس حویلی کی جہاں ایک لڑکی پر ہاتھ اُٹھایا جاتا ہے۔ مہمان کے ساتھ یہ سلوک کہاں ہوتا ہے مسٹر دلاور؟
غریب سے غریب آدمی بھی گھر آئے مہمان کی عزت کرتا ہے۔ اپنی حیثیت سے بڑھ کر اُس کی تواضع کرتا ہے۔ سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے۔ اور تم...... تم تو ایک مہمان لڑکی کو ایک وقت کا کھانا کھلا کر راضی نہیں ہو۔ مٹھی بھر عزت نہیں دے سکتے تم ایک مہمان لڑکی کو...... تو کس عزت کی بات کر رہے ہو؟''
''شٹ اپ!'' وہ غصے سے بولا تو وہ چلتے چلتے رُک کر اُس کا تپا ہوا چہرہ دیکھتے ہوئے بولی۔
''کیوں، میں خاموشی سے تمہاری بدسلوکی برداشت کرتی رہوں تو تم بہت اچھے مہمان نواز اور عزت دار ہو...... اگر تمہیں تمہارا اصل چہرہ آئینے میں دکھا دیا جائے تو لگے چلانے...... واہ کیا بات ہے آپ حویلی والوں کی؟''
''تو ہم نے دعوت دے کر نہیں بلایا تھا تمہیں حویلی۔''
''تمہارے بابا سائیں نے میرے پاپا سے تو کہا تھا نا۔''
ذویا پھر سے چلنے لگی وہ اُس کے ساتھ چلتا اُس کا راستہ تنگ کر رہا تھا۔ اور وہ کنارے کنارے چل رہی تھی۔

"منع کر دیتے انہیں میں بھی تمہاری مہمان نوازی کے لیے مری نہیں جا رہی تھی۔ چند گھنٹے رات کے گزارے ہیں حویلی میں وہ بھی کہیں اور مہمان بن کے گزار سکتی تھی...... احسان نہیں کیا تم نے مجھ پر، اوہ......"

ذویا کا پاؤں اچانک پگڈنڈی سے پھسلا تھا۔ مٹی کچی تھی ٹوٹنے سے وہ یکدم نیچے جا رہی تھی قریب تھا کہ وہ زمین بوس ہوتی بے اختیار ہی اُس نے دلاور خان کا بازو پکڑا تھا اور اُس نے بھی اُس کا بازو پکڑ کر اُسے منہ کے بل گرنے سے بچا لیا تھا۔ مگر ذویا کے گھٹنے اور ٹخنے پر چوٹ لگ گئی تھی۔ دلاور خان نے اُسے بازو سے سختی سے دبوچ کر پیچھے سڑک پر دھکیلا تھا اس۔ وہ خود کو نہ سنبھالتی تو ضرور نیچے گر جاتی۔

"اندھی ہو کیا؟ دیکھ کے نہیں چل سکتیں۔ بہت شوق ہے تمہیں غیر مردوں کی بانہوں میں جھولنے کا؟" وہ بہت درشتی اور حقارت سے بولا تھا۔ ذویا ہانپ رہی تھی۔ اُس کے جملے سے پیخ پا ہوگئی۔

"آپ ہی کو شوق ہے غیر عورتوں کی ہمراہی میں اپنی ریاست کا گشت فرمانے کا میں نے تو دعوت دے کر نہیں دلایا تھا نہیں...... خود ہی میرے ساتھ چلنے کے شوق میں جگہ تنگ کر دی میں کنارے پر تھی گر گئی چوٹ لگ گئی اُوپر سے مجھ پر ہی برس رہے ہو۔ چوٹ تو میرے لگی ہے ہے۔ گری تو میں ہوں۔"

ذویا نے اپنے گھٹنے کو سہلاتے اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔

"گری ہوئی تو تم ہمیشہ سے ہی ہو اور کیا گرو گی؟" دلاور نے زہر اگلا۔

"کیا بکواس کی تم نے؟" ذویا نے غصے میں آ کر اُس کا بازو پکڑ کر اُس کا رخ اپنی جانب کیا۔

"لڑکی! اپنے آپے میں رہو تم سمجھیں۔" دلاور نے جھٹکے سے بازو چھڑایا۔

"تم بھی اپنے آپے میں رہو مسٹر دلاور آئندہ میرے کردار پر انگلی اٹھانے سے پہلے سوچ لینا کے تماشا تمہارا بھی بن سکتا ہے۔"

"تم میرا تماشا بناؤ گی...... تم......؟" دلاور خان کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

"اتنا غرور اچھا نہیں ہوتا مسٹر دلاور۔"

"شٹ اپ میرے سامنے کسی کو اس طرح بولنے کی جرأت نہیں ہوئی آج تک اور تم......" وہ دانت پیس رہا تھا۔ اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُسے کچا ہی چبا جائے۔

"میں تم سے ڈرتی نہیں ہوں باقی سب لوگ تم سے ڈرتے ہوں گے تمہارے قہر سے خوف کھاتے ہوں گے۔" ذویا اپنے کپڑے جھاڑ رہی تھی۔

وہ شعلہ بار نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ بالوں کی لٹیں دائیں بائیں اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔

"چلو......" دلاور خان نے آہستگی سے کہا ذویا نے اَن سنا کر دیا۔

"میں نے کہا حویلی چلو۔" وہ درشتی سے بولا۔

"میں تمہارے حکم کی غلام نہیں مسٹر دلاور، کہ تم نے حکم دیا کہ چلو تو میں چل پڑوں، تم کہو کہ رُک جاؤ تو میں رُک جاؤں۔"

"میرے ساتھ رہنا ہے تو تمہیں میرا حکم بھی ماننا ہوگا۔"

"تمہیں یہ خوش فہمی کیوں ہونے لگی کہ میں تمہارے ساتھ یا تمہارے پاس رہنا پسند کروں گی؟ ہونہہ تمہارے ساتھ تو تمہارے فرشتے بھی پتا نہیں کیسے رہتے ہوں گے؟" ذویا نے اُسے آگ برساتی نظروں سے دیکھتے ہوئے تمسخرانہ لہجے میں

کہا اور اُس پر جیسے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔
"مجھ سے اپنی پسندیدگی کا اظہار تم خود کرتی رہی ہو۔"
"بہت بڑی بھول ہوگئی تھی مجھ سے۔" ذویا نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔
"اُس وقت میں تمہاری اصلیت سے ناواقف تھی اور تمہاری بدسلوکی اور جاہلانہ رویے نے تمہیں میرے دل سے اُتار دیا ہے۔ میرے دل میں تمہارے لیے جو محبت اور عزت تھی وہ تم نے خود اپنے رویے سے ختم کردی...... اور ویسے بھی مجھے حویلی میں زندہ لاش بن کر رہنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔
یہاں کا ماحول اور یہاں کے مردوں کا رویہ، سلوک، کردار میں کسی صورت نہ تو برداشت کرسکتی ہوں اور نہ ہی قبول کرسکتی ہوں۔ گاؤں میں رہنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں چند روز کا ایڈونچر تو ٹھیک ہے مگر مستقل رہائش میں کبھی نہیں چاہوں گی۔ اور وہ بھی تم جیسے بے حس آدمی کے ساتھ ناٹ ایٹ آل۔
تم سے تو میرا چند گھنٹے کا قیام برداشت نہیں ہوا ساری زندگی تم رکھو گے مجھے، ہونہہ! عورت کی عزت کرنا سیکھو مسٹر دلاور پھر شاید کوئی عورت تمہارے سنگ رہنے کی جینے کی تمنا کرے؟ مگر نہیں...... تمہیں تو شاید کسی عورت کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ تم تو آل ریڈی میرڈ ہو۔" وہ استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔
"شٹ اَپ بہت سُن لی میں نے تمہاری بکواس میں تو خود تمہیں برداشت نہیں کرسکتا۔" وہ غصیلے لہجے میں بولا۔
"تو بتانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو تمہارے ہر ہر لفظ سے رویے سے ظاہر ہے، میں ایک ہفتے کے لیے یہاں آئی تھی لیکن۔"
"لیکن میں تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کرسکتا سنا تم نے، اپنا سامان اٹھاؤ اور دفعہ ہوجاؤ واپس اپنے گھر۔" دلاور خان نے نہایت بدتمیزی اور بے مروتی سے کہا۔
"تو تمہیں کیا لگتا ہے؟ تمہاری اس بدتمیزی کے باوجود میں تمہاری حویلی میں رہنا چاہوں گی مائی فٹ، تم ہی رہو وہاں اپنی سوکالڈ چوہدراہٹ اور اچھائی کے ساتھ۔"
ذویا نے بھی اب کوئی لحاظ نہیں کیا تھا۔ اُس کے منہ پر طمانچہ بن کے لگی تھیں ذویا کی باتیں وہ بلبلا کے رہ گیا۔
"نہ حامیڈی دھی، میں وڈے سائیں کو کیا جواب دوں گی؟" بے جی نے اُسے جاتے دیکھا تو شرمندگی اور پریشانی سے بولیں۔
"انہیں کچھ مت بتایئے گا بے جی، اور میں آپ سب کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اتنی محبت دی۔
میں دلاور کے رویے کی وجہ سے جارہی ہوں۔ اُسے ایک مہمان کی اور ایک لڑکی کی عزت کرنا نہیں آتی۔ اللہ جانے اسے مجھ سے کیا بیر ہے؟ خیر آپ کا بہت شکریہ میرا ڈرائیور آ گیا ہے۔ مجھے اجازت دیں اگر مجھ سے کوئی گستاخی یا بدتمیزی ہوگئی ہو تو مجھے معاف کردیجیے گا۔" ذویا نے بے جی کے ہاتھ تھام کر نرمی سے کہا انہوں نے بھیگی آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے اُس کا ماتھا چوم لیا۔
"تُو نے مجھے بے جی کہا ہے نا...... تو یہ اپنی بے جی کی طرف سے رکھ لے۔" بے جی نے اپنے ہاتھ میں پہنا سونے کا کڑا اُتار کر اُسے پہنانا چاہا۔
"نہیں بے جی، میں اس تحفے کی حقدار نہیں ہوں مجھے صرف آپ کی دعائیں چاہئیں۔ یہ آپ

پہن لیں میں یہاں سے کچھ بھی ساتھ لے کر نہیں جانا چاہتی سوائے آپ کی دعاؤں کے۔'' ذویا نے اُنہیں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا وہ مسکرادیں۔

''ذویا...... دلاور کی طرف سے میں تم سے معافی مانگتی ہوں وہ دل کا برا نہیں ہے۔'' جنت بی بی نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''آپ اچھی ہیں بہت اچھی ہیں لیکن ایک بات کہوں آپ سے انسان اپنے عمل سے دوسروں کے دل ونظر میں یا تو اُتر جاتا ہے یا دل ونظر سے اتر جاتا ہے۔ دل میں کون دیکھتا ہے، عمل سب کو دکھائی دیتا ہے محسوس بھی ہوتا ہے۔ اور جس نے غلطی کی ہوتی ہے سزا یا معافی بھی اُس کو ملنی چاہیے۔ آپ کیوں اُس کے لیے معافی مانگتی ہیں جسے اپنے کیے اور کہے کا کوئی احساس ہی نہیں ہے۔ اپنا خیال رکھیے گا۔ چلتی ہوں، اللہ حافظ۔''

ذویا نے مسکراتے ہوئے نہایت رسانیت سے کہا اُن سے گلے ملی اور جس وقت وہ حویلی کے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی دلاور خان حویلی میں داخل ہورہا تھا۔ ذویا اُس کی طرف دیکھے بغیر خاموشی سے اپنی گاڑی میں جا بیٹھی۔

دلاور خان حقارت سے سر جھٹکتا ہوا اندر چلا گیا۔ اور ذویا منشی کریم بخش کے گھر آ گئی۔ اور مما پاپا کو فون کر کے ساری بات بتادی اور یہ بھی کہ وہ اُس وقت منشی کریم بخش کے گھر میں ہے۔ اور دو دن بعد شہر واپس آ جائے گی۔

''دیکھ لی اپنے گرائیں یار کی مہمان نوازی؟ میری بیٹی کی اس قدر انسلٹ کی ہے اُس لڑکے نے اور اُس کو اپنا داماد بنانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔'' فائزہ نے فون بند کرتے ہی احتشام الحق کی خبر لی۔

''مجھے دلاور خان سے ایسی بدتہذیبی اور بدتمیزی کی توقع نہیں تھی۔'' احتشام الحق حیرت میں گم تاسف زدہ لہجے میں بولے۔

''اور جو توقع وابستہ کررکھی ہے نا اُسے اب بھول جائیں۔ آپ کو کیا لگتا ہے وہ جس بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھتا ہے اُس کا اثر اُس کی شخصیت پر نہیں پڑا ہوگا۔ یہ لوگ بہت کائیاں اور دوغلے ہوتے ہیں۔ جیسا دیس ویسا بھیس کے مصداق رنگ بدلتے رہتے ہیں۔

شہر میں شریف گاؤں میں بدمعاش، بھلا ایسا کہاں ہوتا ہے؟ کوئی گھر آئے مہمان کو کیا اس طرح بے عزت کرتا ہے وہ بھی بنا دشمنی کے...... بات کرو بختاور خان سے اور اُسے بتاؤ کے اُس کے بیٹے کے لیا چھن ہیں۔'' فائزہ کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا اور احتشام الحق کسی گہری سوچ میں گم بیٹھے سگار کے کش لگا رہے تھے۔

احتشام کی چھوری (لڑکی) واپس چلی گئی کے ابھی اِدھر ہی مٹکتی پھر رہی ہے؟'' ہاشم خان نے رستم سے پوچھا۔

''گئی ہی سمجھو، دلاور خان کچھ اکھڑا اکھڑا سا رہتا ہے اُس سے، سنا ہے اُس نے کوئی عزت افزائی نہیں کی اُس چھوری کی اور اب وہ ذویا احتشام منشی کے گھر رُکی ہوئی ہے۔'' رستم نے بہت تمسخرانہ انداز میں بتایا۔

''ہوں...... میں نے سنا ہے کہ وہ ماسٹر اور مولوی کے گھر بھی گئی تھی۔ اور اُسے ہمارے ڈھور ڈنگر اسکول میں باندھنے پر بھی اعتراض ہے۔ اور پتا کر کہیں مولوی نے کچھ بک نہ دیا ہو اُس کے سامنے۔

اگر ایسا ہوا تو ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔ الیکشن سے پہلے (پہلے) ہم کوئی بکھیڑا نہیں جھیل سکتے۔ ذرا نظر رکھ اُس پر اور پتا کر اُس نے کچھ اُلٹا

سیدھا نہ لکھ بھیجا ہوا اخبار وخبار میں...... لڑکی ذاتی ہے ایک آدھ تڑی میں ہی ٹھنڈی پڑ جائے گی۔ اُسے حویلی بلا کھانا شانا کھلا اور سمجھا دے کہ کوئی غلطی نہ کرے ورنہ...... ہاہاہا۔'' ہاشم خان نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے آخر میں بہت مکارانہ انداز میں قہقہہ لگایا تو رستم خان بھی اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہنسنے لگا۔

شیدا رستم خان کا خاص آدمی تھا۔ اُس کے کہنے پر گاؤں کی کسی بھی خوبصورت لڑکی کو وہ ڈیرے پر پہنچا دیتا۔ اور وہ لڑکی اپنی عزت لٹا کر واپس لوٹتی تو کاروکاری کی بھینٹ چڑھا دی جاتی۔

اس بار شیدے کو ذویا کو حویلی مدعو کرنے کا حکم ملا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رستم خان کی نظر میں جو ہوس اور شیطانیت بھری ہے وہ ذویا کی عزت تار تار کردے گی اور وہ اس پیاری لڑکی کو رستم خان کی ہوس کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہتا تھا۔ پریشانی میں اُس نے اپنی بیوی ذلیخا سے اس بات کا ذکر کیا تو وہ بھی دل تھام کر رہ گئی۔

''دیکھ شیدے، باز آجا اس گناہ سے تُو کب تک وڈیرے رستم کے لیے گناہ کرتا رہے گا؟ کچھ احساس ہے تجھے تیری بھی ایک بیٹی ہے او تُو بیٹی کا باپ ہو کے...... دوسروں کی بیٹیوں کی عزت برباد کرنے والے کا ساتھ دیتا ہے۔ کل کو تیری بیٹی کے ساتھ بھی یہی ہوگا پھر کس سے فریاد کرے گا؟''

اللہ سائیں بھی تب تیری نہیں سنے گا کیونکہ تو اب اُس کے حکم پر عمل نہیں کر رہا۔ تُو چاہتا ہے کہ تیری بیٹی کے ساتھ بھی وہی ہو جو......''

''او نہ ذلیخا، اللہ نہ کرے کہ میڈی دھی کے ساتھ ایسا کچ ہو۔'' وہ تڑپ کر اُس کی بات کاٹ کر بولا۔

''تو یہ کام چھوڑ دے۔''

''وڈیرا ہمیں نہیں چھوڑے گا۔ ہمارا دانہ پانی بند کردے گا۔'' شیدے نے پریشانی کے عالم میں اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔

''دانہ، پانی، رزق روٹی تو اللہ سائیں کے ہاتھ میں ہے تُو اُس کی فکر کیوں کرتا ہے؟'' ذلیخا نے سنجیدگی سے سمجھایا۔

''وہ جان سے مار دے گا ہمیں۔''

''جان تو ایک دن جانی ای ہے نا، مرنا تو ہے...... پر اللہ سائیں کے حکم پر چل کے...... نیکی کر کے مریں گے ناں تو...... آخرت اچھی ہو جانی ہے اپنی۔'' ذلیخا نے دل سے کہا وہ مولوی صاحب کی بیوی سے ملتی رہتی تھی۔ ایسی اسلامی باتیں اُس نے انہیں سے سیکھی تھیں۔

''آخرت تو اچھی ہو ہی جانی ہے اللہ سائیں تو معاف کر دے سی پر وڈیرا سائیں معاف نہ کرسی۔ میں کی کراں دس میکوں؟''

''تُو اُس شہری لڑکی کو کھانے کی دعوت دینے جائے گا نا تو اُسے وڈیرے کی نیت کا بھی بتا دئیں۔ اور میں بھی منشی جی کے گھر جا کے اُس کو ساری بات بتا دیتی ہوں۔ پھر جو اُس کی مرضی۔'' ذلیخا نے کہا۔

''چل ایویں ای کر، میں جا کے پیغام دیتا ہوں تو بھی شام کُوں منشی جی کے گھر جا کے اُس بی بی کو سب بتا دینا۔ پر دھیان رکھیں کسی کو پتا نہ چلے۔'' شیدے نے اُسے ہدایت دی۔

''تُو فکر نہ کر۔'' ذلیخان نے اثبات میں سر ہلایا۔

''آپ رستم خان کو میری طرف سے معذرت میرا مطلب ہے انکار کردیں میں اُن کی حویلی کھانے پر نہیں آسکتی۔ اُن کو شکریہ بول دینا۔ میں نے پہلے بھی انہیں انکار کردیا تھا کہ وہ زحمت نہ کریں مگر......'' شیدے کا پیغام سننے کے بعد ذویا نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بی بی وہ انکار سننے کے عادی نہیں ہیں۔'' شیدے نے بتایا۔

''زبردستی ہے کیا؟'' ذویا نے غصے سے اُس کے خوفناک حلیے کو دیکھا۔

''زبردستی کر بھی سکتے ہیں وہ۔''

''دھمکی دے رہی ہو مجھے۔'' ذویا نے اُسے غصے سے گھورا۔

''نہیں بی بی، سچ بتا رہا ہوں وڈیرے کے پیغام کے ساتھ ایک مخلصانہ مشورہ ہے آپ کے لیے...... آپ اس دعوت پر نہ ہی جائیں تو اچھا ہے۔ وڈیرا بُری نظر رکھتا ہے آپ پر آپ اُس سے دور ای رہیں یہ آپ کی جان اور آن کے لیے بہتر ہے۔'' شیدے نے بہت دھیمی آواز میں کہا تو وہ بولی۔

''تم تو وڈیرے کے آدمی ہونا...... پھر مجھے یہ مشورہ کیوں دے رہے ہو؟''

''کیونکہ میں بھی بیٹی کا باپ ہوں اور...... تھک گیا ہوں اُس کے اشاروں پر ناچتے ناچتے...... اُس کا پیغام پہنچانا میری ڈیوٹی ہے۔ اور آپ کو اُس سے دور رہنے کا مشورہ دینا...... میری انسانیت اور احساس ہے۔''

''شکریہ تمہارا، میں جانتی ہوں رستم خان کے کرتوت اُس لیے اُسے پہلے بھی انکار کر دیا تھا اور اب بھی انکار کر رہی ہوں۔'' ذویا نے سنجیدگی سے کہا تو وہ کہنے لگا۔

''ٹھیک ہے بی بی، آپ جتنی جلدی ہو سکے واپس شہر چلی جاؤ۔ رستم خان اپنی فطرت اور عادت سے مجبور ہے وہ آپ کے انکار کو اپنی بے عزتی محسوس کرے گا اور...... چلتا ہوں۔ رب را کھا۔'' رستم خان اپنی ادھوری بات میں اُسے مکمل پیغام دے گیا۔

ذویا کو رستم خان سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اُدھر رستم خان شیدے کی زبانی ذویا کا انکار سُن کر زخمی سناپ کی طرح پھنکار رہا تھا۔

''میری دعوت ٹھکرائی ہے اُس نے...... میری دعوت، رستم خان کی دعوت ٹھکرا کے ذویا بی بی تم نے اپنی شامت کو آواز دی ہے۔ میرے گاؤں میں مجھ سے ہی پنگے تم دیکھنا تو سہی...... میں تمہارے ساتھ کرتا کیا ہوں؟''

''سائیں! الیکشن سے پہلے کچھ اُلٹا پلٹا نئیں کر سکتے ہم، وڈے سائیں کا حُکم ہے۔'' شیدے نے اُس کی بکواس سُن کر یاد دلایا۔

''بھاڑ میں گئے الیکشن۔'' وہ دانت پیستے ہوئے غصے سے بولا۔

''میں اس بے عزتی کا بدلہ ضرور لوں گا اُس لڑکی سے بہت رعایت دے لی اُسے اب اور نئیں۔''

''اللہ سائیں! رحم کر، ذویا بی بی کی عزت بچائیں۔'' شیدے نے رستم خان کی بات سُن کر دل میں دعا کی۔ وہ بے بسی و بے کلی سے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔

بختاور خان نے شہر سے دلاور خان کو فون کیا تھا۔ ذویا نے جو فیچر گاؤں کے حوالے سے لکھا تھا وہ اخبار میں شائع ہو گیا تھا بمع تصاویر، ان کی پارٹی کے لیڈرز نے انہیں طلب کر کے اس موضوع پر بات کی تھی۔ اور گاؤں کی صورت حال بہتر بنانے کی ہدایت کی اور بختاور خان نے دلاور خان کو سختی سے ہدایت کی کہ وہ سب کام خود جا کے دیکھے۔

ٹی وی چینل پر بھی گاؤں کے اسکول کی لوگوں کی ابتر حالت کی فلم دکھائی گئی تھی اور جسے دیکھ کر رستم خان اور ہاشم خان کو آگ لگ گئی تھی۔

''میں نے کہا تھا نا کہ اُس لڑکی پر نظر رکھو۔ دیکھ

لیا اُس کا کارنامہ ہم سب دنیا کی نظروں میں آ گئے۔ پارٹی والے مجھے لعن طعن کررہے ہیں اور تُو اپنی عیاشیوں میں مگن ہے۔ کیسے پہنچ گئی گاؤں کی فلم ٹی وی والوں تک؟'' وہ چھوری (لڑکی) تو ابھی تک گاؤں میں ای ہے دو دن میں اُس نے ہماری برسوں کی ساکھ خراب کردی...... اور تُو بے ہوش بیٹھا ہے یہاں۔ پتا کر جا کر کہ یہ حرامزدگی کس نے کی ہے؟'' ہاشم خان رستم خان پر برس رہا تھا۔ وہ الگ اپنی بڑھتی ہوئی شیلو کو آئینے میں دیکھتا ہوا ٹھوڑی کھجا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے بابا سائیں! اُس لڑکی کی طرف ہمارے بہت سے حساب نکلتے ہیں اب وہ حساب بے باک کرنا ہی ہوں گے۔'' رستم خان نے سازشی انداز میں سوچتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گیا۔ شیدا بھی بے کلی سے اُس کے پیچھے نکلا تھا۔

دلاور خان اپنی نگرانی میں اسکول کی صفائی کروا رہا تھا۔ رستم خان کے جانور کمرے سے باہر ایک درخت سے باندھ دیے گئے تھے۔ اور کمرے کی دھلائی ہو رہی تھی۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' رستم خان اپنی جیپ پر وہاں پہنچا تھا۔ اُس تک اسکول کی صفائی کی خبر پہنچ چکی تھی۔

''دکھائی نہیں دیتا کیا، صفائی ہو رہی ہے۔'' دلاور خان نے اُسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''میرے جانور کس نے باہر نکالے ہیں؟'' وہ جیپ سے نیچے اتر آیا۔

''میں نے نکوائیں ہیں۔'' دلاور خان نے اطمینان سے جواب دیا۔

''تمہاری اتنی جرأت کیسے ہوگئی دلاور خان؟''

''اگر تم اسکول میں اپنے مویشی باندھ سکتے ہو تو میں تمہارے مویشی اسکول سے باہر باندھنے کی جرأت کیوں نہیں کرسکتا؟''

دلاور خان نے مسکراتے ہوئے اُسے دیکھا وہ اُس کے سامنے کھڑا تھا۔

''یہ جرأت تمہیں بہت مہنگی پڑے گی دلاور۔'' رستم کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

''اچھا! فی الحال تو تم اپنے مویشی یہاں سے لے جاؤ، کیونکہ یہ اسکول ہے جہاں بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ مویشی پال بارہ نہیں ہے کہ تمہارے مویشی یہاں قیام پذیر ہوں۔''

''میرے مویشی اِدھر ہی بندھیں گے میں دیکھتا ہوں کون انہیں یہاں سے نکالتا ہے؟'' رستم خان نے سپاٹ لہجے میں کہا تو دلاور خان ہنس پڑا۔

''نکال تو دیا ہے اب تم اپنے جانور یہاں سے لے جاؤ ورنہ تمہیں اپنے جانوروں کو یہاں چھوڑ کے جانا بہت مہنگا پڑ سکتا ہے۔''

''مطلب کیا ہے تمہارا؟'' رستم خان اپنی کمر پر دونوں ہاتھ ٹکائے اُسے غصے سے گھور رہا تھا۔

''بھئی سیدھی سی بات ہے اگر تم اپنے جانور یہاں سے نہیں لے جاؤ گے تو میں تمہارے یہ جانور ذبح کروا کے ان کا سارا گوشت پورے گاؤں میں تقسیم کروادوں گا۔ گاؤں کے لوگ بھی خوش ہو جائیں گے اس بہانے انہیں بھی پیٹ بھر کے گوشت کھانے کو ملے گا۔ اُن کی تو عید ہو جائے گی۔ ہے نا۔''

دلاور خان نے اُس کے چہرے کو اور اُس کے مویشیوں کو باری باری دیکھتے ہوئے کہا تو وہ آپے سے باہر ہو گیا اور دلاور خان کا گریبان پکڑ لیا۔

''میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔''

''انسان بنو رستم خان، میں تم سے یہاں جھگڑنے نہیں آیا یہ اسکول سرکاری پراپرٹی ہے۔ تمہارے باپ کی جاگیر نہیں ہے اور اِس کے آس پاس کی زمین ہماری ہے۔ اس اعتبار سے تو تمہیں

یہاں قدم بھی نہیں رکھنا چاہیے۔'' دلاور خان نے اُس کے ہاتھوں کو سختی سے جھٹک کر تیز لہجے میں کہا۔

''میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں دیکھ لوں گا۔'' رستم خان غصے سے دھاڑا۔ گاؤں کے کافی لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے۔

''تمہیں اور تمہاری نام نہاد منگیتر ذویا کو دیکھ لوں گا میں۔ مجھ سے بچو گے نہیں تم دونوں۔''

''شٹ اَپ! خبردار اگر ذویا کا نام اپنی ناپاک زبان سے لیا تم نے۔ دفعہ ہو جاؤ یہاں سے اور آئندہ مجھے یہاں دکھائی مت دینا۔'' دلاور خان نے غصے سے پھنکارتے ہوئے اُسے وارن کیا تھا۔ شیدا صورتحال بگڑتی دیکھ کر رستم خان کو وہاں سے نکال لے گیا۔

''باجی' یہ دیکھیں میں نے فلم بنائی ہے ابھی۔ ٹھیک بنی ہے نا۔'' گڈو خوشی سے دوڑتا ہوا ذویا کے پاس آیا۔ وہ ذویا کا ڈیجیٹل مووی کیمرہ لے گیا تھا اور رستم خان اور دلاور خان کے اس جھگڑے کی مووی بہت ہوشیاری سے بنا لایا تھا۔

''واؤ یہ تو بہت کام کی چیز ہے ویری گڈ، گڈو تم نے تو ذرا سی دیر میں کیمرہ استعمال کرنا سیکھ لیا۔''

ذویا نے فلم دیکھی تو حیرت زدہ ہو کر بولی۔ گڈو تعریف سُن کر خوش ہو گیا۔ اور ذویا نے وہ فلم اپنے لیپ ٹاپ میں ٹرانسفر کی اور پھر ساجد نظامی اور بوبی دونوں کو بذریعہ ای میل بھیج دی۔

ماسٹر جی کی بیٹی بانو کی مہندی تھی۔ اور ذویا بھی اپنے ساتھ لایا ہوا خوبصورت کامدار فراک اور چوڑی دار پاجامہ پہن کر تیار ہوئی تھی۔ شاکنگ پنک اور سلور گرے رنگ کا اسٹائلش لمبا سا فراک اُس پر خوب جچ رہا تھا۔ اُس نے بال کھلے چھوڑے تھے اور خوبصورت میک اپ، جیولری سیٹ چوڑیاں گجرے پہنے وہ کسی حور سے کم نہیں لگ رہی تھی۔

گاؤں کی لڑکیاں بالیاں بوڑھی خواتین سبھی اُسے ستائشی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

ذویا بی بی یہ لیں یہ یہاں کی خاص سوغات ہے۔ ''میٹھا ٹکڑا'' ماسٹر جی کی بیوی حلیمہ نے ذویا کو ٹرے میں ایک پلیٹ میں روٹی کی شکل کی گول سی ٹکیاں اور ایک گلاس دودھ کا پیش کرتے ہوئے کہا۔

''ہوں، یمی، یہ تو بہت مزے کا ہے میٹھے پراٹھے جیسا گُڑ کا بنا ہے ناں۔'' ذویا نے میٹھا ٹکڑا کھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں جی، آٹے اور گُڑ سے بنتا ہے یہ، اب تو اس کا رواج بھی ختم ہو گیا ہے۔ خاص موقع پر بنا لیتے ہیں ہم۔'' حلیمہ نے بتایا۔

''بہت مزیدار ہے آپ مجھے اس کی ترکیب بتایئے گا میں گھر جا کے ٹرائی کروں گی۔''

''جی ضرور۔'' حلیمہ خوش ہو گئی اپنی سوغات کی تعریف سُن کر ذویا نے بانو کی شادی سلامی کے دو ہزار حلیمہ کو اُسی وقت دے دیے۔ حلیمہ کی خوشی دیدنی تھی۔ گاؤں میں کبھی کسی نے آج شادی میں سو پچاس یا دو سو روپے سے زیادہ کی سلامی کسی کو نہیں دی تھی۔ وڈیروں کا اپنا لین دین تھا اور اُن گاؤں کے غریب لوگوں کا اُن سے کیا مقابلہ؟

لڑکیاں مہندی لگا رہی تھیں۔ ڈھولک کی تھاپ پر مہندی کے گیت، ٹپے اور ماہیے گا رہی تھیں۔ ذویا نے چپکے سے اُن کی تصویریں کھینچ لی تھیں۔

''چلو نی چلو ڈانس کرو، گانا تو تمہیں ڈھنگ آتا ہی نہیں ہے۔'' یہ رضیہ کی آواز تھی۔ ذویا نے آواز کی سمت دیکھا تو بختاور خان کی تیسری بیوی رضیہ ہی تھی وہ...... رضیہ بھی اُسے دیکھ کے پہلے حیران ہوئی پھر دوستانہ انداز میں مسکراتی ہوئی اُس کے گلے سے آ لگی۔

(باقی آئندہ)

افسانہ

فرح انیس

جرمِ محبت

''بابا پھر آپ نے کیا سوچا عالیان کے بارے میں۔'' اس خاموشی کو پلوشہ کی آواز نے توڑا پلوشہ کے سوال پر وہ خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ ''بابا پلیز میں کچھ پوچھ رہی ہوں۔'' اپنے سوال کو نظرانداز ہوتا دیکھ کر وہ ٹیبل پر چمچ پٹختے ہوئے بولی۔ اس کی اس حرکت پر وہ......

کالی سیاہ چادر جیسے وہ چہرے کو چھپائے سر جھکائے مزار کی سیڑھیوں پر بیٹھی اترتے چڑھتے لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی وہ اُن سب سے بے نیاز زمین پر پڑی اس تتلی کو دیکھ رہی تھی جو کسی کے پیروں تلے آ کر مرگئی تھی جو کچھ دیر پہلے ہواؤں میں اڑتی پھرتی تھی مگر اب زمین پر پڑی تھی۔ اس کی قسمت کی طرح۔

''چائے پی لے بیٹا۔'' مائی کی آواز پر اس کا ارتکاز ٹوٹا۔ مائی کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لے کر وہ پینے لگی۔

''ہائے چائے تو بہت کڑوی ہوگئی لا میں تیری چائے میں شکر ڈال لاؤں۔'' مائی چائے کا پہلا گھونٹ بھرتے ہی بُرا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔

''نہیں مائی رہنے دو چائے کا پہلا گھونٹ بس تلخ لگتا ہے اس کے بعد تو ہر گھونٹ میں نشہ لگتا ہے وہ تلخی جو پہلے گھونٹ میں لگتی ہے نہ مائی بس وہ تلخی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ زندگی کے غم کی طرح ہر غم پہلی دفعہ ناقابل برداشت لگتا ہے اور بھاری بھی دوسری دفعہ یہی غم کم لگتا ہے۔'' کہہ کر وہ ڈھیرے سی ہنس دی۔ مائی ہونقوں کی طرح اس کی جانب دیکھنے لگی۔

☆......☆......☆

''ابا آخر کیا حرج ہے آپ عالیان سے دوبارہ مل تو لیں۔'' پلوشہ ہارون علی کے زانو پر ہاتھ رکھے پچھلے آدھے گھنٹے سے اُن کو منا رہی تھی۔ پلوشہ میں آپ سے کہہ چکا ہوں مجھے نہیں ملنا میں آپ کے کہنے پر ایک بار اس سے مل چکا ہوں۔

پر بابا عالیان میں کیا برائی ہے وہ ہر طریقے سے اچھا ہے اچھا فیملی بیک گراؤنڈ ہے خود بھی پڑھا لکھا ہے جیسا آپ میرے لیے چاہتے ہیں وہ بالکل ایسا ہے تو آپ پھر کیوں منع کر رہے ہیں۔'' وہ روہانسی ہو کر باپ کی جانب دیکھنے لگی۔

''آپ کی شادی عالیان سے کسی طور نہیں ہوسکتی۔'' اس کی بات کا جواب سرد مہری سے دیتے ہوئے کھڑے ہوگئے اور وہ وہیں صوفے پر

بیٹھ کر بے بسی سے رو دی۔

''کیا سوچا پھر تم نے؟'' عالیان کی بات پر پلوشہ غائب دماغی سے کافی کپ سے اڑتی ہوئی بھاپ کو دیکھے جا رہی تھی۔ پلوشہ میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں اب کہ وہ ذرا اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔ عالیان کی آواز پر وہ چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگی۔

''عالیان مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔'' وہ بے بسی سے اپنے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامتے ہوئے بولی۔ وہ دونوں اس وقت یونیورسٹی کیفے میں بیٹھے تھے۔

''دیکھو پلوشہ تمہارے بابا مان نہیں رہے اور میری نانی خاندان سے باہر شادی پر مجھے اجازت نہیں دیں گی میں چاہتا ہوں کہ شادی کر کے ہم حویلی چلے جائیں میں پھر خود ان کو راضی کر لوں گا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں جب سامنے نواسے کی اتنی خوبصورت دلہن دیکھیں گی تو ساری ناراضگی دور ہو جائے گی۔ وہ شریر لہجے میں بولا۔

''عالیان ہم شادی کیسے کر سکتے ہیں بابا نہیں مان رہے تم مجھے کچھ وقت دو میں ان کو منا لوں گی۔''

پلوشہ میرا اور اپنا وقت مت برباد کرو تمہارے

بابا کو ضد ہوگئی ہے وہ کبھی نہیں کریں گے تمہاری مجھ سے شادی ہاں تمہارے پاس دوسرا آپشن ہے مجھے بھول جاؤ۔''

عالیان کی بات پر وہ آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

'' جانتے بھی ہو تمہارے بغیر پلوشہ مرجائے گی۔''

'' پھر کیا کرنا ہے تم بتاؤ۔'' پلوشہ کی بات پر عالیان بولا۔

''میں تیار ہوں کورٹ میرج کے لیے۔'' پلوشہ کی بات پر عالیان کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

☆......☆......☆

کھانے کی ٹیبل پر وہ دونوں ہی خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔ ہارون علی پچھلے دو ہفتوں سے پلوشہ سے بات نہیں کر رہے تھے۔

''بابا پھر آپ نے کیا سوچا عالیان کے بارے میں۔'' اس خاموشی کو پلوشہ کی آواز نے توڑا۔ پلوشہ کے سوال پر وہ خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔

''بابا پلیز میں کچھ پوچھ رہی ہوں۔'' اپنے سوال کو نظر انداز ہوتا دیکھ کر وہ ٹیبل پر چمچ پٹختے ہوئے بولی۔ اس کی اس حرکت پر وہ سر اُٹھا کر سرد نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگے۔

'' بہت محبت کرتی ہو اُس سے۔'' ہارون علی کے سوال پر وہ بے ساختہ بول اُٹھی۔

''جی بہت۔''

'' اتنی محبت کہ باپ کا ادب بھول بیٹھی۔'' باپ کی بات پر وہ سر جھکا کر رہ گئی۔

''پلوشہ بیٹا ادب محبت کا پہلا قرینہ ہے۔''

''محبت انسان کو باغی بنا دیتی ہے بابا۔''

'' بیٹا بغاوتیں جنگ میں ہوا کرتی ہیں محبت میں نہیں۔ چلو یہ تو ثابت ہوا تمہیں کسی سے محبت ہے۔'' وہ طنزیہ انداز میں کہہ کر کرسی کھسکاتے ہوئے کھڑے ہوگئے۔

'' بابا آپ کی الگ اہمیت ہے اس کی الگ اہمیت۔''

'' تمہاری نظروں میں جس کی زیادہ اہمیت ہو بیٹا اُس کی سن لینا۔'' کہہ کر وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

عالیان اور پلوشہ دونوں ہی گاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ عالیان مردانہ وجاہت کا حسین شاہکار، جس کے ساتھ کے لیے کتنی ہی لڑکیاں خواب بُنتی تھی۔ مگر یونیورسٹی کے پہلے ہی دن وہ پلوشہ کو دیکھ کر دل ہار بیٹھا تھا۔ اب جب کہ دونوں ایک دوسرے کے اس قدر قریب ہوگئے تھے کہ ایک دوسرے کے بناء رہنا محال تھا تو پلوشہ عالیان کو اپنے بابا سے ملوانے لے گئی لیکن ہارون علی کے عالیان سے سرد رویے پر وہ کافی حیران ہوگئی یہاں تک کہ ہارون علی نے پلوشہ کو عالیان سے ملنے سے منع کر دیا تھا۔ اب گھر میں آئے دن عالیان کو لے کر جھگڑے ہونے لگے تھے۔

ہارون علی نے پلوشہ کو بہت چاؤ سے پالا تھا ان کی بیوی کی وفات تب ہی ہوگئی تھی جب پلوشہ بہت چھوٹی تھی۔ انہوں نے اسے ماں کی کمی نہ محسوس ہونے دی وہ باپ کے ساتھ ساتھ اپنی بیٹی کے بہترین دوست بھی تھے مگر عالیان والی بات سے باپ بیٹی کے درمیان ایک سرد جنگ تھی جو قائم تھی۔

☆......☆......☆

پچھلے ایک گھنٹے سے وہ مسلسل لان میں ٹہل رہے تھے۔ پلوشہ کی وجہ سے وہ کافی پریشان رہنے

لگے تھے۔ تھک کر وہ اندر کی جانب بڑھ گئے۔ کمرے میں دیوار پر لگی گھڑی پر نگاہ ڈالی تو گھڑی تین بجا رہی تھی۔ دل اس قدر بے چین تھا کہ انہوں نے خود کو کئی بار اس کے کمرے میں جانے سے روکا اور وہ اب بے صبری سے صبح ہونے کا انتظار کرنے لگے تا کہ پلوشہ کو تمام حقیقت سے آگاہ کر سکیں۔

صبح ہوتے ہی وہ پلوشہ کے کمرے کی جانب چل دیے بیڈ پر پلوشہ کو موجود نہ پا کر وہ واش روم کی جانب بڑھے واش روم کی لائٹ بند دیکھ کر وہ بیڈ کی جانب آئے تو سائیڈ ٹیبل پر لیمپ کے نیچے رکھے کاغذ کو دیکھ کر ٹھٹک گئے اور کانپتے ہاتھوں سے کاغذ اُٹھا کر پڑھنے لگے۔

''بابا مجھے معاف کر دیں میں عالیان کے بغیر نہیں رہ سکتی ہم دونوں شادی کر رہے ہیں وہ دل پکڑ کر وہیں بیڈ پر صدمے سے بیٹھ گئے۔

☆......☆......☆

لرزتے ہاتھوں سے وہ نکاح نامے پر سائن کرنے کے بعد عالیان کی جانب دیکھنے لگی جس کا چہرہ خوشی سے جگمگا رہا تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے عالیان کی نگاہ پلوشہ کے چہرے پر پڑی۔ کتنی ہراساں اور پریشان لگ رہی تھی وہ۔

''کیا ہو گیا پلوشہ اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو۔'' عالیان کے پوچھنے پر وہ روہانسی ہو گئی۔

''پتا نہیں بابا کی کیا حالت ہو گی اور تمہارے گھر والے کیا مجھے قبول کر لیں گے وہ بھرائے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگی۔ اس کی بات پر وہ ہنس دیا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا میری جان۔'' وہ گاڑی چلاتے ہوئے اس پر ایک مسکراتی نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ گاڑی انجان راستوں پر رواں دواں تھی۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی ایک سنسنان جگہ رک گئی۔

''یار یہاں ایک مزار ہے۔ ذرا میں فاتحہ پڑھ لوں آؤ تم بھی میرے ساتھ۔'' عالیان کے کہنے پر وہ گاڑی سے اُتر کر اس کے ساتھ چل دی۔ عالیان مزار کے اندر چلا گیا اور وہ وہیں سیڑھیوں پر رُک کر اُس کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سیڑھیاں اُتر کر اس کے پاس آ گیا۔

''چلیں۔'' پلوشہ نے مسکرا کر پوچھا۔ اس کے پوچھنے پر وہ بے ساختہ ہنس دیا۔

''کہاں چلیں۔''

''گھر اور کہاں......؟'' عالیان کی بات پر وہ اُسے حیرانگی سے دیکھنے لگی۔

''گھر تو تمہارے میں لے آیا ہوں ڈارلنگ!''

''عالیان مذاق مت کرو چلو دیر ہو رہی ہے۔'' عالیان کے مذاق پر وہ خفگی سے کہتی گاڑی کی طرف چل دی۔ گاڑی کا دروازہ کھولنے کی غرض سے اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو عالیان نے پکڑ لیا۔

''کیا کرتی ہو پلوشہ دیکھو میں تمہیں تمہارے گھر لے آیا ہوں اور تم ہو کہ سمجھ نہیں رہی ہو۔'' عالیان کی بات پر وہ غصے سے اس کو دیکھنے لگی۔

''عالیان میں کب سے تمہارا مذاق برداشت کر رہی ہوں تم ہو کہ مذاق ہی کرے جا رہے ہو اب اور مذاق کیا تو میں ناراض ہو جاؤں گی۔''

اس کی بات پر عالیان قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''ارے یار کس طرح سے سمجھاؤں تم کو میں کہ میرا اور تمہارا ساتھ بس یہیں تک کا تھا میری نانی شمسہ جہاں کا انتقام آج پورا ہوا وہ نفرت جو ہمیں تمہارے خاندان سے ہے وہ آگ جس میں

میری ماں کب سے جھلس رہی تھی صرف اور صرف تمہاری پھوپی اور تمہارے باپ کی وجہ سے تم کیا سمجھیں میں تم سے محبت کرتا ہوں تمہاری محبت میں مر رہا تھا۔'' وہ چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ سجائے مذاق اڑاتی نگاہوں سے پلوشہ کو دیکھنے لگا۔ وہ ایک ٹک بے یقینی سے عالیان کو دیکھے جا رہے تھی۔ وہ عالیان کی بات کو سمجھتے ہوئے بھی نہیں سمجھنا چاہ رہی تھی۔

''تو تم نے صرف اور صرف مجھ سے انتقام لیا سب کچھ جھوٹ تھا مگر تمہاری آنکھوں میں جو میرے لیے محبت تھی وہ جھوٹ نہیں تھا عالیان، گالوں پر روانی سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو وہ بے دردی سے صاف کرتی ہوئی بولی۔ اس کی بات پر وہ نظریں چرا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''نظر کیوں چرا رہے ہو دیکھو میری آنکھوں میں اور جواب دو۔'' وہ زور سے چیخ کر بولی۔ اس کی بات پر وہ گاڑی کی جانب بڑھ گیا وہ بھاگتے ہوئے اس کے پیچھے آئی۔

''عالیان تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے میں اب تمہاری بیوی ہوں تم مجھے یہاں مزار پر چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہو۔'' وہ روتی ہوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ وہ ہاتھ چھڑاتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا پلوشہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے گاڑی میں بیٹھتا دیکھنے لگی اور چپ چاپ آہستہ قدموں سے پیچھے کی جانب ہونے لگی اس کی فریاد کرتی ہوئی نگاہیں عالیان کے چہرے پر تھی مگر وہ کٹھور بنا بیٹھا رہا عالیان نے ایک نگاہ اس پر ڈالی اور گاڑی تیزی سے آگے بڑھا لی وہ اڑتی دھول کو برستی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

وہ کافی تیزی سے گاڑی چلا رہا تھا۔ بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے روتی ہوئی پلوشہ کا چہرہ آ جاتا آنے والی سوچوں کو جھٹکتے ہوئے اس کی گاڑی حویلی کی جانب تیزی سے گامزن تھی۔ آج تو ان کی فتح کا دن تھا۔ شمسہ جہاں کی جیت کا دن اپنی ماں کی آنکھوں میں خوشی کے رنگ دیکھنے تھے۔

خوش کر دیا آج تو نے اپنی نانی کو شمسہ جہاں عالیان کو گلے لگاتے ہوئے خوشی سے چور لہجے میں بولی۔ عائلہ شاہ نے بھی آگے بڑھ کر بیٹے کی پیشانی چوم ڈالی وہ آگ جو برسوں سے میرے اندر لگی تھی آج جا کر ٹھنڈی ہوئی ہے۔ عائلہ شاہ بیٹے پیار کرتے ہوئے بولی۔

''اب جا کر میں ہارون علی شکست کا تماشا دیکھوں گی۔ شمسہ جہاں کے لہجے میں رعونت تھی۔ ماضی اپنی تمام تر تلخیوں کے ساتھ ایک بار پھر ان کی آنکھوں میں آ ٹھہرا تھا۔

عائلہ شاہ اور دلاور شاہ دونوں بہن بھائی ایک ہی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ بچپن میں ہی دونوں کے رشتے اپنے چچا کے گھر طے ہو گئے تھے۔ عائلہ شاہ اپنے چچا زاد احمد شاہ سے منسوب تھیں اور احمد شاہ کی بہن ہانیہ شاہ دلاور شاہ کی منگیتر تھیں۔ دلاور شاہ کو ہانیہ شاہ میں شروع سے دلچسپی نہ تھی۔ جبکہ عائلہ شاہ اپنے منگیتر احمد شاہ سے بے پناہ محبت کرتی تھیں۔ باہر سے پڑھ کر آئے ہوئے خوبرو سے اونچے لمبے احمد شاہ عائلہ شاہ کا عشق تھا۔ حویلی میں بھونچال تب آیا جب دلاور شاہ نے ہانیہ شاہ سے شادی سے انکار کر دیا کیونکہ ان کو اپنے دوست ہارون علی کی بہن مہرین سے شدید محبت تھی جو ان کے ساتھ یونیورسٹی میں ہی زیر تعلیم تھی ان کے اس انکار پر شاہ حویلی میں ایک کہرام برپا ہو گیا۔ رئیس شاہ نے عائلہ کو بھی بہو بنانے سے انکار کر دیا جس پر حشمت شاہ نے

اپنے اکلوتے بیٹے دلاور شاہ کو حویلی سے نکال دیا اور جائیداد سے عاق کردیا۔ شمسہ جہاں سے اپنی بیٹی کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ ان کے آنسو شمسہ جہاں کے دل پر گرتے تھے۔ حشمت شاہ نے اپنے دور کے رشتے داروں میں عائلہ شاہ کی شادی کردی مگر شادی کے دو سلا بعد وہ طلاق کا داغ ماتھے پر سجائے حویلی واپس چلی آئیں۔ دراصل وہ احمد شاہ کو بھول نہیں پائی تھیں۔ بیٹی کی طلاق کا صدمہ حشمت شاہ برداشت نہ کرپائے اور دنیا سب چل بسے ابھی شاہ حویلی کا غم کم نہ ہوا تھا کہ دلاور شاہ اور مہرین کے روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال کی خبر نے حویلی دیواروں کو ہلا دیا۔ ان کا یہ غم کسی طور کم نہیں ہوتا کہ وہ اپنے بیٹے سے نہ مل سکی اکثر وہ سوچ کر رہ جاتیں کہ کاش دلاور شاہ کی نشانی ہوتی تو وہ اس کو اپنے پاس رکھتی اس کو لاڈ سے پالتی ان کو دلاور شاہ کی کوئی اولاد نہ ہونے کا بڑا قلق تھا کہ کاش وہ اس کو ہی اپنے پاس رکھ لیتی۔

عالیان نے ہمیشہ اپنی ماں اور نانی کے منہ سے ہارون علی اور مہرین کا ذکر نفرت آمیز ہی سنا اسے ہمیشہ یہی بتایا گیا۔ شاہ حویلی کی بربادی کا ذمے دار ہیں دو لوگ تھے۔ عالیان کے دل میں نفرت اپنی جڑیں پکڑ چکی تھی۔ تبھی اس نے ہارون علی کی بیٹی کو اس انتقام کا نشانہ بنایا۔

وہ ہراساں نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے مزار کے ایک کونے میں کھڑی تھی۔

''کون ہو بیٹی۔'' آواز پر وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی۔ جہاں ایک بوڑھی عورت کھڑی ہوئی اس کو دیکھ رہی تھی۔ پتا نہیں کون ہوں میں روتے ہوئے وہ بولی۔

''کیا نام ہے بیٹا! گمنام ہوں میں۔'' یہ کہہ کر وہ وہی گھٹنوں کے بل بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

''کوئی نہیں ہے میرا کوئی نہیں ہوں میں بدقسمت نام ہے میرا......'' اس کے اس طرح رونے پر وہ بوڑھی عورت اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے لگی۔

''میرے ساتھ چلو میں یہاں مزار کے احاطے میں بنے ہوئے کمرے میں رہتی ہوں۔''

وہ چپ چاپ عورت کے ساتھ چلتی ہوئی اس کمرے میں آگئی جہاں اس بوڑھی عورت کی رہائش تھی۔ اس کو چارپائی پر بٹھا کر وہ اس کے لیے پانی لینے چلی گئی۔

''لے پانی پی لے۔'' وہ چپ چاپ پانی پینے لگی۔

''مجھے سب یہاں مزار پر مائی بولتے ہیں تو بھی مائی بولنا۔ اکیلی رہتی ہوں میں ایک بیٹا ہے دوسرے شہر مزدوری کرتا ہے۔ مہینہ دو مہینہ میں مجھ بوڑھی سے ملنے ایک دو دن آجاتا ہے۔ تو بے فکری سے میرے پاس رہنا میری بیٹی ہو آج سے تم۔'' مائی اس کے برابر بیٹھی ہوئی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی۔ وہ آنسو ضبط کیے مائی کی بات پر سرہلا کر رہ گئی۔

آدھی رات گھبرا کر آنکھ کھلی تو وہ چارپائی پر لیٹے سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ چہرے پر آئے پسینوں کو وہ چادر سے صاف کرتی ہوئی گھٹنوں میں منہ دے کر پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

خواب میں اس نے ہارون علی کو روتے ہوئے دیکھا تھا۔ کافی دیر رونے کے بعد وہ تھک کر گھور سیاہ آسمان کو دیکھنے لگی۔ کاش بابا میں آپ کی سن لیتی تو آج یوں در بدر نہ ہوتی پھرتی۔ وہ چارپائی پر کروٹ کے بل لیٹ گئی برابر چارپائی پر مائی سو رہی تھی مائی کو اتنا پُرسکون سوتا دیکھ کر پلوشہ رشک سے مائی کو دیکھنے لگی۔

جہاں ایک بوڑھی عورت کھڑی ہوئی تھی وہ خالی خالی آنکھوں سے اس عورت کو دیکھنے لگی۔

یہ پُرسکون نیند شاید اب میری زندگی میں کبھی نہیں۔ ہاں یہی میری سزا بھی ہے وہ ہونٹ بھینچے بہتی آنکھوں سے سوچنے لگی۔

صبح سے حویلی میں جشن کا سماں تھا۔ آج شمسہ جہاں کے اکلوتے نواسے کی شادی طے ہوگئی تھی۔ صبح سے عالیان مضطرب سا اِدھر اُدھر پھر رہا تھا آسان نہیں ہوتا اپنی محبت کو بیچ چوراہے پر چھوڑ دینا۔ عالیان کی کوئی رات ایسی نہ گزرتی کہ جس میں خواب میں روتی بلکتی فریاد کرتی ہوئی پلوشہ اس کے سامنے نہ آئی ہو۔ شمسہ جہاں اپنے نواسے اور بیٹی کے ساتھ ہارون علی کے گھر شادی کا کارڈ دینے جارہی تھی۔ درحقیقت میں تو وہ ہارون علی کی شکست کا تماشہ دیکھنے جارہی تھیں۔

اس وقت وہ تینوں نفوس ہارون علی کے شاندار سے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ شمسہ جہاں کے چہرے کی رعونت دیکھنے والی تھی۔ کمرے کی خاموشی کو شمسہ جہاں کی آواز نے توڑا۔

''تمہاری بہن نے مجھ سے میرا بیٹا چھینا آج خود تم کیسا محسوس کررہے ہو بیٹی کو کھو کر۔'' شمسہ جہاں تمسخرانہ نگاہوں سے ہارون علی کے چہرے کو دیکھنے لگی جن کے چہرے پر عجیب بے بسی تھی۔

''جانتے ہو ہارون علی میں آج تمہاری شکست کا تماشہ دیکھنے آئی ہوں۔ زخم دینے والے کو جب خود زخم لگتا ہے تو اس کے کیا احساسات ہوتے ہیں۔ وہ ہارون علی کے چہرے پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے بولیں۔ ہارون علی خاموشی سے ان تینوں کے چہروں کا جائزہ لینے لگے۔

شمسہ جہاں کی طنز بھری نگاہیں، عائلہ شاہ کے لب تو خاموش تھے مگر چہرے کی مسکراہٹ ہارون علی کی بے بسی کا مذاق اڑا رہی تھی۔ ان سب میں عالیان تھا جو سر جھکائے ٹیبل پر نظریں گاڑھے بیٹھا ہوا تھا۔ ہارون علی کو بے ساختہ وہاں بیٹھے لوگوں پر رحم آنے لگا۔

جنہیں پتا نہیں تھا کہ ہارون علی کے لبوں سے نکلنے والے الفاظ اُن کے دل پر کیسی قیامت لانے والے ہیں۔

''شمسہ بیگم آج آپ میرے گھر خود اپنی ہی شکست کا تماشہ دیکھنے آگئی ہیں۔ ان کے کہنے پر تینوں ہی چونک کر ان کو دیکھنے لگے۔

''ہارون علی لگتا ہے بیٹی کے کھو جانے پر تمہاری دماغی حالت خراب ہوگئی۔'' عائلہ شاہ ہارون علی کو دیکھ کر طنز سے بولی۔

''وہ میری بیٹی نہیں تھی۔ مہرین اور دلاور شاہ کی بیٹی تھی۔ مہرین اور دلاور نے مجھ سے یہ بات آپ لوگوں کو بتانے سے منع کیا تھا۔ حادثے میں مہرین فوراً جاں بحق ہوگئی تھی مگر اسپتال میں دلاور شاہ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ پلوشہ کو میں باپ بن کر پالوں گا اور یہ حقیقت میں پلوشہ تک کو نہیں بتاؤں گا مگر آپ نے اپنی ہی پوتی کے ساتھ اتنا ظلم کیا۔'' یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔ ان کے اس انکشاف پر تینوں ساکت بیٹھے ہوئے ہارون علی کے چہرے کی جانب پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

☆......☆......☆

''اب کے تُو بہت دنوں بعد آیا ہے کرمے۔'' مائی بیٹے کے آگے روٹی رکھتے ہوئے بولی۔

''ہاں اماں کام میں پھنسا ہوا تھا۔'' کھانا کھاتے ہوئے کرمے کی نگاہیں ایک کونے میں بیٹھی پلوشہ کے وجود پر گڑی ہوئی تھی۔

''کون ہے یہ تو نے بتایا نہیں۔''

”میری بیٹی ہے تو یہ سمجھ لے۔“ مائی ٹالتے ہوئے بولی۔
”لگتی تو کسی اچھے گھر کی ہے۔ کیوں تجھے کیا کرنا ہے۔“ مائی کے کڑے انداز سے پوچھنے پر وہ چپ چاپ کھانا کھانے لگا۔ اب کے کرمے کا قیام کافی طویل ہو گیا تھا۔ مائی بھی بیٹے کے آنے پر خوش تھی مگر پلوشہ کرمے کی بے باک نگاہوں سے ہر وقت خوف زدہ رہتی۔ رات کسی کے بولنے کی آواز پر اس کی آنکھ کھلی تو وہ کمرے سے نکل کر چھوٹے سے صحن کی جانب آ گئی جہاں کرمے فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔
”ارے میڈم خوش کر دوں گا آپ کو لڑکی نہیں پوری شہزادی ہے۔ بس قیمت میرے مطلب کی ہو۔ ہاں تھوڑا سا وقت دے اماں اِدھر اُدھر ہو تو شہزادی لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گا غلام۔“ دوسری جانب پتا نہیں کیا کہا گیا کہ وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔
پلوشہ منہ پر ہاتھ رکھے خوف سے اندر کمرے کی جانب بڑھ گئی وہ کافی دن سے کرمے کی نگاہوں سے پریشان تو تھی مگر اس کو اتنا اندازہ نہیں تھا۔ انہی سوچوں میں رات کے چار بجے گئے تھے۔ وہ صحن کی جانب آئی جہاں کرمے سو رہا تھا۔ اندر آ کر اس نے مائی پر آخری نگاہ ڈالی دل ہی دل میں ان کا شکریہ ادا کرتی ہوئی وہ دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ صحن میں آ کر سیاہ گھور آسمان کو دیکھتی ہوئی دروازہ کھول کر وہ باہر کی جانب تیزی سے نکل گئی۔ مائی کب تک میری حفاظت کر سکتی ہے۔“ یہ سوچتی ہوئی وہ تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔ کافی دیر سے بس چلی جا رہی تھی منزل کا تعین کیے بغیر، اب وہ کافی دور نکل آئی تھی۔ صبح کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔ سورج کی روشنی میں وہ اس اجنبی جگہ کو دیکھنے لگی پھر تھک کر وہ وہیں درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔
”میں پلوشہ ہارون علی ایک بدقسمت لڑکی ہوں۔ ایک مرد کی محبت میں آ کر میں نے اس شخص سے خود کو دور کر ڈالا جو میرا، سائبان تھا میرا باپ تھا۔ عالیان تمہیں میں زندگی بھر معاف نہیں کروں گی میری بددعا ہے جس طرح تم نے مجھے اپنے انتقام کی بھینٹ چڑھا کر دربدر کیا۔ خدا کرے تم بھی میرے عشق میں دربدر پھرو، تمہیں ایک پل کا چین نصیب نہ ہو۔“ وہ ہچکیوں سے روتی ہوئی اپنے اطراف میں دیکھنے لگی اور کھڑی ہو گئی۔ مجھ جیسی لڑکیوں کے لیے یہ سزا ہے یوں دربدر ہونا کیونکہ یہ سزا میں نے خود اپنے لیے چنی ہے وہ منہ پر ہاتھ رکھتی ہوئی اپنی بلند ہوئی چیخوں کو دباتی ہوئی چلنے لگی۔ سیاہ چادر کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے جو گرد آلود ہو گئی تھی۔ وہ انجان منزل کی جانب برستی آنکھوں سے چلی جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

شمسہ جہاں خود کو بہت عقل مند سمجھنے والی عورت آج خود اپنی بے بسی پر روتی ہوں۔ انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے ناراضگی میں اپنے ہی خاندان کی عزت کو بیچ چوراہے پر چھوڑ ڈالا۔ میں اعتراف کرتی ہوں اپنی کم ظرفی کا ساری زندگی میرے آگے سر جھکانے والا بیٹا مہرین کے عشق میں گرفتار ہو کر اس عورت کے لیے میرے مقابل کھڑا ہوا میں یہ کیسے برداشت کر لیتی۔ میں یہ بھی اعتراف کرتی ہوں مجھے بیٹی کے دکھ نے اتنا ہی رُلایا جتنا مجھے میرے بیٹے کی اپنی محبت مہرین کو مجھ پر فوقیت دینے پر ہوئی کیا قصور تھا اس کا کہ اس نے محبت کی تھی یہ محبت میں نے اس کا جرم بنا ڈالا اپنی انا کے ہاتھوں میں نے خود کو برباد کر ڈالا۔ میرا

عالیان مجھ سے کچھ نہیں کہتا اس کی خاموشی مجھے وحشت میں مبتلا کر دیتی ہے سارا وقت پلوشہ کو ڈھونڈتا رہتا ہے مگر اسے پلوشہ نہیں ملتی وہ کہتا ہے۔

''نانی میری سزا تو جب ہی شروع ہو گئی تھی جب میں اس کو مزار پر چھوڑ کر آیا تھا میں یہ بھی جانتی تھی پلوشہ سے وہ عشق کرتا ہے پر میں ایک ایسی عورت ہوں جس نے اپنے انتقام کی آگ سے سب کچھ خاکستر کر ڈالا عائلہ ہر وقت بیٹے کی خاموشی پر روتی ہے وہ مجھ سے لڑتی ہے کہ اس آگ کو بڑھانے میں میرا ہاتھ تھا۔ عالیان نے شادی سے انکار کر دیا ہے وہ کہتا ہے میرا نکاح ہو گیا تھا اب میری زندگی میں کوئی اور لڑکی نہیں آ سکتی وہ مجھ سے کچھ نہیں کہتا مگر اس کی آنکھوں میں، میں نے اپنے لیے نفرت اور شکوے دیکھے ہیں۔ میری پوتی جس کا مجھے ارمان تھا میرے دلاور کی نشانی آج نجانے کدھر ہے۔ میرے دلاور کا جرم محبت تھا اور میرا جرم ناقابلِ معافی ہے۔

☆......☆......☆

رات کے اس پہر وہ اندھا دھند بھاگتی چلی جا رہی تھی وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اب کہاں جائے گی۔ وہ آنے والے وقت سے خوفزدہ اِدھر اُدھر دیکھتی بس چلے جا رہی تھی۔ ایک کمرے سے تو وہ بچ کر آ گئی تھی مگر لوگوں کی اس بھیڑ میں وہ کس کس سے خود کو بچائے گی۔ صبح کا سورج طلوع ہو چکا تھا وہ مستقل ہچکیوں سے روتی ہوئی سراسیمہ نگاہوں سے اپنے اطراف میں دیکھتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

ہارون علی کے انکشاف نے شاہ حویلی کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

''یہ کیا ہو گیا اماں......'' عائلہ شاہ خوفزدہ سی شمسہ جہاں کو دیکھنے لگی۔ جن کے لبوں پر جامد خاموشی تھی وہ جب سے ہارون علی کے گھر سے آئی تھیں۔ ایسے ہی چپ تھیں۔

''کیا ہو گیا ہے کیا اب بھی کچھ ہونا باقی ہے۔'' عالیان کی آواز پر عائلہ شاہ بیٹے کو دیکھنے لگی۔ شمسہ جہاں چپ چاپ اس ہی حالت میں بیٹھی رہی۔

''آپ لوگوں کو تو تماشہ دیکھنا تھا ہارون علی کی بے بسی کا کیا ہوا دیکھ لیا تماشہ۔'' وہ طنزیہ لہجے میں کہتا دونوں کو دیکھنے لگا۔

''جشن کا سماں ہونا چاہیے آج تو فتح منائیں، چپ کیوں ہیں آپ دونوں۔ میں تو آپ لوگوں کے لیے کٹھ پتلی کی مانند تھا جو کہا آپ نے وہ کرا یہاں تک کہ اپنی بیوی کو بھی بیچ چوراہے پر چھوڑ آیا یہ بھی نہ سوچا کہ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔'' وہ سرخ ہوتی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ میری طرف سے آپ ان لوگوں کو شادی سے انکار کر دیجیے گا۔ اس نے غصے سے اپنا فیصلہ سنایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

قیامت تو ہارون علی پر بھی ٹوٹی تھی وہ تو یہی سمجھتے رہے کہ ان کی بیٹی عالیان کے ساتھ ہو گی مگر شمسہ جہاں کے انکشاف نے ان کو اندر تک ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت بھی وہ دونوں مزار پر پلوشہ کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ عالیان کی متلاشی نگاہیں پلوشہ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہاں بیٹھے بہت سے لوگوں سے ان لوگوں نے پلوشہ کے بارے میں پوچھا مگر کوئی نہیں جانتا تھا۔ پلوشہ مائی کے ساتھ صرف ایک بار ہی مزار آئی تھی ورنہ وہیں کمرے میں رہا کرتی تھی۔ تھک ہار کر دونوں واپسی کی طرف چل دیے۔

صبح سویرے ہی ہارون پلوشہ کو ڈھونڈنے نکل گئے تھے۔ دوسری طرف عالیان بھی پلوشہ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ گاڑی چلاتے ہوئے مسلسل پلوشہ کے

بارے میں سوچ رہے تھے کہ سامنے سے آتے وجود کو دیکھ کر ہارون علی کو بریک لگانے پڑ گئے۔
وہ روڈ کے وسط میں چلتی ہوئی سامنے سے آتی گاڑی سے بچتے ہوئے سائیڈ پر ہو کر سست رفتار سے چلنے لگی کہ بازو پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوتے ہی وہ ڈر کر اچھلی اور خوف سے پلٹی تو سامنے کھڑے ہارون کو دیکھ کر ساکت ہوگئی۔

☆......☆......☆

وہ پچھلے دو دن سے خود کو کمرے میں بند کیے بیٹھی تھی۔ شرمندگی، ندامت کیا نہیں تھا پلوشہ کو اس کو لگتا تھا کہ وہ ساری زندگی اب ہارون علی کے سامنے سر نہیں اُٹھا سکتی۔ آہٹ پر وہ چونک کر دروازے کی جانب دیکھنے لگی۔ کمرے میں آتے ہارون علی کو دیکھ کر بے ساختہ اس کا سر جھک گیا۔ وہ وہیں اس کے پاس بیڈ پر ٹک گئے۔
''یوں خود کو کمرے میں بند کر لینے سے کیا ہوگا۔'' ہارون علی کے کہنے پر وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر پھوٹ کر رو دی۔
''بابا مجھے معاف کر دیں میں نے بہت دل دکھایا ہے آپ کا بہت نافرمانی کی۔'' وہ روتے ہوئے ہارون علی کے سینے سے لگ گئی۔
''تمہیں اپنے کرے پر پشیمانی ہے اور جب ہمیں اس کا احساس ہو جائے تو وہ گناہ گناہ نہیں رہتا میری جان۔'' وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔
''ہر تلخ بات کو بھول جاؤ بیٹا، میں نے تمہیں معاف کیا۔'' ہارون علی کے کہنے پر اس نے پُرسکون ہو کر آنکھیں موند لیں۔

☆......☆......☆

''بیٹا تم سے شمسہ جہاں ملنا چاہتی ہیں۔'' سلائس پر مکھن لگاتی پلوشہ کا ہاتھ رک گیا۔
''مجھے نہیں ملنا ان سے پھر وہ کیوں آ جاتی ہیں یہاں۔'' جھنجلا کر کہتی ہوئی وہ چائے کا کپ ٹیبل پر رکھتی ہوئی بولی۔
''وہ تم سے معافی مانگنا چاہتی ہیں۔'' ہارون علی کی بات پر وہ سر جھٹک کر ناشتہ کرنے لگی۔
''بیٹا وہ پچھلے ایک ماہ سے ہمارے گھر آ رہی ہیں اور تم ان کو مایوس لوٹا دیتی ہو۔ مل تو لو ان سے۔''
''میرے دل میں بابا اس عورت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے بری بنی آپ کی نظر میں، میں بھٹکتی رہی صرف ان کی وجہ سے، انہوں نے صرف مجھے اپنے انتقام کا نشانہ بنایا۔ میں نے کیسے وقت گزارا میں جانتی ہوں۔'' وہ آنسو بھری آنکھوں سے ہارون علی کو دیکھتے ہوئے بولی۔
''اپنے باپ کی ماں کے لیے بھی تمہارے دل میں کوئی گنجائش نہیں۔''
''کیا مطلب بابا؟'' وہ ناسمجھی سے بولی۔
''تم میری نہیں دلاور اور مہرین کی بیٹی ہو۔'' آہستہ آہستہ وہ اسے ساری حقیقت بتانے لگے۔ وہ آنکھیں پھاڑے حیرت سے ان کو سن رہی تھی۔
آج پھر شمسہ جہاں اور عائلہ شاہ ان کے گھر میں موجود تھے۔
''کیا تم ہمیں معاف کر سکتی ہو پلوشہ......'' عائلہ شاہ پلوشہ کا ہاتھ پکڑے برستی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولنے لگی۔
''میں نے آپ لوگوں کو معاف کیا کیونکہ اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔'' سپاٹ لہجے میں کہتی وہ کھڑی ہوگئی اور باہر کی جانب قدم بڑھانے لگی۔ مگر شمسہ جہاں کو دیکھ کر رُک گئی اور لاتعلقی سے دوسری طرف دیکھنے لگی۔ مگر شمسہ جہاں کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو نظر انداز نہ کر سکی۔ تھوڑی دیر بعد دونوں دادی پوتی ایک

دوسرے کے گلے لگی ہچکیوں سے رورہی تھیں۔

☆......☆......☆

زندگی پھر سے اپنی ڈگر پر چلنے لگی تھی۔ سب کچھ ٹھیک ہوگیا تھا۔ مگر پلوشہ اور عالیان میں وہی لاتعلقی تھی۔ عالیان پلوشہ کا سامنا کرنے سے کترا رہا تھا۔ شمسہ جہاں نے ہارون علی سے پلوشہ کی رخصتی کی بات کی تھی مگر پلوشہ نے ابھی رخصتی کروانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کو ابھی کچھ وقت چاہیے تھا۔ عالیان کو پلوشہ کے انکار کی خبر ہوگئی تھی وہ پلوشہ کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں کر پارہا تھا۔

وہ رات کھانے کے بعد لان میں چہل قدمی کررہی تھی۔ ہارون علی دوست کے گھر ڈنر پر گئے ہوئے تھے۔ سامنے سے آتے عالیان کو دیکھ کر وہ تیزی سے اندر کی جانب جانے لگی۔ عالیان نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہاتھ چھوڑو میرا وہ غصے سے کہتی ہاتھ چھڑانے لگی۔

''نہ چھوڑوں تو......'' وہ سنجیدگی سے کہتا اسے دیکھنے لگا۔

''کیوں تمہارے لیے ہاتھ چھوڑنا کیا مشکل ہے۔'' طنز سے کہتی ہوئی اسے دیکھنے لگی۔ اس کی بات پر وہ گہرا سانس بھر کر وہاں رکھی کرسی پر اسے بٹھانے لگا۔ خود دو زانو اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''میرے پاس لفظ نہیں پلوشہ کہ میں بولوں کیا اور مجھے تمہیں سنانہیں، عالیان یہ کہتی ہوئی وہ کھڑی ہونے لگی۔

''پلیز پلوشہ سن تو لو مجرم کو بھی پھانسی سے پہلے بولنے کی مہلت دی جاتی ہے۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی بٹھاتے ہوئے بولا۔

''تم نے دی تھی مجھے مہلت بولنے کی عالیان......''

''میں تمہارا قصوروار ہوں پلوشہ......''

''یہ سچ ہے جب تک تم ساتھ تھی پتا ہی نہیں چلا محبت ہوتی کیا ہے تمہیں کھو کر احساس ہوا پلوشہ محبت ہوتی کیا ہے۔'' وہ چونک کر عالیان کو دیکھنے لگی۔

''میں مانتا ہوں میں نے تمہارے ساتھ بہت غلط کیا ہے میں اپنی نانی اور ماں کے کہنے میں آکر تم سے انتقام لے رہا تھا درحقیقت تو پلوشہ میں نے خود سے انتقام لیا جس دن تم کو چھوڑ کر آیا تھا اس دن سے میں سکون کے لیے ترس گیا تھا۔ میرا جرم ناقابلِ معافی ہے۔ پر اتنی سی گزارش ہے کہ پلوشہ اتنی نفرت نہ کرو تمہاری نفرت میں سہہ نہیں پاؤں گا۔ مرجاؤں گا۔'' پلوشہ نے بے ساختہ ہاتھ اس کے لبوں پر رکھ دیا۔

''مرتو میں بھی جاؤں گی عالیان تمہیں کچھ ہوا تو۔ آج بھی تمہارے سامنے وہی پلوشہ بیٹھی ہے جو کہتی تھی عالیان تمہارے بغیر پلوشہ مرجائے گی۔ تم نے بہت ظلم کیا اپنی پلوشہ کے ساتھ روتے ہوئے شکوہ اس کے لبوں پر مچل گیا۔ عالیان کھڑے ہوکر اس کو چپ کرانے لگا۔

''تمہارا مجرم تمہارے سامنے ہے جو چاہے اس کو سزا دو۔'' عالیان کی بات پر پلوشہ کھڑی ہوگئی۔

''ہاں سزا تو تمہیں ملنی چاہیے۔'' عالیان سانس روکے خوف اس کو دیکھنے لگا۔

''تمہاری سزا ہے عالیان کہ تم نے ساری زندگی میرے ساتھ گزارنی ہوگی۔ بولو منظور ہے۔'' سنجیدگی سے کہتی ہوئی وہ شوخی سے اس کو دیکھنے لگی۔ عالیان بے یقینی سے اس کو دیکھنے لگا اور جب بات سمجھ میں آئی تو خوشی سے جھوم اٹھا۔ پھر کل ہی رخصتی کروالیں۔ خوشی سے وہ بولا۔

پلوشہ اس کے کہنے پر بے ساختہ ہنس دی وہ محبت سے اس کے چہرے کی جانب دیکھنے لگا۔

☆☆......☆☆

محبتوں سے گندھی تحریر کا آخری حصہ

اس دفعہ تم ڈرائیور کے ساتھ آئی ہو۔تم نے اُن کو کوئی اہمیت نہ دی تھی مگر اپنے مفاد اور بھرم کے لیے اُن کو یُوز خوب کیا تم نے، یونیورسٹی میں تم اُن کو جیسے نظر انداز کرتی ہو دیکھا ہے میں نے مگر تائی اماں کے سامنے تم کتنی نرمی سے بات کرتی ہو۔

یہ تمہارا دوغلا پن نہیں ہے تو کیا ہے لیلیٰ! جو کچھ ہوا اُس میں اُن کی غلطی نہ تھی مگر وجہ وہی تھے اس لیے انہوں نے تمہاری ہر بدتمیزی کو برداشت کیا اور تم نفرت کا اظہار کرتی رہیں، مگر وہی نفرت اپنا بھرم رکھنے کو کہاں چلی جاتی ہے؟ کہاں تو تم اُن کو مخاطب بھی نہیں کرتیں، اور جب اپنا مطلب ہوتا ہے تو تم اُن کو فون تک کر لیتی ہو۔تم انتہائی خودغرض لڑکی ہو اُمِ لیلیٰ جس کو صرف اپنی 'میں' عزیز ہے۔

تم نے ہر ایک شخص کو ذلیل و رسوا کر کے رکھ دیا ہے۔اور تمہیں لگتا ہے کہ جیسے تم نکاح نامے پر سائن کرنے پر مجبور تھیں وہ طلاق نامے پر سائن نہ کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ تمہاری بہت بڑی بھول ہے۔

دو منٹ بھی نہیں لگیں گے انہیں تمہیں طلاق دینے میں کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں اور بالفرض وہ مجبور ہیں طلاق نہیں دے سکتے، دوسری شادی تو کر ہی سکتے ہیں کہ آخر کب تک وہ یہ سب برداشت کریں گے؟ آدھے ادھورے رشتوں کے ساتھ اپنی زندگی گزاریں گے۔ غصہ انا وغیرت میں زبان کی پاسداری کو طلاق نہیں دیں گے مگر دوسری بیوی تو لا ہی سکتے ہیں کیونکہ پہلی بیوی تو محض کاغذی ہی ہے اور ایک نئی ازدواجی زندگی شروع کرنے کا تو اختیار رکھتے ہیں کیونکہ تم تو اس قابل بھی نہیں ہو کہ شوہر کے حقوق ادا کر سکو۔''

وہ اُس کے رونے کی پرواہ کیے بغیر ایک سانس میں ہی بہت کچھ کہہ گئی تھی مزید کہہ رہی تھی کہ وہ چیخ پڑی تھی۔

''ہانی......'' مارے تذلیل کے وہ رونا بھول

گئی اور چہرہ ضبط کے مارے لہو رنگ ہو رہا تھا۔
''چلاؤ مت، یہی حقیقت ہے' وہ شوہر ہے تمہارا، تم پر جائز حقوق محفوظ رکھتا ہے۔ زبردستی کرنے کا بھی اختیار ہے۔ مگر تمہاری مرضی کا پاس رکھا اور تم خود کو نہ جانے کیا توپ سمجھنے لگیں، تم جو اونچا بہت اونچا ہواؤں میں اڑتی رہی ہو نہ تو صرف زونیر بھائی کی ڈھیل کی وجہ سے ورنہ وہ تمہارے پَر کاٹ سکتے تھے۔ اور تمہیں اتنا غصہ آ کس بات پر رہا ہے۔
ایسا کیا غلط کہا میں نے، شوہر کے حقوق ادا کرنے کے قابل ہوتیں تو ادا کرتیں، کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھی نہ رہتیں۔'' وہ مزید تلخ اور بدلحاظ ہوئی تھی کیونکہ وہ لیلیٰ کو جانتی تھی اور مزید جان گئی تھی کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلنے والا۔
''ہانی صاحبہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کروں یا چڑیا کی طرح، تمہیں میری تذلیل کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔'' اُس کا تنفس بہت بڑھ گیا تھا۔
''اور تمہیں ہر ایک کی تذلیل کرنے کا پورا اختیار حاصل ہے یہ زونیر بھائی کی توہین نہیں ہے کہ وہ اپنے گھر میں اپنی بیوی کے ساتھ نامحرم کی طرح رہتے ہیں۔ بیوی نے اتنا اختیار بھی نہیں دیا کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہی کر لیں، اس کے لیے بھی ملازموں کی مدد لینے پر مجبور ہیں، وہ ملازموں کے سامنے کتنی سبکی محسوس کرتے ہوں گے جب وہ اُن کو جا کر کہتی ہوگی کہ بیگم صاحبہ کو میکے لے جائیں' وہ صبح و شام کتنی ذلت سے گزرتے ہوں گے۔ جب تم اُن کے سامنے بیٹھے ہونے کے باوجود ملازمہ کو یہ کہتی ہوگی کہ ''اپنے صاحب سے کہہ دو مجھے میکے جانا ہے شاپنگ پر جانا ہے۔'' اُن کی یہ ذلت اُس وقت کتنی بڑھ جاتی ہوگی جب وہ بیوی کے بنا ہی ایک الگ کمرے میں جاتے ہوں گے، تم اپنے لیے چند ذلت آمیز الفاظ برداشت نہ کر سکیں اور وہ مرد ہو کر اتنی ذلت سے گزرتے رہے، تم نے تو اپنا انتقام لے لیا، خود ہی متاثر ہوئی تھی نہ تمہاری تو تم نے اُن کی میں ہی کچل ڈالی، مگر وہ انتقام لینے پر آئے تو سر چھپانے کو چار دیواری بھی میسر نہ ہوگی۔
سوچو لیلیٰ جب تم کمزور ہو کر اتنا بڑھ گئیں تو وہ تو پھر طاقت رکھتے ہیں، مگر فرق صرف اتنا ہے کہ تم کمزور ہو کر بھی بدلحاظ و بے مروت تھیں، اور وہ طاقت رکھتے ہوئے بھی یہ سب نہ کر سکے۔ انسانیت تم کو چھو کر نہیں گزری اور وہ انسانیت' جذبوں اور رشتوں کی بقاء کی جنگ خود کو ذلیل کر کے بھی لڑتے رہے۔ ظلم تمہارے ساتھ نہیں اُن کے ساتھ ہوا ہے۔
قابلِ رحم تم نہیں ہو کیونکہ تم عورت ہو ازل سے بے بس، عورت رشتوں کے لیے عزت کی حفاظت کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دیتی ہے اور تم نے نکاح نامے پر سائن اپنی عزت کے لیے کیے تھے، کسی پر احسان نہیں کیا تھا، مگر آج تم پور پور ملک زونیر عباسی کے احسانوں تلے دبی ہو کہ اُن کے اعلیٰ کردار' اور اعلیٰ سوچ نے اُن کے قد کو بہت بڑا بنا دیا ہے اور تم اُن کے سامنے بہت بونی ہو گئی ہو اور بہت نیچے سے آسمان کی بلندی محسوس تو کیا دیکھی بھی نہیں جا سکتی۔
تم زمین ہو اور وہ آسمان تم قابلِ رحم نہیں ہو، مگر وہ قابلِ فخر قابلِ تعریف ہیں۔'' ہانی کی سانس پھولنے لگی تو وہ اُس کے سامنے سے اُٹھ گئی تھی مگر اُس کی سماعتوں اور دل و دماغ میں ہانی کی آواز کی بازگشت گونجے جا رہی تھی اور وہ اس بازگشت سے ساری عمر پیچھا نہ چھڑا سکے گی۔

اُس کی ہچکیاں اور سسکیاں کمرے میں گونجنے لگیں۔

☆......☆......☆

بڑے ملک زمینوں کا حساب کتاب لینے کے لیے نکل رہے تھے جب انہوں نے زونیر کی گاڑی پورچ میں کھڑی دیکھی۔ وحید تیزی سے بڑے ملک کی جانب بڑھا۔

''سلام بڑے ملک۔'' وحید نے انہیں سلام کیا۔

''تم یہاں کس کی اجازت سے آئے ہو؟'' سلام کا جواب دیے بغیر کچھ حیرت اور کچھ غصے سے اس سے پوچھا۔

''بڑے ملک وہ چھوٹی بی بی نے کہا کہ انہیں حویلی جانا ہے۔'' تب اُن کی توجہ گاڑی سے اترتی عورت کی جانب مبذول ہوگئی۔ جسے وہ پہچان نہیں سکے تھے کہ اُس نے بڑی سی سرخ چادر سے نہ صرف پورے وجود کو بلکہ چہرے کو بھی کور کیا ہوا تھا۔ وہ دھیمی سی چال چلتی اُن سے کچھ فاصلے پر آن رکی۔

''السلام علیکم! بڑے لالہ۔'' وہ بری طرح چونکے اور اُسے دیکھا آواز کے بعد آنکھیں، خوشگوار احساس میں گھر گئے۔

''بھرجائی اطلاع تو دیتیں، خیر اندر چلو، اندر چل کر بات کرتے ہیں۔'' وہ حیران حیران سے ہی بولے اور اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ اُس کی چال میں لڑکھڑاہٹ سی تھی۔

حویلی والے اُسے دیکھ کر متحیر ہوئے تھے اور اُس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھرگئی۔ نم لہجے میں اُس نے سب کو سلام کیا تھا۔ اُس کی کیفیت کچھ نہ کچھ سمجھتے ہوئے انہوں نے ملازمہ کو پانی

لا نے بھیجا اور اُسے بیٹھنے کو کہا۔
"زونیر کی دلہن تم یوں اچانک بغیر کسی اطلاع کے چلی آئیں اور یہ زونی کہاں ہے، گیا تو لاڑکانہ کا کہہ کر تھا، لینے بیوی کو گیا ہوا تھا۔" بی بی شاہ تاج اُس کی خاموشی اور شرمندگی محسوس کرتے ہوئے بولی تھیں۔
"آجائے ذرا کان کھینچتی ہوں اُس کے۔" آگے بڑھ کر اُس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا تو اُس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔
وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ سب ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔
"مم! مجھے معاف کر دیں، آئی ایم سوری۔" وہ ہچکیوں کے درمیان بولی۔ اور اُن سب نے اپنے ظرف کو بڑا کرنا ہی تھا کہ یہ اُن کے بیٹے کی التجا بھی تھی اور وہ لوگ بیٹے کی محبت میں مجبور بھی تھے۔
"میں آپ سب سے بے حد شرمندہ ہوں، میں نے بہت مس بی ہیو کیا۔"
"بھرجائی، گزری باتیں بھول جاؤ، ہم سب نے تمہیں دل سے معاف کر دیا ہے، ہم تو صرف تمہاری واپسی کے منتظر تھے کہ کب ہماری حویلی، ہمارے زونی کی دلہن کے وجود سے آشنا ہوگی۔" انہوں نے آگے بڑھ کر اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کچھ کہنے ہی نہیں دیا۔
"آئی ایم سوری۔ میں نے آپ سے بہت بدتمیزی کی۔" رونے میں اضافہ ہونے لگا۔
"غلطی میری بھی تو تھی نہ اس لیے کہہ رہا ہوں گزری باتیں بھول جاؤ، سفر سے آئی ہو تھک گئی ہوگی پہلے آرام کر لو پھر بات کریں گے۔" اُسے مزید کچھ کہنے کا موقع نہ دیا اور بیوی کو کہا کہ اُسے کمرے میں چھوڑ آئے۔
"میں ابے کو بتا دیتا ہوں جا کر، آپ بھرجائی کو دیکھ لو جا کر کسی چیز کی ضرورت ہوگی۔" وہ ماں سے مخاطب ہوئے۔
"فکر نہ کرو بیٹا' جب اپنے زونی کے لیے ظرف بڑا کرنے کا سوچ ہی لیا ہے تو اُس کا خیال رکھیں گے۔" مگر یہ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ یہ اچانک آ کیسے گئی اور یہ زونی......"
"زونی، لاڑکانہ ہی گیا ہوا ہے۔ یہ کیسے آئی میں بھی نہیں جانتا۔ مگر پتا چل جائے گا پریشان نہ ہوں، اب سب کچھ ٹھیک ہی ہوگا۔" وہ اُس کے لوٹ آنے پر مطمئن تھے۔
"مم...... میں نے آپ سے بات کرنی ہے۔" کھانے پر سب نے ایسے ہی بی ہیو کیا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور وہ بہت خاص ہو کہ اُسے کافی خاص پروٹوکول دیا گیا۔ کھانے سے فراغت کے بعد اُس نے جاتے ہوئے اپنے جیٹھ کا نام لیے بغیر اٹک اٹک کر کہا لالہ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ وہ رُک کر اُس کی طرف پلٹے۔ گلابی چہرہ، سرخ ناک، آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ سر پر سلیقے سے دوپٹا جمائے وہ انہیں بہت اچھی لگی تھی کہ اُسے دیکھتے ہی انہوں نے بھائی کی پسند کو اوکے کر دیا تھا۔
"بات تو مجھے بھی تم سے کرنی تھی۔" اُس کی جھجک مٹانے کو بولے تھے اور اُسے کمرے میں جانے کا کہا اور خود نے فون کر کے کسی کو کچھ ہدایات دیں پھر اُس کے کمرے کی جانب بڑھے۔
"دیکھو بھرجائی، جو کچھ ہوا، ہونا تو نہیں چاہیے تھا مگر اب وہ سب لوٹایا نہیں جا سکتا، اس لیے بھول جانا درگزر کر دینا ہی عقلمندی ہوگی۔" اس کی جھجک محسوس کر کے انہوں نے خود ہی بات

کا آغاز کیا تھا۔
''اور تم نے آنے سے قبل زونی کو کیوں نہیں بتایا؟ بتا دیتیں تو وہ خود تمہیں یہاں لے کر آتا......'' انہوں نے نرمی سے کہا۔
''وہ...... وہ تو چاہتے تھے۔ مگر......'' وہ بات مکمل نہ کر سکی۔ لیلیٰ کو اپنی غلطی کا احساس کافی عرصے سے ہو رہا تھا اور جب موقع ملا تھا اپنی غلطیاں سدھارنے کا تو اپنی کم عقلی سے کھو دیا۔
''ہانی کی باتوں نے اُسے اندر تک جھنجوڑ ڈالا تھا، وہ پچھتا تو رہی تھی مگر فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔
اسی ٹینشن نے اُسے بیمار کر دیا ہانی نے اس سے بات کرنا تک چھوڑ دی تھی، وہ خود سے اور اپنوں کے رویوں سے لڑ رہی تھی تبھی زونیر نے فون کر کے کہا تھا کہ ابے بیمار ہیں، وہ کچھ دنوں کے لیے حویلی آ جائے، کسی رشتے کے نہ سہی، انسانیت کے ناطے، مگر وہ الجھے ذہن سے کوئی فیصلہ نہیں کر سکی تھی۔ اور جب اس نے فیصلہ کر لیا تب مطمئن ہوگئی اور حویلی چلی آئی۔ بڑے لالہ کے پوچھنے پر جیسے وہ ماضی میں چلی گئی مگر پھر جلدی سے اپنے آپ کو سنبھال کر انہیں مخاطب کیا۔
''بڑے لالہ میں نے زونیر کو کال کی تھی مگر انہوں نے میری کال ریسیو نہیں کی، رفیہ سے فون کروایا تو انہوں نے سیل ہی آف کر دیا، تب میں نے سوچا کہ اگر غلطی آپ سب سے ہوئی تو کم غلطیاں تو میں نے بھی نہیں کیں۔ اور جب آپ لوگ جھک سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں، بس اس لیے میں خود ہی چلی آئی۔ میں بہت بری ہوں، میں نے آپ لوگوں کے ساتھ بہت برا کیا ہے۔ میں معافی ہی قابل نہ تھی کہاں آپ سب نے مجھے اتنی عزت دی۔'' اُس کی ہچکیاں بندھ گئی ہیں۔

''تم کس قابل ہو یہ تم خود نہیں جانتی ہو بھرجائی، تم ملک زونیر عباسی کی محبت ہو، اور ہم زونی کی محبت اور عزت کے لیے اپنے اصولوں کے خلاف جا سکتے ہیں تو یہ اعلیٰ ظرفی تو کچھ بھی نہیں ہے کہ زونی کی خوشی کے لیے سات خون معاف کر سکتے ہیں، تم نے جو کیا اُس میں کہیں نہ کہیں حق بجانب ہو، مگر بات یہی ہے کہ زونی بے خطا اُس سب میں پستا رہا ہے۔' غلط فعل ہمارا تھا، سزا زیادہ اُس نے جھیلی ہے۔
مگر اب تم سے یہی کہیں گے بھرجائی کہ تم نے اب اپنی ہر خطا کا ازالہ کرنا ہے، جتنی بے رخی اور نفرت دکھائی ہے اُس سے کہیں زیادہ محبت اور وفائیں نبھانی ہوں گی۔ ہمارے زونی کو اُس کی خوشیاں اور لبوں کی مسکراہٹ لوٹانی ہوگی کہ ہم اُس کو مسکراتے دیکھنے کو ترس گئے ہیں۔ ابھی صرف اس حویلی نے تمہیں قبول کیا ہے، جس لمحے اس حویلی کے در و دیوار ایک بار پھر زونی کی ہنسی سے روشناس ہوں گے تمہیں چاہت سے اپنا لیں گے۔
اور امید ہے ہمیں بھرجائی کہ تم ہمیں مایوس نہیں کرو گی۔ زونی کے ہر دکھ کا تم ازالہ اپنی چاہت سے کر دو گی۔ میں جانتا ہوں کہ اُس نے پرسوں تمہیں فون کیا تھا اور تم سے بات کرنے کے بعد جتنا دکھی میں نے اُسے محسوس کیا تھا اتنا میں نے اُسے تکلیف میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے بہت مان سے تم سے کچھ کہا تھا مگر تم اُس کی چاہت و مان کو سمجھ نہ سکیں۔ مگر اب تم نے اُس کی چاہتوں کو اُس کی نیک نیتی کو سمجھنا ہوگا۔'' وہ اپنے بھائی کو بہت اچھے سے جانتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے بھائی کا تجزیہ کرتے ہوئے تمام باتیں کہی تھیں۔

''وہ...... وہ مجھ سے بہت ناراض ہوں گے۔'' وہ ہکلائی۔

''ناراض ہوگیا ہے تو منالو۔'' اور چاہو تو میں فون کرکے بلالیتا ہوں بحث میں پڑنے کے بجائے سادہ ساحل پیش کیا تھا۔

''بڑے لالہ میں چاہتی ہوں آپ انہیں ابھی نہ بلائیں کہ میں یہاں سیٹ ہونا چاہتی ہوں۔''

''اوکے! اس سے اچھی کیا بات ہوگی۔'' وہ اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے کمرے سے نکل گئے تھے۔ اور پھر جیسے وقت کی دھول میں اَٹ جانے والی اُم لیلیٰ کے گرد لپٹی دھول اک ہوا کے جھونکے سے اڑگئی تھی اور پہلے والی اُم لیلیٰ لوٹ آئی۔ وہ حویلی میں ایسے رہنے لگی جیسے یہاں برسوں سے رہتی ہو، وہ بی بی شاہ تاج سے کھانا بنانا بھی سیکھ رہی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد زونیر نے حویلی میں اچانک قدم رکھا تھا۔ بیٹھک میں قدم رکھتے ہی سماعتیں چونک اٹھی تھیں۔

''بڑے لالہ میں نے کہہ دیا کہ آپ شادی کی سالگرہ منارہے ہیں تو بس منارہے ہیں۔'' نگاہ اٹھی تو یقین کرنا مشکل ہوگیا کہ بی بی شاہ تاج کے برابر صوفے پر بیٹھی اُم لیلیٰ ہی ہے۔

''مجھے یہ سب کبھی پسند نہیں، زونی ہر سال یونہی میرے پیچھے پڑتا ہے، بٹ ریئلی مجھے یہ سب نہیں پسند۔''

''آپ کو نہیں پسند لیکن مجھے پسند ہے۔ اور آپ وہی کریں گے جو میں کہوں گی ورنہ بڑے لالہ آپ سے ناراضگی پکی۔'' وہ بہت حق اور مان سے بولی تھی اور اُسے اپنی ہی سماعتوں اور بصارت پر شک ہونے لگا۔

''اچھا بابا! تم جیتیں اور میں ہارا، بے بے آپ کی یہ لاڈلی آپ کے لاڈلے زونی کی طرح جس بات کے پیچھے پڑجائے منوا کر ہی دم لیتی ہے۔'' انہوں نے مصنوعی خفگی سے گھورا اور وہ بے ساختہ ہنستی چلی گئی تھی۔ کانچ سی کھنکتی شفاف ہنسی، اور ہنستے ہوئے اُس کی نگاہ سامنے اٹھی۔ ہنسی بت بنے کھڑے ملک زونیر عباسی کو دیکھ کر تھمی اور وہ ایک دم ہی اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ بڑے لالہ اور بی بی شاہ تاج زونیر کو دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھیں۔ اور وہ اپنی جگہ سے اٹھتے بھائی تک آئے تھے۔ کاندھے پر ہاتھ رکھا تھا اور وہ چونک اٹھا، نگاہ اُس کے جگمگاتے چہرے سے ہٹالی۔

''کیسا ہے میرا بچہ؟'' بغل گیر ہوتے ہوئے شفقت سے بولے۔

''ٹھیک ہوں، تھک گیا ہوں، آرام کروں گا۔'' اُن سے الگ ہوا اور سلام دعا کے بغیر کسی کو بھی دیکھے بناء کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

''نن، نہیں، بے بے! میں نہیں جارہی، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' بی بی شاہ تاج نے اُسے کمرے میں جانے کو کہا تھا تو وہ لمحے میں انکاری ہوگئی تھی۔ زونی کو اپنے کمرے میں کافی تبدیلی محسوس ہوئی۔ گرے کلر اسکیم اب گلابی میں تبدیل ہوگئی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر اُم لیلیٰ کی مسکراتی ہوئی تصویر رکھی تھی، بیڈ کی داہنی طرف تکیے کے اوپر دھانی آنچل اور تکیے کے نیچے سے جھانکتیں رنگ برنگی کانچ کی چوڑیاں، ڈریسنگ ٹیبل پر سجی کاسمیٹکس کی اشیا بہت کچھ تبدیل ہوگیا تھا، اُس نے ٹھنڈی سانس لی اور واش روم میں گھس گیا تھا۔ فریش ہونے کے بعد بھی ذہن میں اُمڈتے سوال اپنی جگہ پر تھے کہ وہ یہاں کب کیسے آئی؟ اور سب کے درمیان اتنی بے تکلفی واپنائیت سے بیٹھنا، یہ سب کیسے ہوگیا؟ اور گھر والوں نے اُسے اُس کے

آنے کا بتایا کیوں نہیں؟ غصہ وانا میں اُس نے رابطہ بھی نہیں کیا۔ وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا کہ اُس کی تصویر اور سامان سے صاف لگ رہا تھا کہ اُس کا قیام یہیں ہے، اور جب یہیں قیام ہے تو وہ اب تک آئی کیوں نہیں؟ اُسے اُس کے پیچھے آنا ہی چاہیے تھا۔ اس سوچ نے ساری تلخیوں کو تازہ کر دیا تھا۔ اسی طرح غصہ سے کھولتا وہ کمرے سے نکلا۔

''نوراں ...... جمیلہ...... رفیہ......'' ایک ہی سانس میں اُس نے ریلنگ پر جھکے ہوئے حویلی کے ملازموں کو آواز دی تھی۔

''کہاں مری ہوئی تھیں تم سب؟ کچھ ہوش ہے کب سے آیا ہوا ہوں، کچھ چائے پانی کا ہی پوچھ لو۔'' اُسے غصہ کم آتا تھا اور آتا تھا تو باپ اور بڑے بھائی کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا تھا۔

''وہ، وہ چھوٹے ملک۔''

''بس! بک بک نہ کرو اور میرے لیے اسٹرانگ چائے بنا کر لاؤ۔'' وہ کہہ کر کمرے میں غائب ہو گیا تھا اور اُس کی آواز حویلی میں گونج رہی تھی تو ایسا ممکن نہ تھا کہ کچن میں موجود اُم لیلیٰ تک نہ پہنچتی اُس کے ڈر میں اضافہ سا ہو گیا تھا کہ اُس نے بہت سوفٹ نیچر ملک زونیر عباسی کو دیکھا تھا۔

ملازمہ چائے دینے آئی تو وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''چھوٹی بی بی بڑے لالہ کے ساتھ شہر سے آئی ہیں۔''

''نہیں، چھوٹے ملک، بی بی تو اکیلے ہی آئی تھیں۔''

''کیا، اکیلے؟ مگر کب؟'' وہ حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

''جب آپ لاڑکانہ گئے ہوئے تھے۔''

''ٹھیک ہے تم جاؤ۔'' کپ لے لیا تھا مگر وہ حیران اتنا تھا کہ چائے پینا بھی بھول گیا اور جیسے ہی خیال آیا اُس نے لبوں سے کپ لگا لیا مگر ٹھنڈی بدمزہ چائے اُس کے منہ کا ذائقہ خراب کر گئی اور اُس نے یہ کوفت بھی باہر نکل کر ملازموں پر ہی نکالی۔

''اتنی بدمزہ چائے، پینے کا عادی نہیں ہوں میں۔'' وہ اُسے اتنے غصے میں دوسری یا تیسری ہی دفعہ دیکھ رہے ہوں گے۔ تب اُس کی دھاڑ بھی سنی اور وہ واپس کچن میں کانپتے پیروں سے پلٹ گئی۔

''یہ تو کتنے غصہ میں ہیں، اور میں اُن کے سامنے جاؤں گی تو یہ مجھے بھی ضرور اپنے عتاب کا نشانہ بنائیں گے کہ میں اُن کے ساتھ کتنا برا بھی کر چکی ہوں، یہ بدلے میں مجھے نہ جانے کیا کہیں؟ مجھے نہ جانے کیا سزا دیں گے؟'' وہ فریج سے ٹیک لگائے سوچ رہی تھی۔

''چائے دوبارہ بن جائے گی۔'' بھاوج نے رسان سے کہا۔

''مجھے نہیں پینی کوئی چائے وائے۔'' وہ فاصلے پر ہونے کی وجہ سے بھائی کے لبوں پر مچلتی مسکراہٹ دیکھ نہ سکا تھا اور خفگی سے کہتا مڑا ہی تھا کہ انہوں نے قہقہہ روکتے ہوئے اُسے آواز دی۔

''چائے نہیں پینی نہ پیو، آ کر کھانا کھا لو مجھے سخت بھوک لگی ہے۔''

''لیکن مجھے بھوک نہیں ہے۔'' خفگی ہنوز برقرار تھی۔

''جلدی سے آؤ میں ڈائننگ روم میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' مسکرا کر کہا پلٹ گئے اُسے نہ چار نیچے آنا پڑا تھا اُس کے سرخ چہرے کو دیکھ کر

انہیں ہنسی آنے لگی تھی۔ مگر کنٹرول کر گئے۔
''جمیلہ، جلدی کھانا لے آؤ۔ ہمارے صاحب بہادر آج بڑے غصے میں ہیں۔'' کھانا ٹیبل پر لگاتی ہوئی ملازمہ سے کہا اور وہ بھائی کو خفگی سے دیکھنے لگا تھا مگر بولا کچھ نہ تھا۔
''آنے سے پہلے اطلاع کر دیتے تو گھر والے کھانا تو نہ کھاتے، میں ڈیرے پر گیا ہوا تھا اس لیے کھانا نہیں کھایا تو تمہارا ساتھ دے بھی رہا ہوں، ورنہ جانتے ہو میں بار بار کھانے کا عادی بالکل نہیں ہوں۔'' سالن نکالتے ہوئے بولے تھے اور اُس نے بڑی خاموشی سے پلیٹ میں چاول نکال لیے۔
''اتنے خاموش کیوں ہو، سب خیر تو ہے؟'' اُس کی خاموشی بری طرح کھل رہی تھی۔
''کسی سے جھگڑا تو کر کے نہیں آئے؟''
''پلیز بڑے لالہ اس وقت میرا کسی سے بھی بات کرنے کا موڈ نہیں ہے۔'' اُسے سخت بھوک لگی تھی کہ بارہ بجے کے قریب ہلکا پھلکا ناشتہ کیا تھا اور اب ساڑھے 8 ہو رہے تھے۔ مگر اُس نے تھوڑے سے چاول کھا کر پلیٹ کھسکا دی اور پانی پینے لگا۔
''کسی، میری جان، میں کسی کب سے ہو گیا؟''
''جب سے آپ نے مجھے اہمیت دینی چھوڑ دی ہے۔ مجھ سے باتیں چھپانا شروع کر دیں ہیں۔'' وہ تپے تپے لہجے میں کہتا کرسی کھسکا کر اُٹھ گیا۔
''تُو میرے لیے خود سے بھی زیادہ اہم تھا ہے اور رہے گا، بیٹھ جا اور کھانا کھا میں جانتا ہوں تُو نے نکلتے ہوئے تھوڑا بہت کھایا ہوگا اور دوران سفر محض پانی پر ہی گزارا کیا ہوگا اس لیے تجھے اس وقت سخت بھوک لگی ہے اس لیے شاباش کھانا کھالے، کوئی بات بری لگی ہے تو کھانے کے بعد کہہ دینا۔'' ہاتھ پکڑ کر رکھا تھا اور وہ بڑی فرمانبرداری سے بیٹھ گیا تھا اور خود کو کمپوز کر کے کھانا کھانے لگا۔
''جمیلہ دو کپ اسٹرانگ سی چائے لے آؤ۔'' ہاتھ نیپکن سے صاف کرتے ہوئے بولے اچانک چیخ سنائی دی۔ محویت سے کھانا کھاتا ملک زونیر عباسی اور وہ چونک اٹھے۔ وہ کرسی کھسکا کر زندگی میں پہلی دفعہ باورچی خانے میں چلے آئے۔
''کیا ہوا ہے؟'' سامنے لیلیٰ چہرہ چھپائے کھڑی تھی گرم گرم پانی اُس کے پیر کو بری طرح جھلسا گیا تھا۔ ملازمہ اسے سہارا دے کر باہر لاؤنج میں لے آئی اور صوفے پر بٹھا دیا۔
''جمیلہ جاؤ فرسٹ ایڈ بکس لے آؤ اوپر والے کمرے میں ہے زونی نے اُس کے پیلے پڑے پیر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ بڑے لالہ نے ڈاکٹرنی کو بھی بلوا لیا تھا۔
''اُم لیلیٰ کے پیر پر پانی کیسے گر گیا۔ تم کہاں مری ہوئی تھیں۔'' زونی نے جمیلہ کو بری طرح لتاڑا تبھی لیلیٰ نے پلکیں اُٹھا کر اُسے دیکھا دونوں کی نگاہیں چار ہوئی تھیں کہ وہ نظر چرا گئی۔
''جمیلہ دیکھو جا کر یہ ڈاکٹر صاحبہ ابھی تک کیوں نہیں آئیں؟'' بڑے لالہ کے کہنے کی دیر تھی ملازمہ وہاں سے نکل گئی تھی۔ اور وہ بھی کسی کو فون ملاتے بیٹھک کی طرف بڑھ گئے۔
زونی اُسے دیکھنے لگا تھا جو آنسو بہاتی، ضبط کی منزلیں طے کرتی لب کچل رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹر صاحبہ چلی آئیں۔
''او گاڈ یہ تو کافی زیادہ جل گیا ہے۔'' ڈاکٹر

فردوس دیکھتے ہی بولی تھیں۔ پیر تھا ماہی تھا کہ ضبط کرتے کرتے بھی اُس کی چیخیں نکل گئیں۔ گلابی نرم ملائم جلد کافی متاثر ہوئی تھی۔

''ٹیک اٹ ایزی۔'' کہہ کر نرمی سے کریم لگانے لگی تھیں کہ وہ زونی کا ہاتھ تھام گئی۔

''میں نے نہیں لگوانی تکلیف سے میری جان نکل جائے گی۔'' وہ ہچکیوں سے روتے ہوئے بولی تھی۔ اُس کے آنسو ملک زونیر کے ہاتھ کی پشت پر تیزی سے گرتے رہے اُس کے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔

''یہ پین کلر لے لو، اُم لیلیٰ کچھ دیر میں جلن بھی کم ہو جائے گی اور درد میں بھی آرام آجائے گا۔'' زونی نے گولیاں اُس کو دیتے ہوئے کہا۔ لیلیٰ نے بڑی خاموشی سے گولیاں پانی کے ساتھ پھانک لی تھیں۔

''کب تک یہیں بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے؟'' اُس نے اُسے دیکھے بغیر کہا تھا اور وہ لب کچلنے لگی تھی۔

''اٹھو اور کمرے میں جاؤ۔ میں مردان خانے میں جا رہا ہوں۔'' وہ کہہ کر جانے کے ارادے سے مڑا تھا کہ ''سنیں۔'' تھا ضرور مگر پلٹا نہیں اور اُس نے اُس کی چوڑی پشت کو دیکھا اور بولی۔

''مم، میرے پاؤں میں بہت درد ہو رہا ہے۔ میں چل نہیں پاؤں گی۔'' اور اُس نے مڑ کر اُسے دیکھا بھیگا سرخی مائل چہرہ سبز دوپٹے کے ہالے میں بڑا ہی دلکش لگ رہا تھا۔ ماتھے پر جھولتی لٹیں وہ بے اختیار سا اُسے دیکھے گیا اور اُس کی نگاہوں کی حدت سے اُس کی گھنیری بھیگی پلکیں لرزنے لگیں، عارضوں پر سرخی گہری ہونے لگی اور اُس نے گڑبڑاتے ہوئے جھولتی لٹیں ہٹانے کو ہاتھ اونچا کیا تھا اور سونے کی چوڑیاں بج اٹھیں اور اُس کی محویت ٹوٹ گئی۔

''میں جمیلہ سے کہہ دیتا ہوں وہ تمہیں کمرے تک لے جائے گی۔'' کہہ کر ملازمہ کو آواز دینے ہی لگا تھا کہ اُس کی فرمائش پر اُسے دیکھنے لگا کہاں امید تھی کہ وہ ایسا کچھ کہے گی مگر وہ اپنی بات کہنے کے بعد نگاہ جھکائے لب کچل رہی تھی۔ اور وہ اُسے محویت سے تک رہا تھا کہ دوبارہ کانوں میں اُس کی کچھ قبل کہی بات گونجی تھی۔

''آ، آپ بھی تو مجھے کمرے تک چھوڑ سکتے ہیں۔'' اُس نے نظر اُٹھا کر گم صم کھڑے ملک زونیر عباسی کو دیکھا اور اٹھی تو تکلیف سے بلبلا اٹھی۔ لب پر لب جما کر سسکی روکی اور گرنے سے بچنے کو ٹیبل پکڑ لی، آنسو ٹیبل کی شفاف سطح پر ٹپ ٹپ گرنے لگے، کھڑا تو ہوا نہیں جا رہا تھا، وجود دھیرے دھیرے لرزنے لگا تھا اور اُس نے ایک نظر اُسے دیکھا اور آگے بڑھ کر اُسے بانہوں میں اُٹھا لیا۔ اُس کو ایسی کوئی امید نہ تھی اُس نے آنکھیں سختی سے میچ لیں، اور وہ سیڑھیاں چڑھتا اپنے کمرے میں آگیا اور احتیاط سے اُسے بیڈ پر لٹا دیا، سیدھے ہوتے ہوئے دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں۔ اُس نے حیا سے نظریں چرا لیں۔

وہ سیدھا ہو گیا اور تیزی سے باہر کی طرف بڑھا ہی تھا اور اُس نے اُس سے بھی زیادہ تیزی دکھاتے ہوئے اُسے پکارا۔

''زونیر......'' مگر وہ سُنی اَن سُنی کرتا کمرے سے نکل گیا۔ اور وہ نادم نادم سی تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ پین کلر کا اثر تھا یا شوہر کا سامنا کرنے کے مرحلے سے نجات بہرحال جلد ہی وہ نیند کی وادی میں اُتر گئی۔

☆......☆......☆

''زونی......'' وہ مگن سا بیٹھا سگریٹ پھونک

رہا تھا۔ آواز پر چونکا اور بڑے لالہ کو دیکھ کر اُس نے گھبرا کر سگریٹ انگلیوں کی گرفت سے آزاد کی اور چھپانے کو پاؤں رکھ دیا۔

''زونی...... ہوش میں ہو۔'' انہوں نے سگریٹ پیتے بھی دیکھا تھا اور پھینکتے بھی۔

''دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا۔ یہ کیا حرکتیں کرتے رہتے ہو۔ صحت خراب کرلی ہے اپنی۔''

''بڑے لالہ' آپ ابھی تک سوئے نہیں؟''

''سوئے تو تم بھی نہیں ہو۔'' اُس کے بات بدلنے پر وہ چڑے ضرور لیکن اپنی بات دہرانے کی بجائے اُس کے سوال کے جواب میں سوال کر بیٹھے تھے۔

''نیند نہیں آرہی تھی۔'' وہ تھکے تھکے انداز میں بولا تھا۔

''زونی، گزری اذیتوں کے مداوے کا وقت ہے میری جان! اور جب تم نے ہر اذیت حوصلے سے برداشت کرلی ہے تو بس اُسے بھول بھی جاؤ۔''

''حوصلے سے برداشت نہیں کی بڑے لالہ، کیسے کیسے میرا حوصلہ نہیں ٹوٹا، مگر میں خود کو جوڑتا رہا، ایک زخم کھا کر خود کو نیا زخم کھانے کے لیے تیار کرتا رہا۔ مگر میں اُس دن ٹوٹ گیا جب میری ہر وفا کے جواب میں بھی مجھے صرف بے رخی ملی، اُس لمحے میں نے اپنی شکست تسلیم کرلی تھی اور میں شکست تسلیم کرچکا ہوں تو مداوا کس بات کا؟'' وہ کافی تکلیف میں تھا۔

''وہ نادانی اور جذباتیت میں غلط کرتی رہی، مگر اُسے احساس تھا جبھی تو وہ لوٹ آئی ہے۔'' بڑے لالہ نے اُس کی دلی کیفیت سمجھتے ہوئے رسانیت سے کہا۔

''لیکن میں جو اُس کے لوٹنے کا منتظر تھا وہ آس کب کی مرچکی اُس کے لوٹنے سے مجھے کوئی خوشی نہیں ہورہی، میری اذیتوں کے منہ ہرے ہوگئے ہیں۔ اُس سے کہیں کہ وہ مجبوری کے رشتے نہ بنائے اور واپس لوٹ جائے، میں اپنی مجبوریوں کا طوق اپنے گلے سے نکال کر اُسے مجبوری کے رشتے سے آزاد کردوں گا۔'' زونی کی آنکھوں میں مرچیں سی بھرنے لگی تھیں۔

''ٹھیک ہے جو تم چاہو، کوئی تمہیں روکے گا بھی نہیں مگر یہ یاد رکھنا کہ وہ مجبوری میں نہیں لوٹی کہ مجبوری کے ہی رشتے نباہنے ہوتے تو وہ اتنی دیر نہ کرتی۔ وہ تمہاری وفا سے تمہاری اچھائی سے کہیں نہ کہیں متاثر ہوکر لوٹی ہے اور وہ جب اپنی نفرت تمہاری محبت پر قربان کرسکتی ہے تو تم ایک لمحے کی مایوسی اپنی محبت کی بقا کے لیے قربان نہیں کرسکتے؟ کل بھی تمہیں وہ عزیز تھی آج بھی ہے اور جب محبت کل بھی زندہ تھی آج بھی ہے تو یہ فرار کیوں؟ یا میں یہ سمجھوں کہ تم بھی وہی ایک عام سے مرد ہو جو عورت کی غلطی معاف نہیں کرسکتا۔''

''بڑے لالہ معاف کرنے کی نوبت تو تب آئے نہ جب میں اُم لیلیٰ کو غلط مانوں۔ آپ نے ٹھیک کہا کہ کل بھی مجھے اُس سے محبت تھی آج بھی ہے، اور میری محبت اتنی تو اعلیٰ ظرف ہے کہ میں اپنے محبت کی خطاؤں کو درگزر کرکے اُسے دل و سے اپنالوں۔ مگر میں جانتا ہوں، اُس کو مجھ سے محبت نہیں ہے وہ اپنوں کے رویے سہہ نہیں پائی سخت بنتی رہی مگر رہی موم کی مانند نرم' اندر ہی اندر پگھلتی رہی، اپنوں کی بے رخی سے تنگ آکر یہاں لوٹ آئی۔ آپ سب میں گھل مل گئی۔ مگر اس سب میں یہ کہاں سے ثابت ہوتا ہے کہ اُسے مجھ سے محبت ہوگئی ہے؟''

''ہوئی نہیں ہے ہوجائے گی وہ لوٹ آئی ہے

تو اُسے جانے کو مت کہہ کہ اب گئی تو اُسے تو ہمیشہ کے لیے کھودے گا۔'' اور ہم تجھے کھونا نہیں چاہتے۔ دل سے ہر شک ہر اُلجھن نکال کر نئی زندگی شروع کر اور دیکھنا ایک دن ایسا آئے گا جب وہ تجھے تجھ سے زیادہ چاہے گی کہ محبت اپنی جگہ ایک نہ ایک دن بنا لیتی ہے۔ مجھے ہی دیکھ لے تیری بھرجائی سے نہ محبت تھی نہ شادی کرنا چاہتا تھا، لیکن بے بے کی قسم کے آگے ہار گیا۔ شروع میں تمہاری بھرجائی کی شکل بری لگتی تھی۔ سوچنے پر غصہ آتا تھا مگر پھر کیا ہوا، اُس نے اپنی وفا سے محبت جیت ہی لیا نا، تو تم بھی اُسے جیت لوگے کہ محبت کبھی بے مول نہیں ہوتی، اور جو لوگ محبت میں ناکام ہوجاتے ہیں۔ یا محبت نہیں پاتے اُن کی سوچ محبت کے خلاف ہوجاتی ہے بٹ میری جان محبت کو آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے اور جو محبت آزمائش پر کھری اترتی ہے دراصل وہی سچی محبت ہوتی ہے۔

''جاؤ زونی اب یہاں مت بیٹھے رہو اُٹھ کر کمرے میں جاؤ، فضول سی بچوں کی طرح حرکتیں کرتے رہتے ہو، اور ہاں آئندہ تمہیں میں سگریٹ پیتے نہ دیکھوں۔'' وہ قدرے ڈپٹ کر بولے تھے۔

''آئی ایم سوری بڑے لالہ.....'' وہ شرمندہ تھا۔

''اچھا' بس اُٹھو معاف کیا، اور جا کر بیوی کو مناؤ تم دونوں کا روٹھنا ہی ختم نہیں ہورہا اور یہاں ہم تمہاری اولاد کا منہ دیکھنے کو ترس رہے ہیں۔'' وہ بھائی کی بات پر چیں بہ چیں ہوکر رہ گیا۔

''اب عورتوں کی طرح شرمانے کی ضرورت نہیں ہے، تمہیں ہماری خوشی کا خیال کرنا ہوگا کہ اب ہم سے انتظار نہیں ہوتا۔'' وہ اُس کا کندھا تھپکتے مردان خانے سے نکل گئے تھے۔ اُسے سوچوں میں غلطاں یونہی بیٹھے بیٹھے کافی وقت گزر گیا تھا، وجود میں تھکن اُترنے لگی تو اُسے وقت گزرنے کا احساس ہوا رات کے ساڑھے بارہ ہوگئے تھے وہ چہرے پر ہاتھ پھیرتا اُٹھ کھڑا ہوا، آہستگی سے دروازہ وا کرتا کمرے میں داخل ہوا، نگاہ سوئی ہوئی اُم لیلیٰ پر پڑی۔ وہ اُس کی اس عادت سے بھی اتنے عرصے میں واقف ہوگیا تھا کہ ہاتھ میں چوڑیاں ہوتیں تو وہ چڑھاتی اور اتارتی رہا کرتی تھی اور اسی وجہ سے اکثر چوڑیاں اِدھر اُدھر نظر آجاتی تھیں۔ سونے سے قبل تمام جیولری اُتار دینے کی اُسے عادت ہے وہ ٹاپس پہن کر بھی نہیں سوسکتی، اُسے وہ چبھتے تھے۔ وہ اُس کی گلابی کلائی پر بے ارادہ ہی نگاہ جمائے ہوئے ہے احساس ہوتے ہی اُس نے آنکھیں موندلی لیلیٰ نے کروٹ لی، ہاتھ اُس کے سینے پر پھیل گیا اور آنکھ تکلیف سے کھل گئی اور اُس کو دیکھ کر وہ ایکدم اٹھ بیٹھی۔ وہ اُس کے گلابی چہرے کو تک رہا تھا تبھی لیلیٰ نے کروٹ لی اور اس کے لبوں سے ہلکی سی کراہ نکلی۔

''آر یو آل رائٹ؟ کیا بہت درد ہورہا ہے؟'' اُس نے محض اثبات میں گردن ہلادی۔

''ڈاکٹر کو بلالوں؟'' اٹھتے ہوئے فکرمندی سے بولا۔

''نہیں میں ٹھیک ہوں۔ تکلیف سے آنکھ کھل گئی تھی۔'' لیلیٰ نے دھیمے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

زونی نے اپنا تکیہ اور چادر اٹھائی تاکہ صوفے پر سوسکے تبھی لیلیٰ نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ زونیر نے حیرت سے پلٹ کر لیلیٰ کو دیکھا اس لمس کو تو وہ ترستا رہا اس قرب کے لیے تو وہ دیوانہ وار اُس کی

زیادتیاں سہتا رہا۔

''زونیر، آئی ایم سوری۔'' وہ رو پڑی۔

''سوری کی ضرورت نہیں ہے اُم لیلیٰ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم کاغذی رشتے کو اہمیت دینا چاہو گی تو میں تمہاری خوشی و مرضی کا احترام کروں گا۔ جب تک تم نے نہیں چاہا میں نے بھی اپنی مرضی تم پر نہیں تھوپی اور اب بھی تمہاری خوشی کا احترام کروں گا کہ میں نے یہ تم سے وعدہ کیا تھا۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''لیکن میں آپ سے معافی مانگنا چاہتی ہوں، میں نے آپ کے ساتھ بدتمیزی کی، آپ کو ہرٹ کرتی رہی ہوں، اس وقت میں بہت غصہ میں تھی، میں ہرٹ ہوئی تھی، میرے پندار کو ٹھیس پہنچی تھی۔ میں نے اپنی محبت کھوئی تھی۔ اس لیے میں انتقام اور غصہ کی آگ میں جلتی پاگل ہوگئی تھی۔ لیکن میں صرف اپنے بارے میں سوچتی رہی، مجھے اپنے ساتھ ہوئی ناانصافی یاد رہی، مگر یہ اندازہ ہی نہیں ہوا کہ میں آپ کے ساتھ کتنا غلط کررہی ہوں، مگر آپ نے میری ہر بدتمیزی اور لاتعلقی کو برداشت کیا، پلیز مجھے معاف کردیں کہ میں نے آپ کو سزا دینے کے لیے خود کو کم سزا نہیں دی ہے، اب آپ کی بے رخی برداشت نہیں کرپاؤں گی۔

''مجھ سے ماں جی، ہانی، بھیا، عباد سب ناراض ہوگئے ہیں آپ نے تو کہا تھا نہ کہ آپ مجھ سے ناراض نہیں ہوسکتے مجھے سوخون بھی معاف ہیں۔ تو مجھ سے ناراض نہ ہوں مجھے معاف کردیں۔ وہ اُس کے عین سامنے کھڑی سچائی سے بول رہی تھی اور اُس کے جلتے دل پر پھوار سی پڑنے لگی تھی۔ اُسے اُس کی ریاضت کا جیسے صلہ مل گیا تھا۔ ذہن کی ہر گرہ کھل گئی تھی اور اُس نے اُسے چپ کرانے کی کوشش نہ کی اُسے تمام باتوں میں صرف معاف کردیں کی گردان بری لگی تھی وگرنہ باقی باتیں اُسے ہلکا پھلکا کرگئی تھیں۔ اور وہ دل کی شدت سے جذباتی لہجے میں 'آئی لو یو' کہتی اُس کے چوڑے سینے میں سماگئی اور بلکنے لگی۔

''جانِ زونیر، تمہیں تو سوخون معاف ہیں، یہ زبانی کلامی نہ کہا تھا حقیقت ہی یہی ہے۔'' وہ اُس کے وجود کے گرد حصار باندھ گیا تھا۔

''آئی رئیلی لو یو۔'' اُس نے اُس کو خود میں سموئے کہا تھا اور اُس کے آنسو تھمنے لگے۔ بالآخر محبت نے نفرت کو شکست دے دی۔ زندگی بہت مختصر ہوتی ہے اور سچی خوشیاں سیدھے راستے پر چل کر ہی حاصل ہوتی ہیں کہ زبردستی آپ محض کسی کو حاصل کرسکتے ہیں اُسے پا نہیں سکتے۔ اور خوشیاں مہربان تب ہوتی ہیں جب ظرف بڑا کرلیا جاتا ہے کہ بدلہ کم ظرف لوگ لیتے ہیں اور کم ظرفی خوشیوں کو گہن لگادیتی ہے۔ جو مزا معاف کردینے میں ہے وہ سزا دینے میں نہیں سزا دینے کے لیے پہلے خود کو مشقِ ستم بنانا پڑتا ہے اور معاف کردینے پر خوشی و اطمینان حاصل ہوجاتے ہیں، اس لیے بدلہ لینا نہیں معاف کرنا سیکھیں اور زندگی کی سچی خوشیاں مل بانٹ کر ایک ساتھ کشید کریں۔

اگلی صبح روشن اور چمکیلی تھی۔ ملازمہ انہیں ناشتے کے لیے بلانے آئی تھی اور وہ اُس کو شریر نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔

''میں لے چلتا ہوں۔'' وہ بال بنا کر دوپٹا اوڑھتی باہر کی طرف بڑھی تھی تو وہ بازو تھام کر بولا۔

''نن، نہیں، میں خود جاسکتی ہوں۔'' نگاہ جھکائے منمنائی تھی۔

''نن، نہیں میں لے جاتا ہوں نہ۔'' وہ اُسی

کے انداز میں بولا تھا اور بازوؤں میں اٹھالیا۔
''زونیر پلیز نہیں، باہر سب ہوں گے۔ مجھے سب کے سامنے شرمندگی ہوگی، آپ مجھے اُتاریں' میں خود جاسکتی ہوں۔'' وہ بری طرح گڑبڑا کر رہ گئی تھی اور اُس نے ایک شوخ جسارت کے بعد اُسے بازوؤں کی قید سے آزاد کردیا تھا اُسے چلنے میں دشواری ہورہی تھی۔
وہ ریلنگ تھامے آہستگی سے سیڑھیاں اُتر آئی تھی۔ ڈائننگ ہال میں سب اُنہی دونوں کے منتظر تھے۔ اُن کے سلام کا جواب دے کر بڑے ملک بولے۔
''بچے، تم وقت بے وقت کھانے کے عادی ہوگے، ہم نہیں ہیں، ناشتہ و کھانے کے لیے وقت پر آیا کرو، ورنہ اکیلے ہی کھایا کرو، ہمیں انتظار سے کوفت ہوتی ہے۔'' وہ جھینپ کر اپنی مخصوص چیئر پر بیٹھ گیا تھا جبکہ وہ سرخ پڑ گئی تھی اور جگہ سے ہلی تک نہیں تھی۔
''اب کیسی طبیعت ہے بھرجائی، تکلیف زیادہ تو نہیں ہے۔'' بڑے ملک کی بات پر وہ سب ہی اُسے دیکھنے لگے تھے۔
''اب کیسی طبیعت ہے؟'' بی بی شاہ تاج کے لہجے میں فکر تھی اور اُس نے مختصراً اپنا احوال بتایا۔
''بچے یہ تو بہت زیادہ جل گیا ہے۔'' وہ کرسی کھسکا کر اٹھی تھیں، اُسے اپنی جگہ پر بٹھا کر پیر کا جائزہ لے کر بولی تھیں۔
''بے بے، آپ پریشان نہ ہوں، میں ٹھیک ہوں، اب تکلیف بھی زیادہ نہیں ہے۔'' اُن کے انداز پر اُسے ماں جی یاد آگئی تھیں اور وہ نم لہجے میں بولی۔
''زونی تجھے بالکل عقل نہیں ہے، بچی کے پیر اتنے جل گئے ہیں اور تو اُسے یہاں لے آیا، میں ناشتہ کمرے میں ہی بھیج دیتی۔ خوامخواہ دلہن کو زحمت دی۔'' وہ اب زونی پر بگڑی تھیں۔
''میں نے کہا تھا بے بے، مگر مانی نہیں، کہنے لگی بے بے بہت خطرناک ہیں نہ جانے پر غصہ ہوں گی۔'' وہ شرارت سے بولا تھا۔ اور اُس کی گہری براؤن آنکھیں حیرت سے واہوگئی تھیں۔
''نہیں، میری بہو ایسا کہہ نہیں سکتی۔'' وہ بڑے یقین سے بولی تھیں سب کی دبی دبی ہنسی پر وہ گڑبڑا گیا۔
''بے بے تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔'' برابر چیئر پر بیٹھے بڑے لالہ کے ٹھوکا مارنے پر وہ جھینپ گیا تھا اور اُس کے بعد کھانا بہت خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ اُمِ لیلیٰ کی شرمیلی مسکان، ملک زونیر عباسی کی بات بے بات ہنسی، حویلی کے مکین بھی کافی عرصے بعد مطمئن ہوگئے تھے۔ ملک زونیر عباسی کی اُداسی و آزاردگی نے حویلی کے مکینوں کو بھی اُداس کرکے رکھا ہوا تھا۔
''آئی ایم سوری بڑے لالہ، میں کیک بیک نہیں کرسکوں گی۔'' بٹ پکا پرامس جیسے ہی میرا پاؤں ٹھیک ہوا اور بے بے نے مجھے کچن میں جانے کی اجازت دی میں آپ کو مزیدار کیک بنا کر کھلاؤں گی۔'' اُن کی شادی کی سالگرہ پر اُس نے کیک بیک کرنے کا وعدہ کیا تھا اس لیے شرمندگی سے بول رہی تھی۔
''ٹھیک ہے بھئی ٹھیک ہے، آٹھویں سالگرہ ہے سات سال سالگرہ نہیں منائی صرف تمہارے کہنے پر منارہے ہیں۔''
''تھینک یو سو مچ فار دس آنر بڑے لالہ، آپ مجھے بالکل سبحان بھیا کی طرح لگتے ہیں، وہ بھی میری کوئی بات نہیں ٹالتے۔'' اُس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں ایک جرم کی پاداش میں اُس نے کیسی

کیسی محبتیں ٹھکرائی ہوئی تھیں۔ حویلی میں خوشگوار سی ہلچل مچی ہوئی تھی وہ کمرے میں آ گئی۔ اُس کے پیچھے ہی زونی کی چھوٹی بہن جو دو دن قبل ہی نانی کے گھر سے آئی تھی آ گئی۔

''بھرجائی آپ میری ہیلپ کر دیں گی کہ میں شام میں کیا پہنوں؟''

''آف کورس۔'' وہ جتنا جھجک کر بولی تھی وہ اتنی ہی خوشدلی سے حامی بھر گئی پھر اُسے شریر نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

''اظہر لالہ' آج امریکہ سے واپس آ رہے ہیں۔ اس لیے ہماری نند صاحبہ کو نشس ہو رہی ہیں۔'' وہ جھینپ گئی اور اُسے وہ شرمائی شرمائی خاموش طبع لڑکی معمول سے زیادہ اچھی لگی۔

''تم اپنے کمرے میں چلو میں آتی ہوں، آج میں تمہارا میک اپ بھی کر دوں گی۔'' اُس نے آفر کی۔

''آپ کے پاؤں میں تکلیف ہے نہ اس لیے میں نوراں سے سارے کپڑے یہی منگوا لیتی ہوں۔'' اُن ڈھیر سارے کپڑوں میں اُسے ایک بھی ایسا نہیں لگا کہ وہ آج پہن لے کہ وہ تمام گھیر دار فراکیں تھیں اور اُسے لگتا تھا کہ آج کوئی اسٹائلش سوٹ پہننا چاہیے کہ اُس کا منگیتر 4 سال بعد امریکہ سے آ رہا تھا۔ لیلیٰ نے کچھ سوچ کر اپنی وارڈ روب کھولی اور بغیر پہنے کپڑے اُس کے سامنے یہ کہہ کر رکھے کہ وہ ان میں سے کوئی پسند کر لے مگر وہ انکاری ہو گئی۔

''نہیں، بھرجائی، بے بے غصہ ہوں گی، ہم لوگ تو صرف یہی کپڑے پہنتے ہیں، آپ تو زونی لالہ کی دلہن ہو اس لیے بے بے آپ کو کچھ نہیں کہتیں۔ وہ سادگی سے کچھ خوفزدہ لہجے میں بولی تھی۔

''تم ان میں سے کوئی ڈریس پسند کر لو، بے بے سے میں خود بات کر لوں گی۔'' اُس نے گلابی رنگ کی لمبی قمیض اور ٹراؤزر پسند کر لیا تھا۔ جس پر پرل کے موتیوں اور بیڈس کا بے حد نفیس کام بنا ہوا تھا اور یہ رنگ اظہر کا فیورٹ ہے۔ وہ شرما کر بولی۔

لیلیٰ آہستگی سے چلتی بے بے کے کمرے میں آ گئی اور وہ اُس کو دیکھتے ہی اُس پر بگڑی تھیں کہ اُسے چلنے کو منع کیا ہے تو وہ ٹک کر بیٹھ نہیں سکتی۔''

بے بے آپ سے ایک مشورہ لینا تھا اس لیے آ گئی کہ آپ چل کر میرے پاس آتیں تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' وہ ادب سے بولی کہ وہ بڑوں کا احترام اُن کی عزت کرنا جانتی تھی اور اُس نے اپنی فرمانبرداری کے سبب اُن کا دل جیت لیا تھا اور وہ ازالے کے لیے اپنی فطرت اور عادت سے بڑھ کر سب کے ساتھ گھلنے ملنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''بے بے یہ سوٹ کیسا ہے؟'' اُس نے ہاتھ میں تھاما ہوا قیمتی سوٹ اُن کے سامنے رکھا۔

''اچھا ہے...... لیکن زونی کی دلہن' آج کوئی شوخ رنگ کا مقامی لباس پہن لو، اظہر آج واپس آ رہا ہے۔ آج سارے ہی برادری والے آئیں گے۔''

''جی اچھا، بے بے جو آپ سوٹ دیں گی میں وہی پہن لوں گی۔'' وہ بلا چوں وچرا اُن کی بات مان گئی تھی اور وہ نہال ہو گئی تھیں۔ بڑی بے ساختہ مسکراہٹ نے اُن کے لبوں کو چھوا تھا۔

''بے بے، آپ کہیں تو میں یہ سوٹ بہن کو دے دوں، اظہر لالہ، کافی سال بعد امریکہ سے آ رہے ہیں۔ اس طرح کے کپڑوں میں بہت اچھی لگے گی اور اظہر لالہ......''

''نہیں...... زونی کی دلہن ہمارے ہاں

صرف روایتی لباس ہی پہنا جاتا ہے۔'' انہوں نے اپنی بات حتمی انداز میں کہی۔

''ٹھیک ہے بے بے میں بھی اب حویلی والوں جیسا پہناوا ہی رکھوں گی۔'' وہ دل سے بولی۔

''جیتی رہو بیٹا۔'' انہوں نے اُس کی پیشانی چوم لی۔

''اچھا سنو...... چھوٹی کو یہ کپڑے پہننے کے لیے دے دینا۔'' لیلیٰ نے خوشگوار حیرت سے بے بے کو دیکھا اور اُن کو مسکراتا پا کر نہال ہوگئی۔

اُن کا شکریہ ادا کر کے سرشاری کے عالم میں کمرے سے نکلی تھی اور ملک زونیر عباسی سے بری طرح ٹکرائی تھی۔ جبکہ وہ اُس کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کا گلابی چہرہ کھلا پڑ رہا تھا اور براؤن روشن آنکھیں جگر جگر کر رہی تھیں۔

''تھینکس، میرے ہر رشتے کو سمجھنے، پیار دینے اور اہمیت دینے کے لیے۔'' اُس نے اُن کی گفتگو سنی تھی۔

''تھینکس مجھے اتنے چاہنے والے رشتے دینے کے لیے۔'' وہ اُسی کے انداز میں بولی اور وہ بے ساختہ ہی قہقہہ لگا گیا اور وہ جھینپ گئی۔ بڑے لالہ مطمئن سے وہاں سے گزر گئے تھے۔

لیلیٰ نے زونی کی بہن کو خود تیار کیا تھا وہ کم عمر حسین لڑکی مہارت سے کیے گئے میک اپ سے حسین تر ہوگئی تھی۔ جس نے دیکھا تھا وہ تعریف کیے بنا رہ نہیں سکا۔ اظہر کی ماں نے اُس کی بلائیں لے کر نظر کا ٹیکہ لگایا تھا۔ بے بے نے تو صدقے کا بکرا بھی منگوالیا تھا۔ شام کے چھ بجے کے قریب اظہر حویلی کے زنان خانے میں داخل ہوا تھا۔ وہ سب سے باری باری ملا۔ بڑوں کی دعائیں اور پیار لیا تھا اور بے بے نے جب اُم لیلیٰ کا تعارف کروایا تھا۔ اُس نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دی تھیں اور نگاہ جھکائے کھڑی اپنی ہونے والی دلہن پر نظر ڈالی۔ اُس کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا کہ پردیس میں اِس نوعمر لڑکی کی یادیں ہمیشہ اُس کے ساتھ رہی تھیں اور اُس کے دیکھنے میں پسندیدگی بھی تھی اور حیرت بھی کہ وہ علاقائی لباس پہنے ہوئے نہیں تھی اور اُس کا لمبا قد' لانگ شرٹ اور ٹراؤزر میں اور نمایاں ہوگیا تھا۔ وہ اُس کی نگاہوں کی تپش سے بوکھلا کر وہاں سے چلی گئی۔ اظہر کے لبوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ بکھر گئی۔ مانو سفر کی تھکن اُس کو دیکھ کر ہی مٹ گئی تھی۔ اُس کے فریش ہو کر آنے تک چائے وغیرہ کا انتظام ہوگیا تھا۔ گھر والے سب ہی موجود تھے۔ چائے پینے کے دوران ملک زونیر عباسی اُٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔ اور جب تھوڑی دیر بعد لوٹا تو وہ اکیلا نہ تھا۔

''ہانی......'' لیلیٰ نے دوڑ کر اُسے اپنے لپٹا لیا اور ماں کو دیکھ کر تو وہ بے اختیار ہوگئی تھی۔ آنسو ہی نہیں تھم رہے تھے۔

''ماں جی آئی ایم سوری۔''

''چپ کر جاؤ، میں تم سے ناراض نہی ہوں۔'' انہوں نے بمشکل بیٹی کو خود سے الگ کر کے اُس کے آنسو پونچھے تھے۔

''ماں جی آپ سچ کہہ رہی ہیں نا؟''

''ہاں میری گڑیا ہاں......'' کلثوم نے اُس کے آنسو پونچھے وہ بھیگی سی مسکراہٹ کے ساتھ سبحان سے ملنے گئی تھی۔

''سوری، سبحان بھیا۔'' اُسے نرمی سے خود سے الگ کر کے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور وہ خوشدلی سے سب سے اپنی فیملی کا تعارف کروانے لگی تھی اور کلثوم بیٹی کو سب کے ساتھ گھلا ملا دیکھ کر مطمئن ہوگئی تھیں۔

حویلی میں خوب چہل پہل تھی اور مہمان خانہ مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ بڑے لالہ نے صرف اُس کی خوشی اور مان رکھنے کے لیے برادری والوں کے جانے کے بعد بیوی کے ساتھ مل کر کیک کاٹا تھا، رات کے بارہ بجے تک شور ہنگامہ بپا رہا تھا اور پھر وہ سب سونے کے لیے چلے گئے۔

انہیں بڑے لالہ نے اُم لیلیٰ کی سچی مسکراہٹ لانے کے لیے ڈرائیور بھیج کر بلوایا تھا اور اُس کو ہنستے مسکراتے دیکھ کر وہ بے حد خوش و مطمئن تھے۔

''اٹھو اور اپنے کمرے میں جاؤ، زونیر بھائی انتظار کر رہے ہوں گے۔'' وہ گڈ نائٹ کہتی روم سے نکل آئی تھی۔ اُس کے پیروں میں اب تکلیف واقعی بڑھ گئی تھی۔ وہ کافی سُست روری سے بیٹھک کے دائیں جانب بنے مہمان خانے سے نکل کر ہال کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ قدموں کی آواز پر چونکی تھی اور ملک زونیر عباسی کو دیکھ کر اطمینان سا ہوا تھا کہ ملگجے سے اندھیرے میں اُسے ڈر سا محسوس ہوا تھا۔

''اب بھی آنے کی کیا ضرورت تھی؟'' وہ اُس پر خفا ہوا جو ملگجے اندھیرے میں بلڈ ریڈ گھیر دار فراک لائٹ سے میک اپ میں اپنے قیامت سے سراپے کے ساتھ اُس کے عین سامنے کھڑی تھی۔

''زونی اتنے دنوں بعد ملی تھی باتوں میں خیال ہی نہیں رہا اور اتنی دیر ہوگئی۔'' اُس نے محبت سے وضاحت کی۔ اور وہ دونوں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ مگر پہلی سیڑھی کے بعد دوسری پر قدم نہ رکھ سکی، آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ لب پر لب جما کر تکلیف کی شدت برداشت کرنے کی کوشش کی اور ہمت کر کے آگے قدم بڑھائے، اوپر سے کھڑا اُس کو اپنا ضبط آزماتے دیکھ وہ اپنا ضبط کھو گیا تھا اور کافی تیزی میں آ کر اُس کے عین سامنے رُک کر اُسے گود میں اٹھا لیا تھا۔

''من مانیاں کرنے کی کچھ تمہیں عادت ہی ہے بے بے نے کتنا کہا تھا، ایک جگہ ٹک کر بیٹھ جاؤ، مگر نہیں محترمہ چل نہیں رہی تھیں، ہرنی کی طرح قلانچیں بھر رہی تھیں، دیکھ لیا نہ انجام اب ایک قدم بھی نہیں چلا جا رہا۔ بروقت آ کر بازو تھام نہ لیتا تو گری پڑی ہوتیں نیچے۔'' وہ مستقل بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

''ہاں، تو گرنے دیتے نا، میں آپ کو اُٹھانے کو بلاتی بھی نہیں۔'' اتنی ہی ہیلپ کے لیے احسان جتانے لگے۔'' وہ اُس کی قربت سے خائف ہوتی بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے منمنائی۔

''ہاں تو احسان جتاؤں گا کیوں نہیں، آٹے کی بوری کی مانند بھاری بھرکم ہو، میرا ہی حوصلہ ہے جو تمہیں اٹھا کر لے آتا ہوں۔''

وہ کمر کے بل کہنی اٹھائے ہتھیلی سر کے نیچے لگائے اُس کے سامنے دراز ہو کر اُس کو شرارت سے دیکھ رہا تھا۔ جو شرمائی شرمائی دل میں اُتری جا رہی تھی۔

''اُف، اتنا جھوٹ میں اور بھاری بھرکم۔'' وہ چلائی تھی۔ اور وہ قہقہہ لگا بیٹھا تو جھینپ گئی۔

''میری لیلیٰ تو پھولوں سے ہلکی، کانچ سے بھی زیادہ نازک ہے۔'' اُس کی جھولتی لٹ کھینچی اور اُس کی پلکیں عارضوں کو چھونے لگی تھیں۔

''مم، مجھے نیند آ رہی ہے، میں بہت تھک گئی ہوں۔'' وہ حیا سے بولی بیڈ سے اُتری تو زونی نے اُس کا سرخ دوپٹا کھینچا مگر وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی تو زونی دوپٹا ہاتھ میں لپیٹے ہوئے تمام حسیات اُس کی طرف مبذول

کر کے گنگنایا تھا۔

''ہوا میں اُڑتا جائے تیرا لال دوپٹا ململ کا......''

''ملک زونیر عباسی آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے میرا دوپٹا ململ کا نہیں، شفون جارجٹ کا ہے۔'' وہ اُس کے مسکراتے عکس کو آئینے میں دیکھتے ہوئے جیولری اتارتے ہوئے بولی۔

''میرے ہاتھ میں لپٹا جائے تیرا لال دوپٹا شیفون جارجٹ کا۔ ہو جی......'' اُس کے فوراً ہی تصیح کرنے پر وہ بے ساختہ ہی ہنستی چلی گئی۔ زونیر لیلیٰ کو مبہوت ہو کر دیکھتا رہ گیا۔

''بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔'' اُس کی گردن میں بازو حمائل کر کے گھمبیر لہجے میں بولا تھا۔

''بہت جلدی میری تعریف کرنے کا خیال نہیں آگیا۔''

''خیال تو تھا سب کے سامنے خیال کو زبان دیتا تو شاید نہیں یقیناً تمہیں اچھا نہ لگتا۔'' وہ مسکرایا تھا اور وہ مسکرا کر چوڑیاں اتارنے لگی تھی تو وہ اُس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

''پہنی رہو تمہارے گلابی ہاتھوں میں سرخ چوڑیاں خوب جچ رہی ہیں۔'' لیلیٰ اُس کی دیوانگی پر شرما کر دوہری ہونے لگی۔

''مجھے کھنکتی ہوئی چوڑیاں اچھی لگتی ہیں، خاموش کمرے کی فضا میں جب یہ اپنی جلترنگ بجاتی ہیں، دل کا ساز بھی بج اٹھتا ہے۔'' اُس نے انگلیوں کو تھام کر ہلکے سے ہاتھ ہلایا تھا کھنکتی چوڑیاں سنگ اُس کی شفاف کھنکتی ہنسی اور ملک زونیر عباسی کا زندگی سے بھر پور قہقہہ گونج اٹھا۔

''مجھے معاف کرنے، مجھے ڈھیر سارے پیار بھرے رشتے دینے، مجھے میرے اپنوں سے ملانے اور ڈھیر سارا مان، محبت دینے کا شکریہ۔'' وہ اُس کے سینے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔

''گزری تلخیاں بھلانے، میرے اپنوں کو اپنا سمجھنے، میری محبت قبول کرنے اور مجھ سے محبت کرنے کا شکریہ۔'' اُس کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے نرم سی سرگوشی کی۔

''آپ سے کس نے کہا کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔'' وہ ٹھٹکی۔

''تمہاری آنکھوں نے، تمہاری جھکی پلکوں نے تمہارے رخساروں پر پھیلتی سرخی نے تمہارے مرمریں بدن پر سجے اس لباس نے، تمہاری بانہوں میں سجی چوڑیوں اور ان کنگنوں نے، تمہاری موجودگی نے، تمہاری خود سپردگی نے تمہارے دل کی ہر اک دھڑکن نے مجھ سے کہا ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔''

وہ گھمبیر لہجے میں جذبوں کی آنچ دہکائے نرمی سے اُسے چھو رہا تھا اور وہ قوس وقزح جیسے حیا کے تمام رنگ لیلیٰ کے چہرے پر بکھر گئے اُس کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکی کیونکہ حقیقت ہی یہی تھی اُسے کسی خاموش لمحے میں ملک زونیر عباسی سے محبت ہو گئی تھی اور دیر ہونے سے قبل جس کا احساس بھی ہو گیا تھا اور وہ لوٹ آئی تھی کہ محبت اک جاوداں حقیقت ہے اور جس کا ادارک ہو کر ہی رہتا ہے اور سچی محبت کا صلہ بھی مل کر رہتا ہے۔ جذبوں سے بوجھل لہجے میں زونیر نے لیلیٰ کے کانوں میں سرگوشی کی۔

''جانِ من کس قدر تجھے چاہوں کہ تو میری چاہتوں اور ریاضتوں کا صلہ ہے۔'' اور کانچ کی چوڑیوں کی آواز نے شب تاریک میں جیسے جلترنگ بکھیر دیے۔

☆☆......☆☆

ناولٹ

حبیبہ عمیر

پلکوں پر ٹھہرے خواب

خوبصورت جذبوں کی عکاسی کرتی

بے مثال تحریر جو اپنے پڑھنے والوں پر سحر طاری کر دے

قسط نمبر: 3

ارے یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ شمائلہ حیرت سے ہنسی۔ واہ نائلہ تُو تو سمجھدار ہونے لگ گئی ہے میرے ساتھ رہتے رہتے، وہ اس کا کندھا تھپتھپا کر بولی۔

شکریہ شکریہ نائلہ داد وصول کرنے لگی۔

شمائلہ ولی کو لے کر ایک طرف ہو لی جبکہ رضوانہ کا کوئی اتا پتا نہیں تھا کہ کدھر ہے۔

ارے عالی ادھر آؤ دیکھو یہاں چوڑیاں کتنی زبردست ہیں۔ نائلہ چہک کر بولی عالی اس کی طرف متوجہ ہوا۔

ودعیہ کو اپنا آنا بے کار لگا کسی کو فکر ہی نہیں تھی کہ وہ بھی ہے ولی پہلے آپ مجھے جوڑا دلائیں پھر اس کے ساتھ چوڑیاں اور پھر جیولری اور سینڈل بھی۔ شمائلہ ناز دکھاتے ہوئے بولی۔

جی بیگم صاحبہ کیا یاد رکھیں گی آپ۔ ولی فراخ دلی سے بولا۔

جبکہ بیگم صاحبہ سن کر شمائلہ کا چہرہ لال ٹماٹر ہو گیا۔

عالی پرفیوم دیکھ رہا تھا جب نائلہ آ گئی۔

تمہیں پتا ہے عالی میرے پاس بہت سے پرفیومز ہیں اور بہت مہنگے والے بھی۔

اچھا عالی ایسے بولا جیسے مرعوب ہو رہا ہو۔

بھائی ذرا یہ تو دکھاؤ۔ نائلہ نے دکاندار سے پرفیوم مانگا۔ ہوں اچھی خوشبو ہے وہ ہاتھ پر چھڑک کر بولی۔

تم بھی دیکھو عالی وہ اپنا ہاتھ اس کی ناک کے قریب کر کے بولی۔

''نہیں مجھے اچھا نہیں لگا۔''

اچھا چلو کوئی اور دیکھ لیتے ہیں وہ دوبارہ پرفیومز کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ چلتے چلتے چوڑیوں کے اسٹال پر آئی دفعتاً اس کی نظر ایک سیٹ پر پڑی۔ ہائے یہ تو بالکل میرے سوٹ کے رنگ کے ہیں وہ خوش ہو گئی مگر جیسے ہی اسے خیال آیا کہ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں اس کی خوشی ماند پڑ گئی۔

ماموں جانے سے پہلے جو پیسے اسے دے کر

گئے تھے وہ اس نے اپنی کتابوں اور نوٹس بنانے میں خرچ کر دیے تھے۔
وہ افسوس سے اس سیٹ کو دیکھ رہی تھی کہ پیچھے سے نائلہ آ گئی۔
''یہاں کیا کر رہی ہو تم......؟ چلو یہ پکڑو اور اب گم نا ہو جانا۔ عید کی وجہ سے کافی رش ہے۔''
اس نے شاپر اسے زبردستی پکڑائے۔
وہ اس کی پیروی میں چلنے لگی۔
ارے نائلہ یہ دیکھ میں نے کتنی ساری شاپنگ کی ہے۔ شمائلہ نے خوشی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑے شاپرز دکھائے۔ لگتا ہے بھائی کی جیب خالی ہو گئی ہے عالی نے مذاق کیا۔
اب ایسی بھی بات نہیں ہے......؟ تمہارے بھائی نے اپنی خوشی سے کرائی ہے شاپنگ شمائلہ جھٹ سے بولی۔
ہوں اتنے شاپرز دیکھ کر لگ رہے ہے عالی اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولا۔
ارے ودعیہ ذرا یہ پکڑنا میں اپنے بال ٹھیک کرلوں شمائلہ ودعیہ کو سارے شاپرز تھماتے ہوئے بولی۔
ودعیہ نے بمشکل سارے شاپرز ہاتھ میں پکڑے۔
شمائلہ نے نائلہ کو آنکھ ماری اور دونوں ہنس کر آگے بڑھیں جبکہ بے چاری پیچھے شاپرز سے جونچ رہی تھی۔
سب آ گئے ہیں تو چلیں ولی نے گھڑی پر نظر دوڑائی 12:30 بج رہے تھے ارے یہ عالی کہاں ہے رضوان بولا۔
آ جائے گا وہ، اتنی دیر میں آئس کریم کھاتے ہیں۔ نائلہ پاس ہی دکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

ہوں چلو ٹھیک ہے اس کا انتظار بھی ہو جائے گا اور مزہ بھی آئے گا رضوان تو سدا کا بھوکا تھا فوراً ہامی بھر لی۔
ولی نے عالی کو فون کیا اور اسے بتایا کہ وہ لوگ کہاں پر ہیں تھوڑی دیر بعد وہ بھی آ گیا۔
کہاں چلے گئے تھے تم عالی۔ ولی نے پوچھا۔
بھائی سوچا تھوڑی شاپنگ کرلوں میں بھی عید کی اس نے شاپرز بڑھاتے ہوئے کہا۔
ہوں اچھا ہے اب چلیں کافی دیر ہو گئی ہے پارکنگ میں سے بھی نکلنے میں دیر لگ جائے گی۔
ولی گاڑی کی طرف بڑھا۔
ودعیہ آتے ہی کچن میں گئی اور پانی پیا شمائلہ اور نائلہ نے اسے اپنے پیچھے بہت گھمایا تھا اور شاپرز پکڑ پکڑ کر اس کے ہاتھ لال ہو رہے تھے اس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے پھیلائے۔
اس کے ہاتھ دکھ رہے تھے۔ گھڑی پر نظر ڈالی جو ڈیڑھ کا ہندسہ دکھا رہی تھی اب گھنٹے بعد سحری بھی بنانی ہے اس کا لہجہ تھکن زدہ تھا جبکہ باقی لوگ آرام کرنے چل دیے۔
وہ کمرے میں آئی تو لائٹ پہلے ہی جل رہی تھی دفعتاً اس کی نظر بیڈ بستر کے درمیان اس شاپر پر پڑی۔
ہیں......؟ یہ کس نے رکھ دیا وہ شاپر کی طرف بڑھی۔
شاپر کھولا تو اس میں سے وہی چوڑیوں کا سیٹ نکلا ساتھ چوڑیوں کے رنگ کے ایئر رنگ بھی تھے اور ایک کون مہندی۔
ارے یہ کس نے میرے لیے رکھا ہے وہ یہ چیزیں دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہو گئی یقیناً ولی بھائی نے رکھا ہوگا۔ ایک وہ ہی تو ہیں جو تھوڑا بہت میرا خیال رکھ لیتے ہیں اور کسی طرف اس کا

دھیان ہی نہیں گیا۔
Thank you Wli Bhai وہ غائبانہ اس کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔
اور بار بار چیزوں کو دیکھ رہی تھی ان چیزوں کو دیکھ کر وہ اپنا تھوڑی دیر پہلے والا درد بھول گئی تھی۔
اگلے دن وہ دونوں چلیں گئیں تھی اور اسی رات چاند نظر آ گیا۔
آج کام کم تھا اس لیے وہ جلدی فارغ ہو کر مہندی لگانے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھوں پر جیسے تیسے مہندی لگائی۔ خالی ٹکی بنا کر ہی وہ بہت خوش تھی۔
ودعیہ پلیز چائے بنا دو میرے سر میں درد ہو رہا ہے عالی ناک کیے بغیر اندر گھس آیا ودعیہ نے ناگواری سے دیکھا۔
اوہ تم نے تو مہندی لگائی ہوئی ہے چلو رہنے دو تم اب تم اپنی مہندی نہ دھونے بیٹھ جانا۔ میں خود ہی بنا لوں گا وہ خود کہہ کر چلا گیا۔
ایسے کہہ رہے تھے جیسے میں واقعی اپنی مہندی دھو ڈالتی۔
وہ دونوں عید نماز پڑھ کر آئے تو ودعیہ بھی تیار تھی اس نے ناشتے میں سویاں بنائی تھیں۔
ہاتھوں میں چوڑیاں پہنے، کانوں میں ایئر رنگز پہنے وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔
ولی بھائی میں اچھی لگ رہی ہوں ناں، وہ بچوں کی سی معصومیت سے بولی۔ جبکہ سامنے کھڑے عالی کو یکسر نظر انداز کر دیا۔
ہوں اچھی لگ رہی ہو۔ ولی نے موبائل پر ایس ایم ایس ٹائپ کرتے ہوئے اسے دیکھے

بغیر کہا۔
Thank You وہ خوش ہو کر کچن میں چلی گئی۔
ولی بھائی میری عیدی ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے ولی سے ہمیشہ کی طرح عیدی مانگی۔
ہاں بھئی یہ تو تمہارا حق ہے۔ اس نے جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکالا اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ودعیہ خوش ہوگئی۔
ارے یار عالی تو گھر پر ہی ہے ناں میں ذرا اپنے دوستوں سے مل آؤں۔ ولی اٹھتے ہوئے بولا۔
ہوں عالی نے سر کو جنبش دی اور ٹی وی دیکھنے لگا۔
اچھا ابو کی فلائٹ دو بجے کی ہے ناں......؟ ولی نے جاتے جاتے سوال کیا۔
ہوں عالی نے ایک بار پھر سر ہلایا۔
اوکے پھر 1 بجے نکلیں گے لینے کے لیے۔ میں تب تک آجاؤں گا وہ جاتے جاتے بولا۔
ودعیہ نے چائے کے دو کپ بنائے ایک کپ اسے دیا اور دوسرا خود لے کر اوپر جانے لگی کہ عالی نے اسے آواز دی۔
ودعیہ رکو، یہ لے لو۔
جی!......؟ وہ کھڑے کھڑے بولی۔
اپنی عیدی لے لو مجھ سے وہ جیب سے پیسے نکالتے ہوئے بولا۔
آپ دے گے......؟ ودعیہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کیونکہ زندگی میں پہلی بار عالی اسے کچھ دے رہا تھا خود سے۔
ہاں بھئی اور بھی کوئی ہے کیا وہ چڑ گیا۔
ودعیہ اس کی طرف بڑھی اس نے ہاتھ آگے کیا۔
عالی نے سو سو کے کئی نوٹ نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔
یہ سارے......؟ اسے پھر حیرت ہوئی۔
ہاں بھئی یہ سارے۔ عالی مسکرایا۔
Thank You بھائی کہہ کر وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ جبکہ حیرت سے اس کا منہ اب بھی کھلا تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ عالی نے اسے خود عیدی دی ہے۔
شام کو ماموں اور ممانی آ گئے ماموں نے اسے ڈھیروں پیار دیا جبکہ رقیہ بیگم نے بادل نخواستہ اسے گلے لگالیا۔ ودعیہ کی آنکھیں بھیگ گئیں مامی کے پیار کرنے پر۔ جبکہ رات کے کھانے پر زکیہ بیگم بمعہ اہل وعیال تشریف لا رہی تھیں۔ سو وہ آنسو پونچھ کر کچن میں تھی۔
☆......☆......☆
کھانا پکاتے ہوئے وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اس کی ساری زندگی بس یونہی گھر کے کاموں میں خاص کر کچن میں ہی بسر ہو جائے گی۔ کافی دنوں سے مہمانوں کی آمد جاری تھی۔ سب ہی ماموں اور ممانی سے ملنے آ رہے تھے۔ دادا جان کا فون بھی آیا تھا کہ انھوں نے کہا تھا کہ وہ ایک بار گاؤں کا چکر ضرور لگالے وہ اس سے ملنا چاہتے تھے۔ وہ جانا چاہتی تھی مگر مصروفیت کی وجہ سے جا نہیں پا رہی تھی۔
پیپر بھی اگلے ہفتے ہو رہے تھے اسنے سوچا کہ ایک بار پیپرز دے کر وہ رہنے کے لیے جائے گی۔
ہفتے کی شام کو ولی کی ڈیٹ فکس کرنے جانا تھا۔ ولی تو خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا ہر وقت کچھ نہ کچھ گنگناتا رہتا تھا۔

بھائی تمہیں کچھ زیادہ ہی خوشی نہیں ہو رہی شادی کی۔ عالی نے اسے گھیر لیا۔
یار جب من چاہا جیون ساتھی ملتا ہے نا تب ایسی ہی خوشی ہوئی ہے میرے بھائی، وہ اس کی ٹھوڑی ہلاتے ہوئے بولا۔
من چاہا ساتھی، عالی نے کھینچ کر لفظ ادا کیا۔ بھائی ساتھ ہی بھنویں اچکائیں۔
ہاں من چاہا ساتھی مجھے شمائلہ پسند ہے۔
صرف پسند......؟ عالی حیرت سے بولا۔
مجھے لگا شاید عشق وغیرہ کا بخار ہے وہ ہنسا۔
ہاں یار تھوڑا یہ بھی چکر ہے اس نے سرگوشی کی اور مسکرایا۔
اللہ تمہیں ڈھیروں خوشیاں دے، سچے دل سے دعا دی، شکریہ میرے بھائی ولی نے کندھا تھپتھپایا۔
سارے جانے کو تیار تھے اس کا موڈ بھی نہیں تھا اور اس سے پوچھا بھی کسی نے نہیں تھا لہٰذا چپ کر کے اپنے کمرے میں آ گئی اور کتابیں کھول لیں۔

☆.......☆.......☆

ودعیہ بیٹا تمہارے پیپر کب سے شروع ہیں ناشتہ پر ماموں نے پوچھا۔
ماموں پرسوں سے ہیں وہ پلیٹ اٹھاتے ہوئے بولی۔
ہوں اچھا ہے تم بھی فارغ ہو جاؤ گی پھر اپنی مامی کا ہاتھ بٹا دینا۔ ٹھیک ہے۔
جی ماموں! وہ خاموشی سے ناشتہ کرنے لگی۔
اچھا ہے کہ بھائی کی شادی بڑی عید کے بعد ہے ابھی دو مہینے ہیں میں تب تک پیپرز سے فارغ ہو جاؤں گی۔ اس نے سوچا۔
میں نے تو ڈھیروں خواب دیکھے ہیں اپنے بیٹوں کی شادی کے سارے ارمان پورے کروں گی میں ہاں۔ رقیہ بیگم بولیں۔
جی امی سارے ارمان پورے کر لیجیے گا عالی نے بھی حصہ لیا۔
ہاں دیکھیں ذرا کیسے شرما رہے ہیں بھائی ایسے تو کبھی شمائلہ بھی نہیں شرمائی۔ عالی، ولی کی شکل دیکھ کر ہنس پڑا۔
سب ہی مسکرائے۔
عالی اب تم اسے بھائی کہا کرو۔ کیا شمائلہ، شمائلہ بولتے رہتے ہو۔ رقیہ بیگم نے ٹوکا۔
جی امی کہہ دوں گا بھائی جب بھائی کے نکاح میں آئے گی ابھی تو میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔
اسے پتا نہیں کیوں چڑ سی ہوتی جا رہی تھی خالہ کی فیملی سے جب دیکھو تو تب ادھر آ ٹپکتے تھے اوپر سے ان کے بچوں کی بے باکیاں۔
ہونہہ۔ اس نے ہنکار بھرا اور چائے کا کپ اٹھا کر کمرے میں آ گیا۔
ودعیہ کچن صاف کر کے دوپہر کے لیے فریج میں سے سبزی نکال کر کاٹ دو اور پھر ظہر کے بعد چولہے پر چڑھا دینا رقیہ بیگم برتن اٹھاتی ودعیہ کو حکم دیا۔
''نہیں بیٹا تم بس برتن کچن میں رکھو اور کمرے میں جا کر پڑھو تمہارے امتحانات ہیں جاؤ شاباش۔'' ودعیہ نے مشکور نگاہوں سے ماموں کو دیکھا۔
''اور ہاں جب تک تمہارے امتحانات نہیں ہو جاتے مجھے تم کام کرتی نظر نہ آؤ۔'' وہ مسکرائے۔
جی ماموں ودعیہ خوش ہو گئی۔
''وہ کام نہیں کرے گی تو کیا فرشتے آئیں

گے۔'' رقیہ بیگم کو وقار صاحب کی بات ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔

'' فرشتے نہیں آئیں گے بیگم بلکہ آپ کام کریں گی۔ بچی کے امتحان ہیں۔ تھوڑے دن تو اس کی جان بخش دیں۔''

اس کے کوئی انوکھے امتحان نہیں ہیں۔'' ہونہہ جان بخش دیں۔'' رقیہ بیگم کا پارہ ہائی ہو رہا تھا۔

میں تو جیسے ظلم کے پہاڑ توڑتی ہوں ناں۔ بس ذرا گھر کا تھوڑا کام ہی تو کرتی ہے۔

'' بس کام ہی کرتی ہے؟ سارا دن تو کولہو کے بیلوں کی طرح کام میں جتی رہتی ہے جب دیکھو تو کبھی کچن اور کبھی دوسرے کام۔ میں کچھ بولتا نہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں دیکھ نہیں رہا سمجھیں آپ۔'' وقار صاحب کو غصہ آ گیا۔

اور رہا کام کا سوال تو اگر تھوڑے دن آپ کام کرلیں گی تو شان میں کمی واقع نہیں ہوگی۔ اور اگر زیادہ ہی کام لگ رہا ہے تو اپنی بہن کو یا پھر بیٹیوں کو ان کی بلالیں ویسے بھی ہر دوسرے دن یہاں موجود ہوتیں ہیں ناں۔ بھاگی ہوئیں آجائیں گی۔ آپ کا دل بھی لگ جائے گا اور کام بھی کروا دیں گی وہ بولنے پر آئے تو بولتے چلے گئے غصہ سے اخبار پٹخا اور میز پر سے اٹھ گئے۔

ہونہہ۔ بلوا لو اپنی بہن کو۔ انہیں تو ویسے ہی وہ کھٹکی رہتی ہے۔ رقیہ بیگم کا پارا کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

☆......☆......☆

امتحانات کے باوجود وہ مامی کا تھوڑا بہت ہاتھ بٹا دیتی تھی۔ وہ جو بھی کہیں یہ ان کا احسان تھا کہ انہوں نے اسے پالا تھا۔ بے شک وہ کبھی کبھی بہت غصہ کر جاتیں تھیں مگر پھر بھی ودعیہ ان کی عزت کرتی تھی۔

اب ویسے بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سفیدی ان کے بالوں میں بڑھ رہی تھی اور اس سفیدی کے تقاضے بھی۔ کبھی جوڑوں میں درد تو کبھی کمر میں۔

یہ سب سوچ کر ہی وہ انہیں زیادہ کام نہیں کرنے دیتی تھی۔

اس کے امتحان کیا ختم ہوئے اسے لگا کہ اس کے دوسرے امتحان شروع ہوگئے ہوں۔ مامی کے ساتھ کبھی ایک مارکیٹ تو کبھی دوسری مارکیٹ میں گھن چکر بن کر گھومنا۔ کبھی کسی دوپٹے کو گوٹا کناری لگانا کبھی کوئی سوٹ سینا غرض وہ بہت زیادہ مصروف ہوگئی تھی۔ قیمتی کپڑے تو وہ درزی سے سلوا رہیں تھیں جبکہ کچھ ہلکے گھر میں پہننے والے کپڑوں کی ذمہ داری انہوں نے ودعیہ کو دے دی تھی۔

وہ دوپٹے لے کر بیٹھی لیس لگا رہی تھی جب نائلہ اور رضوان آگئے۔

السلام وعلیکم خالہ نائلہ کی آواز لاؤنج میں گونجی۔

لاؤنج میں بیٹھے سب ہی لوگ متوجہ ہوئے۔ وعلیکم السلام میری بچی آ جا۔ انہوں نے صوفے پر اپنے ساتھ جگہ بنائی۔

ودعیہ کا رضوان کو دیکھ کر سارا موڈ خراب ہوگیا اس کے چہرے پر عجیب سی بے چینی ابھرنے لگی۔

جبکہ رضوان لالی ٹپکتے منہ سے ہنس ہنس کر اسے گھور رہا تھا۔ اس کی نظروں کی تپش سے ودعیہ کا چہرہ جلنے لگا تھا۔

ارے تو ابھی تک بیٹھی ہے جا جا کر چائے لا چل اٹھ۔ رقیہ بیگم نے اسے بیٹھے دیکھا تو

گرجیں۔

جی وہ اٹھ گئی۔

تم نے شادی کی تیاری کر لی عالی۔ نائلہ عالی سے مخاطب ہوئی۔

ہاں بس ہو رہی ہے وہ T.V پر نظریں جمائے بولا۔

"میری تو دوڑیں لگ رہی ہیں۔ پتا ہے خالہ میں نے پورے چھ جوڑے بنوائے ہیں اپنی بہن کی شادی کے لیے اور ڈھیروں شاپنگ کر رہی ہوں میں ہاں۔" وہ ایسے بولی جیسے پتا نہیں کتنا نیک کام کر رہی ہو۔

عالی کو اسکے انداز پر ہنسی آ گئی۔

ودعیہ چائے کی ٹرے اور دوسرے لوازمات لے کر آ گئی۔ رضوان نے ایک غلیظ نظر اس کے پورے سراپے پہ ڈالی۔ وہ اس صوفے کے بالکل سامنے بیٹھا تھا جہاں پہلے ودعیہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس لیے اس نے اپنی چیزیں اٹھائیں اور غیر محسوس طریقے سے عالی کے ساتھ صوفے پر جم گئی۔

چائے تو بڑی کڑک بنائی ہے تم نے ودعیہ بالکل اپنی طرح وہ دانت نکال کر بولا۔

جبکہ ودعیہ نے پہلو بدلا۔ وہ ہر ممکن کوشش کر رہی تھی اسے نظر انداز کرنے کی رضوان کی گندی نظر اسے اپنے اندر چبھتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی بے چینی کو عالی نے صاف محسوس کیا۔

اس نے ایک قہر آلود نظر رضوان پر ڈالی مگر وہ کھانے میں مصروف تھا کہ اسے پتا ہی نہیں چلا۔

ودعیہ کو یوں عالی کے ساتھ صوفے پر بیٹھا دیکھ کر نائلہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ وہ ٹویسٹر صوفے پر بیٹھے تھے عالی تھوڑا اپھیل کر بیٹھا تھا اور ودعیہ دونوں پاؤں اوپر کیے ایک طرف تھی۔

دونوں میں مشکل سے دو تین ہاتھ کا فاصلہ تھا۔

نائلہ تم شمائلہ کا سوٹ لائیں۔ رقیہ بیگم نے تسبیح ایک طرف کی۔

نائلہ...... نائلہ کدھر ہو تم۔ رقیہ بیگم نے اسے کندھے سے ہلایا۔

جی...... جی خالہ لائی ہوں۔ وہ بیگ سے سوٹ نکالنے لگی۔

سوٹ خالہ کو دے کر اس نے عالی کو دیکھا وہ ودعیہ کو غور سے دیکھ رہا تھا جبکہ وہ گوٹا کناری لگانے میں مصروف تھی عالی نے ہاتھ بڑھا کر دوپٹہ کا ایک سرا اور گوٹے کو دیکھنے لگا۔

"خالہ کوئی کام ہو تو آپ مجھے بلا لیا کریں۔" نائلہ اونچی آواز میں اپنی خدمات پیش کیں۔ آپ اکیلی ہوتیں ہیں نا وہ ودعیہ کو گھور کر بولی۔

"ارے جیتی رہ توں۔" رقیہ بیگم باغ باغ ہو گئیں اور بڑھ کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

"اکیلی اکیلی کیوں......؟ ودعیہ ہے نا تم اپنے گھر کا کام ہی کرا لو یہ ہی بہت بڑی بات ہے۔ عالی نے (بہت) پر بہت زیادہ زور دیا۔ لہجہ یکسر مذاق اڑانے والا تھا۔

"نائلہ نے اس کے لہجے پر سبکی محسوس کی۔ چلو رضوان تم وہ یہ کہہ کر اٹھ گئی۔ جبکہ ودعیہ ان سب سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف تھی ان دونوں کے نکلتے ہی ودعیہ نے سکھ کا سانس لیا۔

عالی نے ازخود اس کی یہ حرکت نوٹ کی۔

☆......☆......☆

شادی کی تیاری کی وجہ سے دونوں فیملیز کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا اور زیادہ بڑھ گیا تھا جبکہ سائز تو کبھی کچھ، تو کبھی کچھ عالی نے ودعیہ

کی حرکات وسکنات نوٹ کرنا شروع کر دیں۔
جب بھی رضوان آتا تھا اس کے چہرے پر عجیب سی بے چینی آجاتی تھی۔ وہ اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی تھی یا پھر منظر سے ہٹنے کی جبکہ رضوان کے معنی خیز جملے اور اسکا دیکھنے کا انداز ودعیہ کو بڑا لوفرانہ محسوس ہوتا تھا کچھ اس کا حلیہ بھی ویسا ہی تھا۔
جہاں تک خالہ کے گھر آنے جانے کی بات آتی تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال جاتی۔
آج بھی خالہ اور رضوان آئے ہوئے تھے اور وہ شربت دے کر اوپر چلی گئی تھی۔ رضوان بھی شربت پی کر اٹھ گیا اس کے قدم اوپر کی جانب اٹھتے دیکھے تو عالی بھی اٹھ گیا۔
''آپا میں آپ سے آج خاص بات کرنے آئی ہوں۔'' زکیہ بیگم رازدارانہ لہجے میں بولیں۔
''خیریت تو ہے ناں......؟'' رقیہ بیگم گھبرا گئیں۔
''ہاں آپا خیریت ہے میں یہ کہنے آئی تھی کہ تم بارات پر اس منحوس لڑکی کو نہ لے کر آنا میں نہیں چاہتی ہے ہمارے بچوں کا اتنا بڑا دن اس منحوس کی وجہ سے برباد ہو یا ان کی آنے عالی زندگی خراب ہو۔
ہوں میں نے تو یہ سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ واقعی پریشان ہوگئیں۔
''اس کے قدم ہی سبز ہیں اس لیے آتے ہی میری ساس کو کھا گئی تھی۔
''اسی لیے تو آپا باقی سب دن تو چلو پھر برداشت کرلیں گے مگر بارات میں تو ہرگز نہ لانا کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر چھوڑ آنا ٹھیک ہے وہ اطمینان کرلینا چاہتیں تھیں۔
''ہوں تم فکر نہ کرو۔ میں کرلوں گی کچھ نہ کچھ۔ رقیہ بیگم نے تسلی دی۔
آج مایوں کا فنکشن تھا آج اس کا جانا ضروری تھا حالانکہ رضوان کا سوچ سوچ کر اس کا اب خون کھولنے لگا تھا اس کی بدتمیزیاں دن بدن بڑھتی جارہی تھیں کبھی کبھی وہ کوئی ایسی بات کہہ دیتا کہ وہ سر سے پاؤں تک سلگ جاتی اور کبھی ایسے معنی خیز فقرے کہ وہ شرم سے پانی میں غوطہ زن ہو جاتی۔ مگر اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کس سے بات کرے اگر ماموں سے کرتی تو یقیناً بدمزگی ہو جاتی ولی بھائی کا موڈ وہ خراب کرنا نہیں چاہتی تھی اور مامی تو کبھی بھی اس کا یقین نہ کرتیں اور رہا عالی تو اس نے کبھی اس سے کوئی اچھی امید نہ باندھی تھی لہذا کڑوا گھونٹ پی گئی۔
بے دلی سے تیار ہو کر نیچے آئی نیچے مہمانوں سے گھر بھرا پڑا تھا۔ مہمانوں سے ملتے ملاتے وہ اپنی پریشانی کسی حد تک بھول گئی۔
ارے ودعیہ ادھر آ۔ مامی نے اسے بلایا ارے توں نے تھال تیار کرلیا ہے ناں۔
''جی مامی میں نے سب رکھ دیا ہے بس وہ پھولوں کے گہنے نہیں ہیں۔
ہاں یاد دلایا توں نے۔'' عالی او عالی ادھر آ جلدی انہوں نے عالی کو جاتا دیکھا تو بلا لیا۔
''تم پھولوں کے گہنے لے کر آنا اچھا۔''
ابھی تو ٹائم نہیں ہے ایسا کروں گا کہ جاتے وقت لے لوں۔
''چلو ٹھیک ہے ودعیہ تم عالی کے ساتھ آنا۔ وہ ودعیہ سے مخاطب ہوئیں اور ہاں کوئی گڑبڑ مت کرنا سمجھیں۔'' ساتھ ہی انگلی اٹھاتے ہوئے تنبیہہ کی کردی۔
جی مامی وہ خاموشی سے سر جھکا گئی۔
پیلا اور لال جوڑا پہنے بالوں میں پراندہ

ڈالے ہلکے سے میک اپ میں وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔

عالی نے پہلی بار شاید اسے غور سے دیکھا۔

عالی یار تم سب مہمانوں کو گاڑی میں بٹھاؤ اور بیگم تم بھی میرے ساتھ چلو وقار صاحب بھی مصروف انداز میں نظر آئے۔

جی ابو میں سب کو گاڑی میں بٹھا دیتا ہوں آپ اور امی اپنی گاڑی میں چلیں میں پھر بائیک پر آجاؤں گا آپ نکلیں کیونکہ ڈرائیور آپ کو فولو کرے گا۔ عالی نکلتے ہی بولا۔

ودعیہ تم بھی عالی کے ساتھ بائیک پر آنا اچھا۔ رقیہ بیگم بولیں جی مامی وہ ایک بار پھر تھال دیکھنے لگی کہ کہیں کہ بھولے سے کچھ بھول تو نہیں رہی ناں کیونکہ تھوڑی سی غلطی مطلب جگ ہنسائی کیونکہ مامی سو بندوں کے سامنے بھی اس کی عزت افزائی کرنے سے دریغ نہ کرتیں۔

وہ صوفے پر بیٹھی عالی کا انتظار کر رہی تھی گھر تقریباً خالی ہو چکا تھا اور وہ اب تک نہیں آیا تھا۔

ارے ودعیہ تم گئیں نہیں۔ ولی نے اسے اکیلا دیکھا تو اس کی طرف آگیا۔

نہیں بھائی میں عالی بھائی کے ساتھ جانا ہے اور وہ اب تک نہیں آئے وہ گھڑی پر نظر دوڑا کر بولی۔ سب کو نکلے تقریباً آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا وہ تو شکر کہ اس نے تھال بھجوا دیا ورنہ تو بس...... وہ سوچ رہی تھی کہ عالی آگیا۔

ارے یار کدھر تھا تو، کب سے تیرا انتظار کر رہی ہے۔ ولی نے ودعیہ کی طرف اشارہ کیا جو ہاتھ گھٹنے سے ٹکا کر تھوڑی پہ جمائے انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔

وہ بائیک خراب ہو گئی تھی وہی ٹھیک کرنے گیا تھا۔ عالی نے جواب دیا ولی کے فون کی گھنٹی بجی تو وہ نکل گیا۔

چلیں ودعیہ کھڑی ہو کر سر پر دوپٹہ جمانے لگی۔

دفعتاً عالی بولا۔ تم نے چوڑیاں نہیں پہنیں وہ تو پہن لو۔

فوراً اس کی نظر اپنی سونی کلائی پر گئی پریشانی میں وہ چوڑیاں پہنا بھول گئی تھی۔

میں ابھی آتی ہوں وہ کہہ کر اوپر دوڑی۔

جب وہ نیچے آئی تو اس کی دونوں کلائیوں میں لال اور پیلے رنگ کی ڈھیروں چوڑیاں کھنک رہی تھیں۔

اب اور بھی زیادہ اچھی لگ رہی ہو عالی اسے دیکھ کر مسکرایا۔

جی ......؟ ودعیہ کو لگا کہ اسے سننے میں کوئی غلطی ہو رہی ہے۔ زندگی میں شاید پہلی بار وہ عالی کے منہ سے اپنی تعریف سن رہی تھی۔ کچھ نہیں چلو وہ بڑھ گیا۔

جب وہ زکیہ خالہ کے گھر داخل ہوئی تو شکر ادا کیا ابھی زیادہ لوگ نہیں تھے۔

کہاں رہ گئی تھیں تم مامی نے اسے دبوچ لیا۔

وہ بھائی کی بائیک خراب ہو گئی تھی اس نے پھولوں کا شاپر مامی کو پکڑایا۔ اس کی تھوڑی اور کھنچائی ہوتی اگر وہ آنٹی مامی کو مخاطب نہ کرتیں مامی اس آنٹی کی طرف متوجہ ہوئیں تو وہ وہاں سے کھسک گئی۔

مایوں کے فنکشن کا انتظام خالہ نے اپنی گلی میں ہی کروایا تھا۔

آہستہ آہستہ مہمانوں کی آمد بڑھ گئی اب خوب رونق لگ گئی تھی۔

''آج تو تم کچھ زیادہ ہی قیامت ڈھا رہی ہو ودعیہ جانی۔'' رضوان کی آواز اس کی سماعتوں

سے ٹکرائی تو وہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی۔
ت......ت......تم وہ بمشکل بول پائی اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی سب لوگ اپنی مستی میں گم تھے۔
اس سے پہلے کہ وہ بڑھتا وہ سائیڈ سے نکل کر پیچھے والی نشستوں پر بیٹھ گئی۔
عالی کی اس پر اچانک نظر پڑی۔
ودعیہ کا رنگ اڑا ہوا تھا وہ اس کے پاس چلا آیا۔
''تم ٹھیک ہو ودعیہ۔''
''اس کی آواز پر وہ اچھل پڑی۔ جی جی......جی بھائی م......م......ی......یں میں ٹھیک ہوں۔'' وہ اس کی طرف دیکھ کر بولی جہاں ابھی کچھ دیر پہلے رضوان تھا۔
یہ لو پانی عالی نے تھوڑے فاصلے پر پڑے ٹیبل سے پانی کا گلاس بڑھ کر پکڑا۔
اس نے ایک سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا۔
''تمہیں کیا ہوا ہے ودعیہ جی......'' رضوان اس طرف آ گیا۔
اسے دیکھ کر اس کا دل ہولنے لگا اس نے لا شعوری طور پر گلاس کو مضبوطی سے پکڑ لیا جبکہ رضوان اس کی حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔
عالی نے رضوان کی گڑی ہوئی نظریں اور ودعیہ کی بے چینی نوٹ کی۔ اسے معاملہ آہستہ آہستہ سمجھ میں آنے لگا۔
''ودعیہ تمہیں امی بلا رہی ہیں۔'' وہ ودعیہ سے مخاطب ہو کر بولا۔
جی وہ کہہ کر اٹھ گئی۔
ارے رضوان تم کہاں چلے وہ رضوان کو کندھوں سے پکڑ کر بولا۔ جو کھسکنے کی تیاری کر رہا تھا رُک گیا۔ تم کبھی مردوں میں بھی بیٹھ جایا کرو جب دیکھو تب عورتوں میں ہی گھسے رہتے ہو۔
وہ اسے لے کر باہر آ گیا۔
دلہن کو لے آیا گیا تھا اب رسمیں شروع ہو گئیں تھیں۔ رقیہ بیگم نے تھال سے چوڑیاں نکالیں تو گجرے نہ پا کر بولیں۔
ارے ودعیہ میں گجرے اندر رکھ آئیں ہو تم لے آؤ جاؤ۔
جی مامی میں لاتی ہوں وہ گھر کے اندر چلی گئی۔ عالی نے اسے اندر جاتے دیکھا اور دوبارہ باتوں میں مصروف ہو گیا۔
ہر طرف چیزیں بکھری ہوئیں تھیں پتہ نہیں مامی نے گجرے کدھر رکھ دیے ہیں وہ چیزوں کے درمیان ڈھونڈ رہی تھی۔
میں مامی سے پوچھتی ہوں کہ کدھر رکھے ہیں گجرے مسلسل ناکامی پر وہ کمرے سے باہر نکل رہی تھی جب اچانک رضوان داخل ہوا۔
''کدھر چلے سوہنیوں۔'' اس نے اندر داخل ہوتے ہی پیچھے دروازہ بند کیا۔
''یہ......یہ کیا کر رہے ہو تم۔'' ودعیہ کے ارد گرد خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں اس کے مساموں سے پسینہ چھوٹنے لگا۔
''کچھ نہیں! بس سوچا تم سے اکیلے میں چند محبت کی باتیں کر لوں وہ اس کی طرف بڑھا۔
''وہ تین قدم پیچھے ہٹی۔'' مجھے جانا ہے وہ نکلنے لگی۔
''رُک جانی۔'' اس نے پھرتی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
''یہ کیا بدتمیزی ہے رضوان۔'' اسے غصہ آ گیا اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر اس کی گرفت ودعیہ کی تمام تر طاقت سے زیادہ

تھی۔
''میں نے کہاں بدتمیزی کی ہے سوہنیوں صرف ہاتھ ہی پکڑا ہے وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔
''ویسے بچی آج یہاں ایک سے ایک آئٹم آئی ہے مگر جو بات تیرے حسن میں ہے ناں وہ کسی اور میں نہیں۔''
وہ سر سے پاؤں تک اسے دیکھتے ہوئے مدہوش، لہجے میں بولا ودعیہ سلگ گئی۔
''پیچھے ہٹو منحوس انسان۔'' اس نے دوسرے ہاتھ سے اسے پیچھے دھکیلا۔
''شرم نہیں آتی تمہیں ایسی بے ہودہ بات کرتے ہوئے۔'' آج وہ پھٹ پڑی تھی۔ وہ لاوا جو اتنے سالوں کا تھا باہر آنے پر تیار تھا۔
''غلیظ انسان! نفرت ہے مجھے تمہاری شکل سے سمجھے۔ تمہاری سوچ اتنی گندی ہے ناں کہ بس وہ برس پڑی۔
''ارے واہ، تجھ میں تو زبان بھی ہے۔'' رضوان دانت نکال کر بولا۔
''میں سمجھا گونگی بہری ہے مگر نہیں صاحب گز بھر لمبی زبان ہے تیری۔'' وہ جیب سے پان نکال کر منہ میں ڈال کر بولا۔ اور اس کے قریب آ گیا۔ ودعیہ کو شدید غصہ آ رہا تھا۔
وہ جانے لگی تو وہ فوراً درمیان میں آ گیا میں نے تم سے کچھ کہا ہے؟ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنا تھوڑا وقت اپنی یہ طوفان جیسی جوانی مجھے دے دو۔'' ودعیہ اس کے جملے پر آگ بگولہ ہوگئی۔
تھڑاک...... ودعیہ نے اس کے گال پر زناٹے دار تھپڑ مارا۔
تم جیسے گھٹیا انسان پر میں تھوکنا بھی اپنی توہین سمجھتی ہوں سمجھے تم اب مجھے جانے دو ورنہ میں چیخ چیخ کر سب کو اکھٹا کرلوں گی۔''
تھپڑ پڑنے پر وہ سلگ گیا جبکہ وہ بھپری شیرنی کی طرح اسے گھور رہی تھی۔ وہ نکلنے لگی تو اس نے اسے دبوچ لیا۔
''تو ہے کیا چیز ہاں، تیری جیسی بڑی دیکھیں ہیں میں نے۔
''شرافت راس نہیں آئی دیکھ اب میں تیرے ساتھ کیا کرتا ہوں۔''
اس نے ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھا جبکہ دوسرے بازوں سے اس کو اپنی مکمل گرفت میں کر لیا۔
ودعیہ کے حواس گم ہونے لگے ساری بہادری ہوا ہوگئی جبکہ آنکھیں دھندلا گئیں۔ وہ قیدی چڑیا کی طرح اس کی مضبوط گرفت میں پھڑ پھڑانے لگی تھی۔ اس کا دوپٹہ نیچے گر گیا جبکہ بال پراندہ کی گرہ سے آزاد ہونے لگے تھے۔
اب میں تجھے اپنا مقصد پورا کر کے ہی چھوڑوں گا وہ اسے لے کر آگے بڑھا جبکہ ودعیہ اپنے ہاتھوں سے اس کا ہاتھ اپنے منہ سے ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آنسو ایک تواتر بہتے رہے تھے جبکہ اس کے بدن سے اٹھتی خوشبو رضوان کو مدہوش کر رہی تھی۔ باہر ڈھولک شروع ہوئی۔ ودعیہ کافی دیر سے باہر نہیں آئی تھی۔ رقیہ بیگم کو نائلہ نے گجرے دے دیے تھے لہذا انہیں اس کی کوئی فکر نہیں تھی۔
عالی کو کسی انہونی کا احساس ہوا تو وہ اندر گیا۔
ودعیہ کو آواز دی مگر جواب ندارد تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا سرعتاً اس کی نظر فرش پر پڑے دوپٹے پر پڑی اس نے تیزی سے وہ دوپٹہ اٹھایا۔'' اس کا دوپٹہ تو یہ خود کہاں

ہے۔'' وہ اندر کمروں کی طرف تیزی سے بڑھا۔
''اب بتا کہاں جائے گی گوری؟'' رضوان اس کا کان میں بولا جبکہ پان کی پیپ اس کے منہ سے نکل کر ودعیہ کی گردن پر گری۔ وہ اسے لے کر بیڈ کی طرف بڑھا اب بھی اس کا ایک ہاتھ اس کے منہ پر تھا جبکہ دوسرے سے اس نے اس کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی جس کی وجہ سے اس کی چوڑیاں بھی ٹوٹ گئی تھیں اور کچھ چوڑیاں اس کی کلائی میں پیوست ہوگئی تھیں مگر اسے درد کا احساس نہیں تھا ڈر کے مارے اس کی روح فنا ہو رہی تھی رضوان کے بدن سے پسینے کی بو اس کے دماغ کو ماؤف کر رہی تھی۔

ابھی وہ بیڈ روم سے چند قدم کے فاصلے پر تھا جب عالی کمرے میں داخل ہوا کمرے کے اندر کا منظر دکھ کر اس کا دماغ گھوم گیا۔

ودعیہ رضوان کی مضبوط گرفت سے خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی اس کی کلائیوں سے خون رس رہا تھا جبکہ رضوان نے اسے اپنی فولادی ہاتھوں میں جکڑا ہوا تھا۔

جبکہ وہ کسی بے بس پرندے کی طرح جو پنجرے میں تازہ، تازہ قید ہوتا ہے پھڑپھڑا رہی تھی باہر سے اب ڈھولک کی آواز آ رہی تھی۔

رضوان! عالی گرجا اس کے ایک ہاتھ میں ودعیہ کا دوپٹہ تھا۔

عالی نے کی آواز پر رضوان سکتے میں آ گیا اس کی گرفت ودعیہ پر سے ڈھیلی پڑ گئی وہ بجلی کی تیزی سے پلٹا تو ودعیہ آزاد ہوئی اس کا سانس بحال ہوا آنکھوں میں ڈھیروں آنسوؤں کی وجہ سے منظر دھندلا ہوگیا اس نے اپنی آنکھوں کو رگڑا اس کا حلیہ عجیب ہو رہا تھا سارے بال بکھر گئے تھے کپڑوں پر شکنیں آ گئیں تھیں اور کلائیوں سے جو خون رس رہا تھا اسے اس کا احساس تک نہیں تھا۔

حواس بحال ہوئے تو اس نے سامنے کھڑے عالی کو دیکھا۔

عالی بھائی! وہ تیزی سے اس کی طرف دوڑی اور اس کے سینے سے جا لگی اس نے مضبوطی سے اس کا کرتا پکڑ لیا۔ جبکہ کلائیوں کا خون اس کے کرتے میں جذب ہو رہا تھا۔

بھ...... بھائی وہ...... وہ ہچکیوں کی وجہ سے اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

اس نے اس کو خود سے الگ کیا اور دوپٹہ اس کے کاندھوں پر ڈالا۔ ودعیہ نے دوپٹہ ایسے لپیٹا جیسے اس سے پہلے وہ بے لباس تھی۔

وہ رضوان کی طرف بڑھا غصے سے اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں عالی کو یوں اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر اس کی وہ حالت تھی کاٹو تو بدن میں لہو نہیں اس نے تھوک نگلا۔

عالی...... اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہ حرکت کرنے کی۔ عالی کے ارادے خطرناک تھے۔ ''شک تو مجھے پہلے ہی تھا کہ تم کوئی گری ہوئی حرکت کرو گے، مگر میں خاموش رہا۔'' عالی نے دانت پیس کر کہا جیسے جیسے عالی بڑھ رہا تھا رضوان ویسے ویسے پیچھے جا رہا تھا آخرکار کمرے کی حدود ختم ہوگئیں۔

عالی میری بات تو سنو...... وہ تھوک نگل کر بولا۔

مگر عالی نے ایک لفظ نہیں سنا اور تھپڑوں اور گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔

آہ...... آہ...... رضوان کی آوازیں کمرے میں گونجنے لگیں۔

''دل تو کر رہا ہے کہ تمہیں جان سے مار دوں مگر میں کوئی تماشا نہیں چاہتا۔ عالی نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

اگر آئندہ تم مجھے ودعیہ کے آس پاس بھی دکھے تو جان سے مار دوں گا سمجھے تم۔'' اب دفع ہو جاؤ یہاں سے وہ اسے دھکا دے کر بولا۔

رضوان تکلیف کے باوجود تیر کی طرح کمرے سے باہر نکلا۔

عالی تیزی سے ودعیہ کی طرف بڑھا۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہ مسلسل ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ چلو اٹھو شاباش اپنا حلیہ ٹھیک کرو وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

بھائی میری...... میری کوئی غلطی نہیں ہے میں ...... تو وہ ...... گجرے...... مجھے پتہ ہے تم اٹھو اور اپنا حلیہ ٹھیک کرو شاباش اس سے پہلے کہ کوئی اندر آئے۔ خواہ مخواہ تماشہ لگ جائے گا چلو اٹھو۔ اس نے زبردستی اسے اٹھایا اور باتھ روم کی طرف بڑھا۔

تم ٹھیک ہو باہر جانے سے پہلے عالی بولا۔

جی اس نے سر کو جنبش دی۔

''ودعیہ یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے اسے مکمل طور پر فراموش کر دو کسی کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہونی چاہیے کہ تمہارے ساتھ کیا حادثہ ہوا ہے ٹھیک ہے۔'' وہ دونوں صحن میں کھڑے تھے۔

عالی اسے سمجھا رہا تھا۔

ودعیہ نے زبردستی امڈ آنے والے انسو کو رگڑ ڈالا۔

''میں نے جو کہا اسے سمجھ گئی ہو ناں، یہ تمہاری بہتری کے لیے کہہ رہا ہوں۔'' وہ دوبارہ بولا۔

''جی بھائی نہیں کروں گی کسی سے بھی بات۔

good girl وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

نائلہ جو کہ چند لڑکیوں کے ساتھ ہنستی ہوئی اندر آ رہی تھی اس طرح دونوں کو ساتھ دیکھ کر اس کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔

''تم دونوں یہاں اکیلے......؟ انداز کافی چبھتا ہوا تھا۔

عالی نے اپنے گلے میں پہنے دوپٹے کو اس طرح سیٹ کیا کہ خون کے دھبے پر نظر نہ پڑے۔ ہاں ودعیہ کو چوٹ لگ گئی تھی اسی لیے اندر آئے تھے عالی نے فوراً جواب دیا۔

چلو ودعیہ امی بلا رہی ہوں گی وہ ودعیہ کو اشارہ کر کے بولا جبکہ نائلہ کا دماغ یہ بات ماننے سے انکاری تھا۔

رات کو جب وہ اپنے کمرے میں آئی تو بار بار اس حادثے کو یاد کر کے اس کی روح کانپ جاتی اس نے نہ جانے کتنی بار خدا کا شکر ادا کیا کہ عالی بھائی صحیح وقت پر آ گئے ورنہ اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ پائی تھی۔

☆......☆......☆

مہندی کا فنکشن اس کا بہتر گزر گیا۔ اس کے بعد اس کا سامنا رضوان سے نہیں ہوا تھا لہذا وہ تھوڑا اطمئن تھی۔

آج رقیہ بیگم کی خوشی دیدنی تھی۔ صبح ہی سے وہ بہت پر جوش لگ رہی تھیں۔ مہمانوں کو ناشتہ وغیرہ کروا کر کمرے میں آئیں کہ فون کی گھنٹی بجی۔

ہیلو ارے ہاں زکیہ خیریت ہے فون کیا۔

ارے ہاں یاد ہے تم فکر نہ کرو ہاں مختصر بات کر کے انہوں نے فون بند کر دیا۔

ودعیہ او ودعیہ کدھر ہے تو انہوں نے اسے

وہیں سے کھڑے کھڑے آواز دی۔
جی مامی! وہ دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی آئی۔
"میرے کپڑے وغیرہ استری کر دیے ہیں۔" جی مامی میں نے کر دیے ہیں اب ذرا گھر کی صفائی بھی کر دو لوگوں کی وجہ سے گندا ہو رہا ہے۔ جاؤ میں ذرا آرام کروں گی۔ وہ کہہ کر لیٹ گئیں۔

وہ لاؤنج میں آئی تو وہ گند سے بھرا پڑا تھا۔ ماموں کے چاچا اور انکل فاروقی اور ان کی فیملی تھی ساتھ ہی رضیہ پھپھو جو کہ ان کی بہن تھی وہ بھی آئیں تھیں اور ان کے ساتھ ان کا بیٹا اور بہو بھی تھے۔ سارے لاؤنج میں بیٹھے تھے وقار صاحب کے زیادہ تر رشتے دار اسی شہر میں تھے لہذا وہ عین وقت پر آنے والے تھے جبکہ چند رشتے دار شہر سے باہر تھے جن میں رضیہ پھپھو اور فاروقی انکل آئے ہوئے تھے۔

پہلے کچن سمیٹ دوں پھر آؤں گی اس طرف وہ ان پر ایک نظر ڈال کر کچن کی طرف بڑھی۔

ودعیہ باجی پانی کا گلاس دے دیں۔ دادا ابو کے لیے ایک 6 سالہ بچہ اس کے دوپٹے کو پکڑ کر بولا۔

اچھا اسامہ تم چلو میں لے آتی ہوں وہ کہہ کر گلاس میں پانی ڈالنے لگی۔

اسامہ فاروقی انکل کا پوتا تھا۔ جو اپنی امی، ابو، دادا اور چھوٹی بہن کے ساتھ شرکت کرنے آیا تھا۔

وہ گلاس لے کر آئی تو ردا بھابی بولیں۔

ودعیہ استری اوپر ہے......؟

جی بھابی اوپر ہے۔

تم بھی چلو زنیرہ انہوں نے رضیہ پھپھو کی بیٹی سے کہا۔

ہاں چلو میں بھی کپڑے استری کر لوں زنیرہ بھی کھڑی ہوگئی۔

بھابی میں کر دیتی ہوں کپڑے استری ودعیہ ردا کے ہاتھ سے کپڑے لے کر بولی۔

"ارے رہنے دو ودعیہ تم پہلے سے اتنا ڈھیر سارا کام کرتی ہو اب ہمارے اضافی بوجھ اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ اس کی ٹھوڑی کو پکڑ کر مسکرائیں۔ وقار صاحب بھی باہر کے کام سے فارغ ہو کر آ گئے۔

زنیرہ اور ردا اوپر چلی گئیں مما میں بھی آؤں گا اسامہ بھی پیچھے دوڑا۔

ماشاءاللہ! اللہ اس بچی کا نصیب اچھا کرے بہت ہی زیادہ فرمانبردار ہے سارے گھر کا کام اکیلے کرتی ہے سارا گھر اس ننھی سی جان نے سنبھالا ہے رضیہ بیگم نے اس کے جاتے ہی بولا ہاں بھئی یہ بات ماننی پڑے گی بیچاری بچی کچھ زیادہ ہی کام کرتی ہے۔

فاروقی صاحب نے بھی تائید کی۔

بھی برا نہ ماننا وقار لیکن رقیہ کا رویہ کچھ اچھا نہیں ہے اس کے ساتھ۔ وہ تو اس بچی کو بالکل نوکرانی سمجھتی ہے۔ اب بھی دیکھو خود کمرے میں آرام کر رہی ہے اور اس کو کام پر لگایا ہوا ہے۔

ارے نہیں آپا اس کی طبیعت خراب ہے وقار صاحب کھسیائے اور شرمندہ شرمندہ بولے۔

ارے رہنے دو میاں خود کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ سارا کام بچی کے سر پر ڈال دے۔ بھلا بندہ ایک کام عالی کا انتظام کر لے وہ تو بچی فرمانبردار ہے ورنہ میں دیکھتی کہ کون کرتی ہے گھوڑوں گدھوں کی طرح کام۔ انہوں نے دکھ سے کہا۔

چلو رہنے دو آپا تم بھی فاروقی صاحب نے

وقار صاحب کو شرمندہ ہوتے دیکھا تو بول پڑے۔ بیٹے ودعیہ بالکل اپنی ماں جیسی ہے نہیں آپا۔ البتہ اس کی آنکھیں خالد کی طرح ہیں۔ انہوں نے بات پلٹی۔

ہاں قد کاٹھ تو ماں پر گیا ہے اس کو دیکھ کر شاہدہ کی یاد آتی ہے اس کی پرچھائی لگتی ہے رضیہ بیگم کی آنکھیں نم ہوگئیں انہیں شاہدہ عزیز جو بہت تھی۔

ودعیہ اپنے کپڑوں کو اور جیولری وغیرہ کو دیکھ رہی تھی۔

نہیں یہ چوڑیاں نہیں ٹھیک وہ چوڑیوں کو سوٹ پر رکھتے ہوئے بولی۔

ارے ہاں! اس کے ساتھ تو عید والے دن کی چوڑیاں اچھی لگیں گئیں وہ فوراً چوڑیوں والے ڈبے کی طرف بڑھی۔

اس نے وہ چوڑیاں نکا کر سوٹ پر رکھیں تو وہ بالکل میچنگ کی تھیں۔ اچانک پیچھے سے مامی آگئیں۔ ودعیہ۔

جی مامی آپ۔ مجھے بلا لیتیں وہ بہت کم ہی اس کے کمرے میں آتی تھیں۔

ہاں مجھے تم سے بات کرنی تھی وہ کچھ تذبذب سے بولیں۔

''میں چاہتی ہوں کہ شمائلہ کے استقبال کے لیے پہلے ہی کوئی گھر میں رہے۔''

''میں سمجھی نہیں مامی۔'' وہ پریشان ہوئی۔

''میں چاہتی ہوں کہ تم گھر میں رہو ایک تو گھر کا دھیان رکھو۔ سامان سے بھرا پورا گھر ہے مہمانوں کا بھی قیمتی سامان ہوگا۔ اس کی حفاظت بھی تو ضروری ہے اور دوسرا یہ کہ تم شمائلہ کے استقبال کے لیے تیاری رکھنا سمجھیں تم۔''

ودعیہ کو مامی سے اس بات کی ہرگز امید نہیں

اللہ سے محبت

☆ انسان سے محبت آپ کی سب سے بڑی کمزوری بن جاتی ہے اور اللہ سے محبت آپ کی سب سے بڑی طاقت بن جاتی ہے۔

☆ مایوس وہ ہوتا ہے جو اللہ پر یقین نہیں رکھتا اور محروم وہ ہوتا ہے جو اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتا۔

☆ جنت والے دوزخ والوں سے پوچھیں گے کہ کیا چیز ان کو دوزخ میں لائی تو وہ کہیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔

حسنِ انتخاب: راز عدن۔ بحرین

تھی کہ وہ اسے ساتھ لے کر نہیں جانا چاہتی کیونکہ ان کی دونوں دلیلیں بودی تھیں۔

مہمانوں کا سامان کل بھی تو گھر میں تھا جب وہ مہندی کے لیے گئے تھے اور رہا شمائلہ کا سوال تو وہ کون سا پہلی دفعہ آرہی تھی اس کا ارادہ بنا کہ وہ پہلی بار مامی کو منع کردے پھر کچھ سوچ کر خاموش ہوگئی۔

جی! وہ صرف اتنا بولی اور اپنے آنسوؤں کو بڑی سرعت سے پی لیا۔

ہوں ٹھیک ہے اب اوپر ہی رہنا باہر نکلنے کی ضرورت نہیں ہے وہ کہہ کر نکل گئیں جب کہ وہ انہیں جاتے دیکھتی رہی۔

ایک نظر اس نے سوٹ پر ڈالی اور پھر اچانک امڈ آنے والے غصے پر قابو نہ رہا تو سوٹ اٹھا کر الماری میں پھینک دیا اور چوڑیاں وغیرہ بھی اسی طرح ڈبوں میں پھینکیں اور بستر پر گرگئی۔

اتنا منحوس سمجھتی ہیں مامی کہ اپنے بیٹے کی شادی میں نہیں لے کر جانا چاہتیں نہ چاہتے ہوئے بھی وہ رونے لگی۔

اب میں اتنی بھی بچی نہیں ہوں کہ جو سمجھو ناں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ اس میں خالہ کا برابر ہاتھ ہوگا۔ وہ خود سے بات کرتے ہوئے بولی۔

کاش میرے ماں باپ ہوتے تو میں اتنی بے وقعت تو نہ ہوتی۔ اے اللہ تو نے انہیں مجھ سے کیوں چھینا کیوں۔ وہ خدا سے شکوہ کناں تھی۔

وہ نجانے کب سے لیٹی تھی کہ باہر سے شور وغیرہ آنا شروع ہوگیا۔ سب تیاری کر رہے تھے وہ کمرے کی لائٹ بجھائے بیڈ پر اوندھے منہ لیٹی ہوئی تھی اس کے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔

ہاں یار میں تیار ہوں بس نکل رہے ہیں اب 15 منٹ میں پہنچ جائیں گے۔ عالی کی آواز آرہی تھی شاید کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔

سارے نکل گئے ہیں وقار صاحب نے رقیہ بیگم سے پوچھا۔

جی سارے نکل گئے ہیں۔

تم نے ٹھیک سے دیکھا ہے ناں کہ ایک دفع میں بھی دیکھ لوں وقار صاحب اوپر کی جانب بڑھے۔

نہیں ..... نہیں میں نے دیکھ لیا ہے آپ کو اوپر جانے کی ضرورت نہیں۔ رقیہ بیگم انہیں اوپر جاتا دیکھ کر فوراً بولیں وہ جانتی تھی کہ ودعیہ اوپر ہے اگر وقار صاحب جاتے وہ نقیناً لے کر ہی آتے۔

ہوں ٹھیک ہے چلو تالے لگا دوں۔ وہ صدر دروازے کی طرف بڑھے۔

رقیہ بیگم نے شکر کا سانس لیا۔

باہر سے ڈھول بجنے کی آواز آرہی تھی اور اندر ودعیہ کے اندر سناٹا بڑھتا جا رہا تھا۔ کسی کو میرا خیال نہیں آیا۔ ماموں کو بھی میری کمی محسوس نہیں ہوئی۔ اسے سخت مایوسی تھی۔

ہال میں پہنچ کر رقیہ بیگم پہلے ذکیہ خالہ سے ملیں۔

ارے آپا مبارک ہو تمہیں۔ ذکیہ بیگم گلے ملیں۔

تمہیں بھی مبارک ہو۔

آپا کام تو کر آئی ہوناں، سرگوشی میں بولیں۔

ہوں انہوں نے آنکھوں کے اشارے سے کہا۔

”شکر ہے خدا کا کہ اس منحوس کا سایہ نہیں ہوگا اس مبارک دن پر۔“ ذکیہ بیگم نے خدا کا شکر ادا کیا۔

شادی کی گہما گہمی عروج پر تھی نکاح بس شروع ہونے ہی والا تھا ولی دولہا بنا بڑا جچ رہا تھا۔ وقار صاحب نے اس کے چہرے کی خوشی دیکھی تو ایک آہ بھری انہیں کتنی خواہش تھی کہ ولی کی شادی ودعیہ سے ہو مگر وہ اس کی خوشی دیکھ کر اُن کی یہ خواہش دل میں ہی رہ گئی۔ شروع ہی دن سے ولی کا رویہ ودعیہ سے بہتر تھا اس لیے ان کے دل میں خواہش نے جنم لیا جبکہ عالی کا انہیں پتا تھا کہ اس کی ودعیہ سے کبھی نہیں بنی تھی۔

وقار صاحب! وہ آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔

بہت بہت مبارک ہو آپ کو بیٹے کی شادی۔ کوئی صاحب ان کے گلے ملے شکریہ بلال صاحب۔ آپ آئے تو؟؟ وہ ان کے پرانے پڑوسی تھے۔

وقار بھائی شرمندہ نہ کریں کل ذرا بیگم کی طبیعت خراب تھی اس لیے نہیں آیا آج دیکھیں میں آگیا ہوں۔

وہ واقعی شرمندہ لگ رہے تھے۔

”ارے چلو تم میری خوشی میں شریک ہوئے یہ ہی بہت ہے۔“

''اچھا بھائی وہ شاہدہ کی بیٹی آپ کی طرف ہے ناں۔'' انہوں نے ودعیہ کے بارے میں دریافت کیا۔

''ہاں بھئی میری طرف ہے وہ ودعیہ۔''

''اچھا اب تو بڑی ہوگئی ہوگی۔ رانیہ کی ہم عمر ہے۔ بچپن میں اس کی کافی دوستی تھی دونوں کی۔''

ارے ہاں تمہاری چھوٹی بیٹی ناں وہ بھی آئی ہے کہاں ہے ملاؤ تو۔ وقار صاحب خوش ہوگئے۔

آئیں وہ انہیں لے کر متعلقہ ٹیبل پر گئے۔

رانیہ بیٹا دیکھو وقار انکل تم سے ملنا چاہ رہے ہیں۔

انہوں نے ایک شوخ چنچل لڑکی کو مخاطب کیا۔

''السلام علیکم انکل!'' رانیہ نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔

''جیتی رہو بیٹی۔'' وہ مسکرائے۔

السلام وعلیکم آپ کیسی ہیں وقار صاحب نے ایک ادھیڑ عمر خاتون کو سلام کیا۔

جی بھائی اللہ کا شکر ہے، آپ کو مبارک ہو خاتون خوش اخلاقی سے بولیں۔

جی شکریہ بھابی۔

بلال تمہارا بیٹا نہیں آیا۔ وہ رانیہ سے بڑا تھا نا۔

جی بھائی وہ دراصل پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک ہوتا ہے بلال صاحب بولے۔

انکل ودعیہ کہاں ہے مجھے اس سے ملنا ہے رانیہ پرجوش لہجے میں بولی۔

ضرور بیٹا تم بیٹھو میں ابھی اسے بھیجتا ہوں۔

وہ اسے کہہ کر آگے بڑھے۔

لاکھ کوشش کے باوجود انہیں ودعیہ نظر نہیں آرہی تھی۔

وہ رقیہ بیگم کی طرف بڑھے وہ عورتوں میں مصروف گفتگو تھیں۔ رقیہ ذرا بات سننا۔

رقیہ بیگم متوجہ ہوئیں میں ابھی آئی وہ عورتوں سے معذرت کر کے اٹھیں۔

جی وہ ان کے مقابل میں کھڑی ہوئیں بولیں۔

ودعیہ نظر نہیں آرہی تم نے کہیں بھیجا تو نہیں ہے اسے۔

ن ...... ن ...... نہیں میں نے تو اسے نہیں دیکھا ایک دم وہ کچھ گھبرا گئیں۔

وقار صاحب نے بھنویں اچکائیں ان کا لہجہ ان کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ وہ انہیں لے کر غیر محسوس طریقے سے ایک خالی گوشے میں لے آئے۔

ودعیہ کہاں ہے؟ لوگ اس سے ملنا چاہتے ہیں کس کام سے بھیجا ہے تم نے اسے اور کس کے ساتھ۔

وقار صاحب کے تیور دیکھ کر وہ تھوڑی بد حواس ہوئیں۔

وہ ...... میں نے اُسے گھر پر رکنے کو کہا تھا۔ بمشکل الفاظ ادا کیے۔

کیا...... ایک دم چیخے پھر اردگرد نگاہ دوڑا کر آواز مدھم کی، کیا مطلب ہے تمہارا تم اسے گھر چھوڑ آئی ہو۔ ان کے لہجے میں دبا دبا غصہ تھا۔

میں نہیں چاہتی کہ اس کے منحوس قدم آج اس جگہ ہوں اب وہ قدرے سنبھلیں۔

تف ہے تمہاری گھٹیا سوچ پر تم اس معصوم بچی کو خواہ مخواہ بدنام کر رہی ہو۔ اور مجھے اندازہ ہے کہ تم سے یہ کس محترمہ نے کہا ہوگا ان کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

اگر آج میرے بیٹے کی شادی نہ ہوتی ناں تو

میں تمہارا دماغ آج ہی درست کر دیتا اور اس محترمہ کا بھی جس نے تمہارے کان بھرے ہیں وہ کہہ کر چلے گئے۔

ہوں زیادہ ہی چہیتے بنے پھرتے ہیں اس منحوس کے۔ انہوں نے چاروں جانب نظریں دوڑائیں اور اکڑی گردن سے چلتی ہوئی اسٹیج پر پہنچ گئیں۔

نائلہ نے نجانے کتنی محنت سے عالی کو اکیلا پکڑا تھا۔

ارے دولہے کے بھائی کیا ہے آج تو تم نظریں نہیں ملا رہے۔ نائلہ نے مسکرا کر کہا۔ عالی نے اس کے حلیے پر گہری نگاہ ڈالی۔

نیلے رنگ کا سوٹ پہنے بالوں کو کندھوں پر پھیلائے ڈراک میک اپ اور بے تحاشہ جیولری میں وہ اسے بالکل متاثر کن نہیں لگی لہٰذا وہ بنا مرعوب ہوئے بولا۔

ہاں کیونکہ دولہے کے بھائی کو لاکھوں کام ہوتے ہیں۔ لہجہ بے لچک تھا۔ وہ اسے کسی طور پر بڑھاوا نہیں دینا چاہتا تھا۔

عالی یار میری بات سنو۔ وقار صاحب نائلہ کو نظر انداز کر کے عالی کو لے کر ایک طرف ہو گئے۔

وقار صاحب کے چہرے پر پریشانی و غصہ دیکھ کر وہ تشویش سے بولا۔ ابو خیریت ہے ناں کوئی مسئلہ......؟''

انہوں نے ایک نظر اسٹیج پر ڈالی۔ نکاح شروع ہو چکا تھا۔

یار گھر جاؤ اور ودعیہ کو لے کر آؤ۔

ابو ودعیہ گھر پر کیا کر رہی ہے وہ یہی ہوگی۔

نہیں بیٹا وہ یہاں نہیں ہے تمہاری ماں اسے گھر اکیلا چھوڑ آئی ہے نجانے بچی پر کیا بیت رہی ہوگی۔ وہ اس کو اکیلا سوچ کر پریشان ہو گئے۔

What? امی اسے اکیلا چھوڑ آئیں۔ عالی کو رقیہ بیگم سے اس حد تک جانے کی امید نہ تھی۔

ہاں یار جا اور لے آ، مجھے اسٹیج پر جانا ہے ادھر ہونا ضروری ہے میرا۔

مگر ابو نکاح شروع ہو چکا ہے۔ عالی نکاح چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

بیٹا ضروری ہے میں کسی اور کو بھیج دیتا مگر میں بات پھیلانا نہیں چاہتا۔ پردہ پڑا ہے تو پڑا رہنے دو۔

10 منٹ کا فاصلہ ہے بس تم جاؤ۔ وہ اسے چابیاں دیتے ہوئے بولے۔

جی ابو اس کا منہ لٹک گیا ایک ہی بھائی اور اس کا نکاح، وہ سر جھٹک کر بڑھا۔

☆......☆......☆

وہ کمرے سے نکلی مرے مرے قدموں سے نیچے آئی رو رو کر اس کا سر بھاری ہو رہا تھا اور آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔ سنسان گھر تھا۔ گھر میں ہو کا عالم تھا صرف گھڑی کی ٹک ٹک لاؤنج میں سنائی دے رہی تھی۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو تقریباً 10:30 کا ٹائم ہو رہا تھا وہ پہلی دفعہ یوں پورے گھر میں اکیلی تھی۔ اسے خالی گھر میں خوف محسوس ہونے لگا۔

اس نے آہستگی سے قدم بڑھایا۔ صدر دروازے کے ہینڈل کو گھمایا اور اطمینان کیا کہ وہ بند ہے پھر جا کر دُکھتے دل کے ساتھ صوفے پر جا بیٹھی۔ گھر والوں کو گئے تقریباً گھنٹہ ہو گیا تھا اس نے دھیان بٹانے کو T.V آن کیا۔ مگر بری قسمت کہ Cable کی لائٹ بھی گئی ہوئی تھی۔

وہ صوفے پر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگی۔

بہار کی آمد آمد تھی لہٰذا موسم رات میں ٹھنڈا رہتا تھا وہ پاؤں سکیڑ کر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی

تھی۔ ابھی اسے بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ باہر سے کھٹ پھٹ کی آواز آئی اچھل کر اس کا دل حلق میں آ گیا۔ دل کی دھڑکن یک باری تیز ہو گئی۔

باہر کوئی تھا۔ وہ خوف کے مارے اور سکڑ گئی۔ اچانک لائٹ چلی گئی۔ اس کی خوف کے مارے چیخ نکل گئی۔

دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

کو......کون ہے؟ ودعیہ کی ڈری ہوئی آواز آئی۔

ودعیہ کہاں ہو تم میں ہوں عالی۔

عالی بھائی اس نے جیسے تصدیق چاہی۔

ہاں بھئی اور کون وہ چڑ گیا۔

میں لاؤنج میں ہوں۔ اندر گھپ اندھیرا تھا ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

ایمرجنسی لائٹ نہیں ہے کیا وہ وہیں کھڑے کھڑے بولا۔

ہے ڈرائنگ روم میں۔ ودعیہ کی آواز آئی۔

ابھی وہ ہاتھوں سے ٹٹولتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ لائٹ آ گئی۔

شکر خدا کا وہ مڑا اور اندر آیا۔ ودعیہ اسے صوفے کے کونے میں دبکی ملی۔

آنسو اب بھی گال پر تھے۔

چلو اٹھو تیار ہو جاؤ 5 منٹ میں میرے ساتھ چلو۔ وہ اس کے قریب آ کر بولا میں نے نہیں جانا وہ منہ بسور کر بولی۔

دیکھو میرا بحث کا موڈ نہیں ہے بھائی کا نکاح ہو رہا ہے۔ میرا دماغ مت خراب کرو۔ ابو نے کہا تھا تو لینے آیا ہوں اب وقت برباد نہ کرو اور چلو اٹھو۔ وہ انگلی سے تنبیہہ کر کے بولا جبکہ ماتھے پر جال تھا شکنوں کا۔ اس کا ذرا دل نہیں کر رہا تھا مگر عالی کے تیور ٹھیک نہیں تھے سو وہ اٹھ گئی۔ بے دلی سے الماری سے ویسے ہی کپڑے نکال کر پہنے، چٹیا بنائی، سینڈل پہنی اور آ گئی۔

عالی جو پہلے ہی نکاح مس ہونے پر غصہ ہو رہا تھا اس کا حلیہ دیکھ کر اس کا دماغ ہی گھوم گیا۔

کسی سوگ میں نہیں جا رہی ہو تم ڈھنگ سے تیار ہو زیادہ ہی ہمدردیاں سمیٹنے کا شوق ہے تمہیں وہ اس کے حلیے پر چوٹ کر گیا۔

میں تیار ہوں بس، چلیں وہ نیچے اتری۔

عالی نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں وہ آگے بڑھا اس کا بازو پکڑا اور اوپر لے آیا اس کے کمرے میں لا کر اُسے دھکیلا اور غصے سے بولا۔

جلدی سے لیپا تھوپی کرو میرے پاس تمہاری طرح بے کار کا وقت نہیں ہے۔ وہ غصے سے پھٹ پڑا اتنا اہم فنکشن اوپر سے تمہارا نخرہ، وہ ہنکارا۔ ودعیہ بی بی اپنا یہ نخرہ کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو فل وقت تیار ہو اور چلو۔ وہ وہیں کھڑا ہو گیا۔

اس کے عزائم بھانپ کر اس نے جلدی سے ڈبے سے الٹی سیدھی چوڑیاں پہنیں ہلکی سی لپ اسٹک لگائی آنکھوں میں کاجل ڈالا اور ایئر رنگ پہن لیے۔

چلیں وہ دھیمی آواز میں بولی۔

ہوں چلو۔ وہ بھی آگے بڑھ گیا۔

جب وہ ہال میں پہنچے تو نکاح ہو چکا تھا بلکہ شمائلہ بھی اب ولی کے ساتھ اسٹیج پر تھی۔ عالی اسے چھوڑ کر چلا گیا۔

ابھی وہ کھڑی ہی تھی کہ کھانا لگ گیا۔

وہ اندر بڑھی۔ ''ارے ودعیہ تم آ گئیں ایک دم ماموں آ گئے۔

جی وہ سر جھکا گئی۔

بیٹا مجھے معاف کر دو اگر مجھے پہلے پتا ہو

ناں......

رہنے دیں ماموں یہ وقت ان باتوں کا نہیں وہ بات کاٹ گئی۔

ہوں ٹھیک کہہ رہی ہو چلو آؤ وہ اسے لے کر آگے بڑھ گئے رقیہ بیگم کی نظر وقار کے ہمراہ ودیعہ پر پڑی تو حلق تک کڑوا ہو گیا۔

چلو جو بھی ہے یہ منحوس نکاح کے وقت موجود نہیں تھی ساتھ ہی انہیں اطمینان بھی تھا کہ وہ کامیاب رہیں تھیں۔

گھر لوٹ کر وقار صاحب غصے کے مارے سیدھا اپنے کمرے میں چلے گئے اور رقیہ بیگم نئی دلہن کی آمد پر صدقے واری ہو رہی تھیں۔

ساری رسموں وغیرہ سے فارغ ہو کر وہ کمرے میں آئیں انہیں یقین تھا کہ اب تک وہ سو چکے ہوں گے مگر ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کیونکہ وہ غصے سے ٹہل رہے تھے۔

آیئے بیگم صاحبہ۔ وہ طنزاً بولے۔

چند لمحوں کے لیے وہ بدحواس ہوئیں مگر سنبھل گئیں۔

''تم نے جو حرکت آج کی ہے ناں میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا وہ غصے سے بولے۔

میں نے جو کچھ بھی کیا ہے اپنے بیٹے کی بہتری کے لیے کیا ہے۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر چوڑیاں اتارنے لگیں۔

بہتری اسے تم بہتری کہتی ہو یقیناً اس ذکیہ کے کہنے پر ہی تم نے یہ حرکت کی ہوگی۔ ارے اس معصوم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے، آخر ان کی آواز بلند ہو گئی۔

رقیہ بیگم نے نظر اٹھا کر دیکھا مگر بولیں کچھ نہیں۔

اگر گھر میں مہمانوں کا خیال نہ ہوتا ناں تو تمہارا دماغ درست کر کے رکھ دیتا وہ کہہ کر غصے سے باہر نکل گئے۔

رقیہ بیگم نے سکھ کا سانس لیا۔

رات کے تین بجے وہ باہر سے اپنا غصہ ٹھنڈا کر کے آ رہا تھا اسے اپنے اکلوتے بھائی کے نکاح کا فنکشن مس ہونے پر غصہ تھا وہ اپنے کمرے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ ودیعہ اپنے کمرے سے نکلی اس پر نظر پڑتے ہی اس کا غصہ جو برف ہوا تھا پھر سے آگ ہو گیا ہونہہ ابو کی چہیتی اس کا بڑا خیال ہے اسے لینے بھیج دیا۔

اور میم صاحبہ تیار ہونے میں نہیں آ رہیں تھیں۔ وہ بڑبڑاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور چابی سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر کپڑے تبدیل کرنے باتھ روم میں گھس گیا وہ چینج کر کے آیا تو ودیعہ دودھ کا گلاس رکھ کر جا رہی تھی۔

''مجھے نہیں پینا لے جاؤ۔'' وہ غصے سے بستر پر بیٹھ گیا۔

وہ ان سنی کر کے نکلنے لگی کہ وہ پھر شروع ہو گیا۔ آج تمہاری وجہ سے میں نے اپنے بھائی کا نکاح چھوڑا ہے صرف تمہاری وجہ سے۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔

پتا نہیں ابو کو کیا تھا اگر کسی اور کو بھیج دیتے کم از کم اپنے بھائی کے نکاح میں تو شریک ہوتا پر نہیں انہیں تو جیسے شوق ہے مجھ پر تمہیں فوقیت دینے کا۔ وہ پھنکارا۔

غصہ تو ودیعہ کو بھی بہت تھا آج ذکیہ خالہ نے اسے بھری محفل میں ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اوپر سے مامی نے بھی ماموں کا غصہ بھی اسی پر نکالا تھا۔ لہٰذا وہ تیزی سے پلٹی۔

''تو نہیں آتے، میں نے بھی کوئی تار بھیج کر ماموں کو نہیں کہا تھا کہ عالی کو بھیج دیں میں مری

نہیں جا رہی تھی ولی بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے۔ سمجھ کیا رکھا ہے مجھے جسے دیکھو چڑھ دوڑتا ہے مجھ پر وہ غصے سے پھٹ پڑی اور غصے میں اسے بھائی بھی نہیں کہا۔ جبکہ عالی ابھی تک خالی دروازے کو گھور رہا تھا جہاں سے ابھی ابھی وہ نکلی تھی۔

صبح ہوئی تو شمائلہ کے گھر سے ناشتہ لے کر نائلہ اور رضوان آئے ان کے ساتھ ان کی کوئی کزن بھی تھی۔

ودعیہ میز پر جلدی سے ناشتہ لگاؤ دلہن سب کے ساتھ ناشتہ کرے گی۔ مامی نے شمائلہ کی امی کے گھر سے آیا ناشتہ اسے تھماتے ہوئے ہدایات دیں۔

ارے واہ کتنی پیاری لگ رہی ہو۔ نائلہ نے شمائلہ سے گلے ملتے ہوئے کہا۔ ایک ہی رات میں کیا جادو کر دیا ہے ولی بھائی کہ یہ گلاب کی طرح کھل گئی۔ نائلہ نے بے تکلفی سے سب کے دمیان بیٹھے ولی کو چھیڑا۔

وہ بس جھینپ کر مسکرا دیا جبکہ وقار صاحب کی تیوری پر بل پڑے اور شمائلہ تو شرم سے دوہری ہوئی جا رہی تھی۔

عالی کہاں ہے......؟ نائلہ نے شمائلہ کے کان میں چپکے سے پوچھا۔

اوپر ہوگا کمرے میں ابھی نیچے نہیں آیا وہ آہستگی سے بولی۔

تو پھر میں اسے نیچے لاتی ہوں۔ وہ تنک کر بولی اور غیر محسوس طریقے سے سب کے دمیان سے اٹھ گئی۔

عالی کو محسوس ہوا کے کوئی اس کے بالوں کو سہلا رہا ہے پہلے اسے لگا شاید وہم ہے جب تیز خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تو اس نے کسمسا

غزل

ہاں جدائی سہی نہیں جاتی
بن ترے تشنگی نہیں جاتی
اُس سے شعلہ مزاج کے آگے
دل کی حالت ہی نہیں جاتی
جس نے دل پر ہی کرلیا قبضہ
جنگ اُس سے لڑی نہیں جاتی
راحتیں ہیں زمانے بھر کی مگر
اک تمہاری کمی نہیں جاتی
وہ ہمارا ہے ہم کو پیارا ہے
بات ہم سے کہی نہیں جاتی
تیری چاہت یوں بس گئی دل میں
اب بھلائی بھی نہیں جاتی
روٹھ جاتے ہیں مجھ سے گھر والے
کیوں اُداسی کبھی نہیں جاتی
پیار سے اُس کے میں تو ڈرتی ہوں
بے رُخی بھی سہی نہیں جاتی
اُس نے اتنے لگائے ہیں چرکے
پھانس دل میں گڑی ...... نہیں جاتی
یوں شگفتہ تو ہنستی رہتی ہے
چشمِ تر کی نمی نہیں جاتی

(شگفتہ شفیق)

کر آنکھیں کھولیں نائلہ کو اپنے اوپر جھکے پا کر وہ بجلی کی تیزی سے اٹھا۔

تم! اس نے چادر اوپر تک لے لی۔

جی ہم کب سے آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں کہ کب آپ آئیں اور کب ناشتہ کریں۔ وہ دوپٹے کو درست کرتے ہو مسکرا کر بولی۔

جہاں تک میرا خیال ہے تو دلہن کے گھر والے دلہن کے لیے ناشتہ لاتے ہیں نا کہ دلہن

کے دیور کے لیے۔ وہ طنزاً مسکرا کر بولا۔
جی بالکل لاتے ہیں مگر ہم تو خاص آپ کے لیے لائے ہیں۔ ادائیں دل رجھانے عالی تھیں۔
''آپ رہنے دیں بڑی مہربانی میرا ناشتے کا موڈ نہیں اب آپ جاسکتیں ہیں۔ اس نے لال جھنڈی دکھائی اسی وقت ودعیہ نے ناک کیا۔
''آپ کو بلا رہے ہیں نیچے۔'' ودعیہ نے آکر ایک تیز نگاہ ڈالی دونوں پر اور پلٹ گئی۔
''آپ جلدی آیئے آپ کا انتظار رہے گا۔'' وہ کہہ کر اٹھی۔
جبکہ عالی نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔
☆......☆......☆
شادی کے ہنگاموں سے فارغ ہوئی تو اسے خیال آیا کہ دادا جان نے کہا تھا کہ وہ اس سے ملنا چاہتے ہیں ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی تھی۔
آج آئیں گے ناں ماموں تو کہوں گی کہ مجھے چند دن کے لیے دادا کے ہاں جانے دیں وہ سوچ رہی تھی کہ شمائلہ آگئی۔
ودعیہ جلدی کھانا پکاؤ آج ولی جلدی آئیں گے اور ہاں آج سلاد بھی بنانا وہ حکم دے کر چلی گئی۔
مامی کیا کم تھیں اب یہ بیگم صاحبہ بھی روعب ڈالنے لگیں ہیں۔ اس نے بے بسی سے سوچا۔
شام کو اس نے ماموں سے بات کی ہاں بیٹا چلی جانا ایک دو دن میں میں خود تمہیں چھوڑ آؤں گا ٹھیک ہے۔
وہ پچھلے صحن میں آئی تو مشین پر نظر ڈالی وہ کپڑوں سے ابل رہی تھی۔ ''کل مشین بھی لگانی ہے۔'' وہ اکتاہٹ سے بولی اور پلٹ آئی۔
رات کے کھانے پر اکثر ہی ولی اور شمائلہ نہیں ہوتے تھے ان کی دعوتوں کا سلسلہ جاری تھا۔

☆......☆......☆
''امی آپ کدھر ہیں۔'' عالی خوشی سے چلا رہا تھا۔
''کیا ہوا ہے؟'' وہ گھبرائی ہوئی آئیں۔
''امی میں سی ایس ایس کے امتحان میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ میری ساتویں پوزیشن آئی ہے۔'' وہ دیوانہ ہوا جارہا تھا۔
''ارے مبارک ہو بیٹا۔'' انہوں نے خوشی سے ماتھا چوما۔
''اے ودعیہ کدھر ہے تُو گھر میں کچھ ہے کھانے کو، میٹھا تو لا میں اپنے بیٹے کا منہ میٹھا کرواؤں۔'' وہ لاؤنج سے چلائیں۔
وہ پلیٹ میں جلیبیاں لے کر آئی جو کل شمائلہ نے فرمائش کر کے منگوائی تھیں۔ اسے نہ کوئی خوشی تھی نہ دکھ، اسے دراصل عالی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ چپ کر کے پلٹ گئی۔
''ارے کہاں جارہی ہے تُو۔'' وہ اسے جاتا دیکھ کر بولیں آج سب کچھ میرے چندا کی مرضی کا بنے گا سمجھیں۔''
''جی۔'' وہ مختصر کہہ کر چلی گئی۔
''کیا ہوا خالہ بڑی خوش لگ رہی ہیں۔ شمائلہ بھی نیچے آئی۔'' اس کے گیلے کھلے بال بتا رہے تھے کہ وہ ابھی نہا کر آئی ہے۔
''ارے عالی سی۔ ایس۔ ایس میں کامیاب ہوگیا ہے۔'' رقیہ بیگم نے خوشی سے عالی کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔
''ارے واہ مبارک ہو عالی۔'' شمائلہ نے کھلے دل سے مبارکباد دی۔
''Thanks بھابی۔'' وہ مشکور ہوا۔
''بھئی ٹریٹ تو بنتی ہے ہم سب کی۔'' وہ جلیبی کھاتے ہوئے بولیں۔

''ہاں بالکل اتنی بڑی خوشی ہے جب چاہیں تب دوں گا۔'' آج وہ بہت فراخ دل ہورہا تھا۔

''تو پھر ٹھیک ہے ابھی نائلہ اور رضوان کو کہتی ہوں کہ آجائیں پھر شام کو ولی بھی آجائیں گے تو سارے مل کر چلیں گے کہیں۔'' وہ خود ہی پروگرام سیٹ کر کے بولی۔

شام کو ان کے گھر میں خوشی کا سماں بندھا گیا۔ وقار صاحب خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ ولی نے بھی مبارک باد دی اور زکیہ خالہ اور ان کے اہل وعیال بھی تشریف فرما رہے تھے۔ ایک بس ودعیہ ہی تھی جو بالکل سپاٹ چہرہ لیے بس کام کررہی تھی۔

''اے ہے اس منحوس کو دیکھو اتنی خوشی کے ماحول میں کیا رونی صورت لے کر پھر رہی ہے۔'' زکیہ خالہ نے سب کے درمیان بیٹھے تبصرہ کیا۔

اسے کیوں خوشی ہونے لگی، اتنی بڑی بات کی۔ اسے تو بس رنگ میں بھنگ ڈالنا آتا ہے۔'' شمائلہ نے بھی حصہ لیا۔

وہ ٹرے لے کر آئی اور گلاس ٹرے میں رکھنے لگی۔ اس کے انداز واطوار سے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی اور کے بارے میں بات ہورہی ہو۔

عالی نے ایک شاکی نظر ڈالی پھر نائلہ اسے متوجہ کرنے میں کامیاب رہی۔

☆......☆......☆

''ہاں تو برخوردار آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے۔'' وہ صبح نیچے آیا تو وقار صاحب نے پوچھا۔

''ابو کافی فیلڈز ہیں میرے سامنے مگر میرا ارادہ پولیس فورس جوائن کرنے کا ہے۔'' اس نے چائے کا کپ لیا۔

''ہوں زبردست ارادہ ہے۔'' ولی نے تائید کی۔

''مجھے تم پر اور تمہاری سوچ پر فخر ہورہا ہے کہ تم نے ایک بہت بہتر فیلڈ چوائس کی ہے۔''

''مگر یہ کوئی اچھی چیز تو نہیں ہے آئے دن پولیس والے مرتے ہیں اور لوگوں میں بھی وہ اتنے ہی بدنام ہیں۔

تم رہنے دو اسے، کچھ اور کرلو۔'' رقیہ بیگم کو اس کا فیصلہ کچھ خاص پسند نہ آیا۔

''امی کیسی بات کررہی ہیں پولیس تو لوگوں کی جان ومال کی محافظ ہوتی ہے۔ معاشرے کو گندگی سے پاک کرنے کی ضامن اور آئے دن جو پولیس والے اپنی قیمتی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں اسی وجہ سے عام آدمی سکون سے رہ رہا ہے۔'' وہ تحمل سے بولا۔

وقار صاحب نے ایک بھرپور فخر کی نگاہ اپنے لختِ جگر پر ڈالی۔

ولی نے بھی کندھا تھپتھپا کر داد دی جبکہ ٹیبل پر چائے رکھتی ودعیہ نے اسے دیکھا جیسے یقین نہ ہو کہ ابھی چند ثانیے پہلے ادا ہونے والے الفاظ عالی کے منہ سے نکلے ہیں۔

''ہاں اور کیا خالہ اچھی بھلی نوکری ہوتی ہے پولیس کی اور اوپر کی کمائی الگ موج ہی موج ہے۔'' شمائلہ نے اپنی سوچ کے مطابق بات کی۔

وقار صاحب نے ایک تاسف بھری نگاہ ڈالی جبکہ ولی باپ کی نگاہ بھانپ کر شرمندہ ہوگیا، ودعیہ کی ہنسی نکل گئی اسے چھپانے کے لیے وہ تیزی سے کچن کی طرف بڑھی۔

''بیٹا اب تم آگئی ہو تو تم بھی ودعیہ کے ساتھ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹایا کرو۔ اب تمہاری امی سے زیادہ کام نہیں ہوتا ٹھیک ہے۔'' وقار صاحب نے بات پلٹی۔ وہ کچھ دنوں سے نوٹ کر

رہے تھے کہ شمائلہ بی بی بیٹھ کر کھانے والوں میں سے تھیں اور اس بیچاری بچی پر ایک اور بوجھ ڈل گیا تھا۔

''جی خالو کیوں نہیں۔'' اس نے مصنوعی مسکراہٹ لبوں پر سجائی جبکہ چائے کا گھونٹ اسے کڑوا محسوس ہوا۔

☆......☆......☆

''ودعیہ، ودعیہ بیٹا ماموں آج آفس سے جلدی آ گئے تھے اور آتے ہی اسے پکارنے لگے، وہ ابھی کام سے فارغ ہو کر کمرے میں آئی تھی سو دوبارہ نیچے دوڑی۔

''جی ماموں۔'' وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتی آئی۔

''بیٹا ایک بری خبر ہے تمہارے لیے۔'' انہوں نے کہا۔

''کیا ہوا ماموں۔'' وہ پریشان ہوئی۔

''بیٹا تمہارے دادا کا انتقال ہو گیا ہے۔ مجھے تمہارے چاچا کا فون آیا تھا شاید گھر کا فون خراب ہے اس لیے۔''

ودعیہ کو شاکڈ لگا ابھی اسے دادا سے ملے وقت ہی کتنا ہوا تھا شاید چند مہینے اور یہ رشتہ بھی خدا نے چھین لیا۔

''حوصلہ کرو بیٹا۔'' ماموں نے سر پر ہاتھ رکھا۔

''چلو تیار ہو جاؤ ہمیں چلنا ہے۔'' انہوں نے کہا۔

وہ مردہ قدموں سے لوٹی۔

''کیا ہوا ہے وقار آپ جلدی آ گئے ہیں آج آفس سے۔'' رقیہ بیگم کمرے سے نکلیں شاید وہ سو رہی تھیں۔

''ہاں وہ ودعیہ کے دادا کا انتقال ہو گیا ہے۔'' انہوں نے کہا اور کمرے میں گئے۔

''اوہ...... یہ تو ہونا ہی تھا۔ ودعیہ نے جوان کی زندگی میں قدم رکھا تھا۔ آخر کو منحوس قدم عالی تو ہے وہ۔'' وہ کہہ کر دوبارہ کمرے میں چلی گئیں۔

دادا کے گھر کا فاصلہ تقریباً دو گھنٹے کا تھا ان کا گھر شہر سے باہر تھا۔ یہ کوئی گاؤں تھا اسے معلوم نہیں تھا کہ کون سا ہے۔ وہ وقفے وقفے سے آنسو صاف کر رہی تھی۔

وہاں پہنچی تو جنازہ لے جایا جا چکا تھا۔ گھر میں خواتین تھیں۔ وہ کسی کو بھی نہیں جانتی تھیں۔

ایک ادھیڑ عمر عورت ان کی طرف آئی۔

''توں خالد دی کڑی ایں۔'' وہ پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی شاید۔

''ہوں۔'' اس نے سر ہلا دیا۔

''ہائے بچی ابا تینوں کنا یاد کردے پئے سی۔'' وہ اسے گلے لگا کر بولی تو وہ دادا سے نہ ملنے پر اور بھی دکھی ہو گئی۔

جب رو رو کر دونوں کا دل ہلکا ہوا تو انہوں نے تعارف کروایا۔

''میں تیری تائی آں چل آ تینوں ملاواں سب نالوں۔ وہ لے کر اسے دوسرے کمرے میں آئیں۔ اسے دیکھتے ہی سب متوجہ ہو گئے۔ اس کی لیے ساری شکلیں یکسر اجنبی تھیں۔ وہ صرف حیران نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''اے خالد دی کڑی اے۔'' تائی نے بلند آواز میں سب سے اس کا تعارف کروایا۔ سب ہی کی نظروں میں حیرانی تھی۔ سارے اسے پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ تائی اسے لے کر بڑھیں اور سب سے ملوایا۔

آج پہلی بار وہ اپنے ددھیال سے ملی تھی۔

اس کے دو تایا تھے اور ایک چاچا تھا۔ سب ہی شادی شدہ تھے بلکہ دونوں تایا اور دادا، نانا بھی تھے جبکہ چاچا کے بچے بھی شادی شدہ تھے اس کی صرف دو پھوپیاں تھیں۔ وہ بھی دادی، نانی بن چکی تھیں۔

اس کی تائی کے علاوہ اسے کوئی بھی ٹھیک طرح نہ ملا۔ اسے عجیب حیرانی ہوئی حالانکہ انہیں تو زیادہ خوش ہونا چاہیے تھا کہ وہ ان کے بھائی کی آخری نشانی تھی مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ تھا البتہ پھوپھیوں نے پھر ٹھیک منہ بات کر لی مگر دوسری تائی، چاچی نے سلام کا بس جواب ہی دیا تھا اور بس تایا اور چاچا کا بھی یہی حال تھا اور ان کے بچوں کا بھی۔

واپسی پر وہ اور بھی نڈھال ہوگئی۔

ماموں کو بھی وہاں کے لوگوں کے رویوں کی کچھ سمجھ نہیں آئی عجیب سرد مہری تھی ان کے رویوں میں۔

☆......☆......☆

عالی نے پولیس فورس جوائن کر لی تھی۔ وہ چونکہ سی ایس ایس کر کے آیا تھا لہٰذا اسے سیدھا A.S.P بنایا گیا تھا۔

آج اس کا پہلا دن تھا وہ بہت پُر جوش تھا اور خوب تیار ہو کر آیا تھا۔

دادا کو گزرے 10 دن ہونے کو آئے تھے مگر اس کا غم ابھی بھی تازہ تھا اس کے پاس پیار کے رشتے تھے ہی کتنے محض چند رشتے اس کے پاس اس میں بھی کمی ہوتی جا رہی تھی۔

وہ چونکہ لیٹ اٹھی تھی لہٰذا وہ چائے کا کپ لے کر کچن سے نکلی تھی کہ نظر عالی پر پڑی جو یونیفارم کے کفوں کو بند کرتے ہوئے اتر رہا تھا۔ چہرے پر فکریہ مسکراہٹ تھی جیسے مقصد پا لینے کے بعد ہوتی ہے۔

آج اس کا موڈ ضرورت سے زیادہ خوش گوار تھا۔

ودعیہ لاشعوری طور پر کھڑے ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ بھی غیر معمولی طور پر اسے دیکھ کر مسکرایا چند قدموں کا فاصلہ جو دونوں کے درمیان تھا اسے عالی نے عبور کیا اور اس کے مقابل آ کر کھڑا ہو گیا۔

''آج اس یونیفارم میں اچھا لگ رہا ہوں ناں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

6 فٹ سے نکلتا قد، کشادہ سینہ، روشنی سے بھرپور آنکھیں، وہ واقعی اس وردی کے قابل لگ رہا تھا۔

''ہوں اچھے لگ رہے ہیں۔'' وہ یونہی لاشعوری طور پر ایک تفصیلی نظر ڈال کر بولی۔

''Thanks'' وہ کہہ کر نکل گیا۔

وہ یک دم چونکی۔ Thanks کیوں کہہ رہے تھے۔ عالی بھائی۔ کیا میں نے انہیں کچھ کہا ہے۔' وہ خود سے سوال کر کے بولی۔ ''میں تو چپ تھی۔'' وہ بڑبڑائی پھر شانے اچکا کر نکل گئی۔

''خالو آپ سے ملنے کوئی وکیل آئے ہیں۔'' شمائلہ نے کمرے میں جھانک کر کہا۔

''وکیل؟ کون سے میں نے تو کبھی کسی وکیل سے علیک سلیک نہیں رکھی ہے پھر۔''

''چلو میں آ رہا ہوں۔'' وہ اس سے کہہ کر نکلے۔

''وقار صاحب!'' سامنے بیٹھا شخص ایک دم کھڑا ہو گیا۔ شاید وہ مطلوبہ شخص کو جان لینا چاہتا تھا۔

''جی میں ہی وقار ہوں۔'' انہوں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''میں سکندر صاحب کا وکیل ہوں۔''اس نے تعارف کروایا۔
''اوہ!''انہوں نے لفظ کھینچ کر ادا کیا۔
''کہیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''
''کیا ودعیہ خالد آپ کے پاس ہے؟''اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔
''جی!''جواب مختصر تھا۔
''دراصل میں سکندر حیات کی وصیت کے مطابق ودعیہ کا حصہ جو کہ ان کے والد کا تھا اب ان کا ہوا ہے اسی کے سلسلے میں آیا ہوں۔''
اتنے میں شمائلہ چائے لے آئی، جیسے ہی اس کے کانوں میں حصہ عالی بات پڑی اس کے کان کھڑے ہوگئے بظاہر وہ چائے سرو کر کے نکل گئی لیکن باہر دروازے کی اوٹ سے سن گن لینے لگی۔
''سکندر صاحب نے اپنی گاؤں کی ساری جائیداد اپنے بیٹوں اور بیٹیوں میں تقسیم کر دی ہے۔
ان کی جائیداد کا ایک چھوٹا حصہ، چند ایکڑ زمین جو ہے وہ یہیں شہر کے پاس ہے۔''وہ انہوں نے ودعیہ کے نام کر دی تھی۔
''ٹھیک ہے اس سلسلے میں میں کیا کر سکتا ہوں؟''وقار صاحب تحمل سے بولے۔
''دیکھیے وقار صاحب میں نے سکندر صاحب کی وصیت کے مطابق ان کے تمام حصے ان کی اولاد میں تقسیم کر دیے ہیں اور یہ فائل...... اس میں ودعیہ کا حصہ ہے۔''انہوں نے فائل وقار صاحب کی طرف بڑھائی۔
''دراصل......''وہ ٹھہرے۔
''جی کیا کوئی پریشانی ہے۔''وقار صاحب کو پہلی بار تشویش ہوئی جبکہ باہر کھڑی شمائلہ کا سارا وجود کان بن گیا تھا۔
جی ابھی ودعیہ کنواری ہے لہٰذا ساری زمین اسی کے پاس رہے گی جہاں وہ زمین ہے وہاں قریب ہی ایک پرائیویٹ ایئر پورٹ بن گیا ہے جس سے اس کی قیمت لاکھوں میں ہوگئی ہے اور بہت جلد وہ کروڑوں میں بھی ہو سکتی ہے۔''وہ آہستہ آہستہ مدعا بیان کر رہے تھے۔ جبکہ وقار صاحب بڑے غور سے سن رہے تھے۔
''یہ بات سکندر صاحب کی اولاد کو کھٹک رہی ہے چونکہ ان کے حصے میں جو زمین آئی ہے اس کی قیمت اس زمین کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔ وصیت کے مطابق اگر ودعیہ خدانخواستہ کنوارے ہوتے مر جاتی ہے تو وہ زمین بیچ دی جائے گی اور تمام رقم تمام اولاد میں یکسر تقسیم ہوگی۔ اور اگر ودعیہ کی شادی ہو جاتی ہے تو پھر اس زمین پر اس کے شوہر کا حق ہوگا۔ میں آپ سے یہ ہی کہنا چاہتا ہوں کہ آپ ودعیہ کا خیال زیادہ رکھیں۔ آپ مجھے کافی سمجھدار انسان معلوم ہوتے ہیں صورتحال آپ کے سامنے ہے۔''انہوں نے اشارتاً کہا۔
''جی بڑی مہربانی آپ کی۔
آپ نے خود آ کر تمام صورتحال سے آگاہ کیا۔ ویسے اس کے ددھیال سے ہمیں کوئی ایسا خطرہ محسوس نہیں ہوا۔ مجھے امید ہے کہ یہ ایک وقتی جذبہ ہوگا۔ انہوں نے اتنے سالوں سے اس کا نہیں پوچھا اور شاید ابھی بھول گئے ہیں۔ آگے خدا کی ذات بہتر کرے گی۔''وہ واقعی وکیل صاحب کے مشکور تھے جبکہ باہر کھڑی شمائلہ کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ یہ چوہیا لاکھوں کی جائیداد کی وارث ہے۔''اسکا دماغ تیزی سے تانے بانے بننے لگا۔
(اس دلچسپ ناولٹ کی اگلی قسط پڑھنا مت بھولیے گا)

رنگ کائنات

ڈاکٹر اقبال ہاشمانی

یہ دل کا معاملہ ہے

کچھ لوگ دل کے معاملے میں حد درجہ لاپروا ہوتے ہیں۔ دل کو ناکارہ شے سمجھ کر ادھر اُدھر پھینک دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو دل پھینک کہا جاتا ہے۔ جہاں کوئی اچھی صورت نظر آئی یہ فوراً اپنا دل نکال کر اس کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں۔ اب اگر......

مغربی ممالک کے سائنس دان بھی خوب ہیں۔ ایجادات تو کرتے ہیں ساتھ ہی ہوش ربا تحقیقات کرکے دنیا کو حیران و پریشان کردیتے ہیں۔ ہر ہفتے ڈیڑھ ہفتے کے بعد کسی نہ کسی محقق کے پیٹ میں مروڑ سی اٹھتی ہے اور ایک عدد خوفناک قسم کی تحقیق منظر عام پر آجاتی ہے۔ زیست جو یوں بھی مشکل ہے مشکل ترین جاتی ہے۔ کبھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ایک کھرب سال بعد دنیا مردوں سے خالی ہوجائے گی۔ پورے کرہ ارض پر مرد ذات دیکھنے کو نہیں ملے گی۔ ہر طرف عورت راج ہوگا۔ زن، زر، زمین فتنے کی جڑ سہی، دنیا میں موجود رہیں گی۔ مگر فتنہ جو مرد کا خاتمہ ہوجائے گا۔ دنیا میں ہر طرف امن ہوگا۔ عورتیں نہ زر کے لیے لڑیں گی اور نہ زمین ان کے لیے وجہ فساد بنے گی۔ یوں ثابت ہوجائے گا کہ دنیا میں فساد کی اصل جڑ مرد تھے۔

کبھی یہ طلسماتی تحقیق سامنے آتی ہے کہ عنقریب فلاں دُم دار سیارہ، دم لہراتا ہوا زمین کے قریب سے گزرے گا۔ زمین کے قریب آکر وہ اسے ایک زوردار دم رسید کرے گا اور آناً فاناً زمین کا خاتمہ ہوجائے گا۔ تحقیق کے سامنے آتے ہی دنیا کے تمام قنوطیت پسند لوگوں میں گھبراہٹ کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ مگر وہ دُم دار ستارہ، بے چارہ اپنی دم کو لہراتا ہوا زمین کے پاس سے گزر جاتا ہے اور کچھ نہیں ہوتا۔

یہ ''دم ہلاکر'' ابھی ابھی، جو سامنے سے گزر گئے وہ میرے ہی شہر کے لوگ تھے، مرے گھر سے گھر تھا ملا ہوا

بھئی میں تو سیدھی سی بات جانتا ہوں کہ اس قسم کی تحقیقات صرف اس لیے سامنے لائی جاتی ہیں کہ میرے جیسے مزاح لکھنے والوں کو خام مواد مہیا ہوسکے۔ مزاح نگار اس پر خوب جی بھر کر لکھ کر داد حاصل کرسکیں۔

اب دیکھیے ناں حال ہی میں ایک نئی تحقیق سامنے آئی ہے کہ خواتین کے دل مرد حضرات کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہوتے ہیں اور ستر سال کی عمر تک برابر کام کرتے رہتے ہیں۔ خواتین کی عمر زیادہ ہونے کی ایک خاص وجہ ان کا مضبوط اور توانا دل ہوتا ہے۔

میں خود عرصہ دراز تک اس اُلجھن میں پڑا رہا کہ ہمیشہ عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہی رہتی ہے۔ جب بھی معاشرے پر نظر دوڑائی ہمیشہ بیواؤں کی تعداد زیادہ نظر آئی۔ اپنے طور پر میں نے بہت سارے مفروضے بھی گھڑے کہ شاید عورتوں کی عمریں اسی لیے زیادہ ہوتی ہیں کہ انہیں نہ فکر معاش ہوتی ہے اور نہ یہ میدانِ جنگ میں جاتی ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ بس ہانڈی چولہا کرتی ہیں، نہ دفتر کی فکر نہ روزگار کی پریشانی، مرد تو بے چارے صبح سے شام تک تفکرات میں گھرے رہتے ہیں۔ دفتر میں نوکر ہیں تو 'باس' کی جھڑکیاں سننی پڑتی ہیں۔ شام کو گھر لوٹتے ہیں تو بیگم کی ڈانٹ برداشت کرنی پڑتی ہے۔ گھر میں بیگم کے ناز نخرے اٹھانے پڑتے ہیں اور گھر سے باہر ہیں تو کسی نہ کسی اور خاتون کے پیچھے خوار ہونا پڑتا ہے۔

خواتین کا کیا ہے، صبح سویرے شوہر کو ناشتہ کروا کے روانہ کیا، کہ خس کم جہاں پاک، جلدی جلدی کھانا پکا کر مزے سے فارغ ہو جاتی ہیں۔ اب صاحب فراغت ہی فراغت ہے۔ یا کوئی رسالہ پڑھا جا رہا ہے یا فون پر گپ شپ ہوتی ہے۔ موڈ ذرا اچھا ہوا تو پڑوسن کو آواز دے کر کہتی ہیں۔

''آ بہن پڑوسن ذرا جھگڑا کریں۔'' اِدھر وہ دوسری پڑوسن بھی اس نیک کام کے لیے گویا تیار ہی ہوتی ہے۔ لیجیے صاحب، جھگڑا شروع، اب ایسی ایسی گالیاں ایجاد ہوتی ہیں کہ اگر مرد حضرات سن لیں تو مارے شرم کے برقع اوڑھ لیں۔ اکثر و بیشتر ان جھگڑوں کی تان بھی بے چارے مردوں پر ہی ٹوٹتی ہے۔ دو پڑوسنیں آپس میں جھگڑا کر رہی تھیں۔ پہلے تو ایک دوسرے کے خاندان میں بھانت بھانت کے کیڑے نکالتی رہیں۔ اس پر بھی بس نہ چلا تو ایک دوسرے کو عجیب و غریب بیماریوں میں مبتلا ہونے کی نوید دیتی رہیں۔ اسی اثناء میں گلی سے بوڑھے اور نابینا حافظ جی کا گزر ہوا۔ ایک پڑوسن نے دوسری پڑوسن سے کہا۔

''اللہ کرے تیری شادی حافظ جی سے ہو جائے۔''

دوسری نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''ائے ہے، میری کیوں ہو؟ اللہ کرے تُو رانڈ ہو جائے اور تیرا بیاہ حافظ جی سے ہو جائے۔''

حافظ جی اپنا نام سن کر چونکے اور وہیں کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر تک پڑوسنیں ایک دوسرے کو حافظ جی کے سر مونڈھنے کی سر توڑ کوششیں کرتی رہیں۔ پھر جیسا کہ ان کی عادت ہوتی ہے۔ لڑائی کو بھول بھال کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں۔ یہ خواتین کا خاص وصف ہے۔ ابھی جھگڑا چل رہا ہے اور ابھی دوستی ہے۔ گھڑی میں رتی گھڑی میں ماشہ، یہ تو ہم مردوں ہی کا ہی دل گردہ ہے کہ برسوں اپنی دشمنیاں نبھاتے ہیں۔ خیر بات ہو رہی تھی، حافظ جی کی کہ وہ گلی میں کھڑے تھے اور پڑوسنوں کی بات سن رہے تھے۔ آخر تھک ہار کر آواز لگائی۔

''بیبیوں، حافظ جی کے لیے کیا حکم ہے؟ کھڑا رہوں یا چلا جاؤں؟''

قصور مرد حضرات کا بھی ہے کہ دل کی قدر نہیں کرتے۔ بعض حضرات اس قدر نازک مزاج ہوتے ہیں کہ ہر بات دل پر لے لیتے ہیں۔ کوئی کچھ کہہ دے یہ فوراً برا مان جاتے ہیں۔ بلکہ کچھ تو ایسے بھی ہوتے ہیں کہ انہیں کچھ بھی نہ کہا جائے تب بھی دل پر لے لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر وقت منہ بسورتے رہتے ہیں۔ ہر وقت دنیا سے شاکی رہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ قنوطیت اس قدر بڑھتی ہے کہ شاعری کرنے لگتے ہیں۔

کچھ لوگ دل کے معاملے میں حد درجہ لاپروا ہوتے ہیں۔ دل کو ناکارہ شے سمجھ کر اِدھر اُدھر پھینک دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو دل پھینک کہا جاتا ہے۔ جہاں کوئی اچھی صورت نظر آئی یہ فوراً اپنا دل نکال کر اس کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں۔ اب اگر وہ قدموں تلے روند ڈالا جائے تو ان کی بلا سے، بس انہیں تو دل پھینکنے سے مطلب ہوتا ہے۔ بعض حضرات اس معاملے میں اس قدر پھرتیلے ہوتے ہیں کہ نہ شکل دیکھی نہ صورت، نقاب پوش بڑھیا کے سامنے بھی دل پھینک دیتے ہیں۔ ہوش اس وقت آتا ہے جب بڑی بی رُخِ بوسیدہ سے نقاب ہٹا کر ان کی طرف جھپٹتی ہیں۔

منچلے نوجوان گرلز کالجز کے آگے قطار در قطار دھوپ میں محض اس لیے کھڑے رہتے ہیں کہ وہ اپنے دل کالج سے برآمد ہونے والی نوخیز حسیناؤں کے سپرد کرسکیں۔ بلا طلب اور بلا اجازت ملنے والے یہ دل اکثر ٹھکرا دیے جاتے ہیں۔ جو یہ نوجوان واپس اپنے پاس رکھ لیتے ہیں کہ تُو نہ سہی اور سہی کہ اگلی بار نہیں اور کوشش کی جائے گی۔ کبھی کبھار یہ دل قبول بھی کر لیے جاتے ہیں کہ چلو، مال اچھا ہے، کچھ دنوں رکھ لینے میں کوئی ہرج نہیں، بار بار جن نوجوانوں کے دل ٹھکرا دیے جاتے ہیں وہ دل برداشتہ ہوکر جعلی عاملوں اور پیروں کے آستانوں پر حاضری دینے لگتے ہیں۔ یہ عامل لوگ کہ جن کا دعویٰ ہوتا ہے کہ سنگ دل محبوب کو پکڑ کر آپ کے قدموں میں ڈال دیں گے۔ ان نوجوانوں سے خوب روپیہ بٹورتے ہیں۔ مگر بلی کے بھاگوں چھینکا کب ٹوٹتا ہے۔

اگر ان تعویذات سے ہی کام نکل سکتا ہوتا تو بھلا کسی کو کچھ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کافی رقم خرچ کرنے کے باوجود بھی جب سنگ دل محبوب قدموں میں ایڑیاں رگڑتا نظر نہیں آتا تو ان بے چارے عاشقوں کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا ہے۔ بعض محبوب تو اس قدر سنگ دل ہوتے ہیں کہ عاشق کا دل لے کر کباب فروش کی دکان پر جا کر اس کا باربی کیو بنواتے ہیں۔ اس لیے فلمی شاعر روتے ہوئے عرض کرتا ہے۔

دل تجھے دیا تھا رکھنے کو
تو نے دل کو جلا کے رکھ دیا

کچھ مرد حضرات زیادہ سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ دل اسی وقت دیتے ہیں، جب سامنے بھی دل دیے جانے کا قوی امکان ہو۔ اس طرح بیلنس شیٹ متوازن رہتی ہے۔ یعنی جتنا ڈیبٹ ہوا اتنا ہی کریڈٹ ہوا۔ گویا عاشقی نہ ہوئی، دکانداری ہوئی۔ یہ تو اچھا ہے کہ یہ لوگ باقاعدہ اشتہار نہیں دیتے کہ ایک عدد دل، بے حد مضبوط، صدمہ پروف اور غیر استعمال شدہ فوری قبضے کے ساتھ، زندگی بھر کی گارنٹی کے ساتھ حاضر ہے۔ دل کے بدلے دل لیجیے، یہ پیش کش محدود مدت کے لیے ہے۔ پہلے آیئے پہلے پایئے کی بنیاد پر، آزمائش شرط ہے وغیرہ......

مگر مسئلہ یہ ہے کہ اکثر خواتین کو مرد حضرات کی اس چال کا علم ہوتا ہے کہ مرد حضرات اس بہانے اپنا کمزور دل دے کر ان کا مضبوط دل ہتھیانے کے چکر میں ہیں۔ اس لیے وہ ان لوگوں کو گھاس تک نہیں ڈالتیں۔ خواتین محتاط رویہ رکھتی ہیں۔ صرف حال پر ہی نہیں، مستقبل پر بھی گہری نظر رکھتی ہیں۔ تفتیش کر کے ہی ان حضرات کا دل قبول کرتی ہیں جن کا بینک بیلنس معقول ہو۔ بندہ چاہے معقول نہ ہو، کوئی پروا نہیں۔ بعد میں 'میڈاں سائیں' جیسی معرکتہ الآرا کتاب لکھنے کی گنجائش رہتی ہے۔ ویسے بھی وہ زمانے لد گئے کہ

جب یہ بھولی بھالی خواتین تہنیتی کارڈز اور عید کارڈز سے خوش ہوجایا کرتی تھیں۔ اب تو وہ کریڈٹ کارڈ اور اے ٹی ایم کارڈز کو دیکھ کر ہی مردحضرات کو دل سے قبول کرتی ہیں۔

ایک بائیس سالہ دوشیزہ نے جب ایک ساٹھ سالہ مرد سے شادی کی تو اس کی سہیلیوں نے حیرت سے پوچھا۔

''تم نے اتنی زیادہ عمر کے آدمی سے شادی کیوں کی؟''

دوشیزہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ایک تو ان کے دن کم، دوسری ان کی اِن کم۔''

یہ فارمولا صحیح بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی کہ کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی دوشیزہ کسی بوڑھے سے شادی کرلے اور اس کے مرنے کی حسرت دل میں لیے خود اس جہانِ فانی کو خیر باد کہہ دے۔ یہ سائنسی تحقیقات ایسی ہی ہوا کرتی ہیں۔ آپ یقین کریں کہ اس پہلی والی تحقیق کہ عورتوں کے مقابلے میں مردوں کے دل کمزور ہوتے ہیں کہ کچھ ہی دنوں بعد میری نظر سے ایک اور تحقیق گزری کہ جس میں دعویٰ کیا گیا کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کو دل کی بیماریاں زیادہ ہوتی ہیں۔ حالیہ سروے کے مطابق مردوں کے مقابلے میں عورتوں کو دل کا دورہ زیادہ پڑتا ہے۔

اس نئی تحقیق کے بعد سچ پوچھیے تو میں بھی چکرا کر رہ گیا کہ اب کروں تو کیا کروں؟ پہلی تحقیق کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے جو صفحے کالے کیے ہیں، ان کا کیا ہوگا؟ پہلے تو سوچا کہ ساری محنت پر پانی پھیر کر اس تحریر کو تلف کردیا جائے۔ لیکن دل نے گوارہ نہ کیا کہ قدم میدان میں رکھ کر واپس پلٹا جائے۔ پھر دماغ میں خیال آیا کہ ویسے بھی میں نے کون سی عالمانہ تحریر لکھی ہے کہ ہم پیشہ ڈاکٹر حضرات کی تنقید برداشت کرنی پڑے گی۔

صرف مزاح ہی لکھا ہے۔ مزاح نگار کیا کچھ گل نہیں کھلاتے۔ ویسے بھی مزاح نگار کو یہ سہولت حاصل ہے کہ اگر وہ غلطی بھی کر جائیں تو لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ موصوف نے مذاق میں ایسا کہا ہے، اُلٹی واہ واہ ہوتی ہے۔

ویسے دیکھا جائے تو مغربی محقق بھی اپنی فطرت میں مزاح نگاری کا عنصر لکھتے ہیں۔ چھپے رستم ہوتے ہیں۔ تحقیق کے نام پر ایسی مزاحیہ باتیں کہہ جاتے ہیں کہ پڑھنے والا جھوم اٹھتا ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ اسپغول قبض کے لیے بہترین ہے۔ مغربی لال بجھکڑ اب اعلان کررہے ہیں کہ جی اسپغول قبض کشا ہے۔ صرف قبض کشا ہی نہیں شریانوں میں جمی چکنائی کے لیے بھی مفید ہے۔ معدے کے زخم یعنی السر اور دستوں کے لیے کیلا مفید ہے۔ اہلِ مشرق یہ بات صدیوں سے جانتے ہیں۔ سائنس دان لاکھوں ڈالرز تحقیق میں صرف کرکے اب بتا رہے ہیں کہ کیلا السر کے لیے مفید ہے۔ جہاں تک مردحضرات کے دل کی بات ہے تو حکیموں اور ویدوں کو چھوڑیں مشرق دانشور تک اس بات کے قائل رہے ہے کہ بے چارے مردحضرات کا دل انتہائی کمزور ہوتا ہے کہ اس پر (Fragile, Handle With Care) کا اسٹیکر لگایا جانا چاہیے۔ دانشوروں کو بھی رہنے دیں کہ عقلمند ہوتے ہیں۔ فلمی شاعر تک اس بات کا برملا اظہار کرتے ہیں کہ مردحضرات کا دل بے حد نازک اور کمزور ہوتا ہے۔ ہنسنے سے بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ مثلاً شاعر کہتا ہے۔

ہونٹوں پہ آ بھی جائے ہنسی کیا مجال ہے
یہ دل کا معاملہ ہے، کوئی دل لگی نہیں

☆☆......☆☆

منی اسکرین

اے آر وائی کے خوبصورت پروگرام

قارئین گرامی اچھی امید پر دنیا سلامت ہے مگر ہماری ہزاروں خواہشیں ایسی ہیں کہ ہر خواہش پر دم نکلے کامیابی اور ناکامی زندگی کا حصہ ہوتی ہیں۔ مگر جو لوگ محنت کرتے ہیں وہ رب کو اپنے بہت قریب محسوس کرتے ہیں اور جھوٹ کی اونچی دیواروں کو اپنے مضبوط ارادوں سے گرا کر

ARY ڈیجیٹل کے پروگرام ''دل پذیر شو'' میں حنا دل پذیر

دم لیتے ہیں اور پھر اس طرح وہ سچائی کو اُجاگر کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ ARY ڈیجیٹل اور ARY زندگی کے پروگراموں نے ہمیں ہمیشہ سرخرو کیا ہے ابھی سچائی زندہ ہے اور سچ بھی زندہ ہے۔ ARY کے پروگراموں کو دیکھنے والے ناظرین ہمارے لیے بہت معتبر ہیں۔ جو ہمارے پروگرام دیکھنے کے بعد ہماری محنت کو ایک شفاف آئینے کی طرح دیکھتے ہیں۔ دن رات محنت کر کے اپنے ناظرین کے لیے خوبصورت پروگرام تخلیق کرتے ہیں ہماری دعا ہے کہ یہ سال ہمارے ناظرین کے لیے کامیابیاں، شادمانیاں اپنے دامن میں سمیٹ کر لائے آمین۔ ہم ناظرین کے لیے نئے نئے منصوبے بناتے ہیں جن سے ہماری ترجیحات بدل جاتی ہیں اور ہم آپ کی خوشی کی خاطر ایک نئے جذبے کے تحت پھر کام پر جت جاتے ہیں۔ آیئے ناظرین گرامی اب چلتے ہیں خوبصورت پروگراموں کی طرف جس کے آپ منتظر ہیں ARY ڈیجیٹل سے پیش کیے جانے والا پروگرام جیتو پاکستان جس کے رہبر فہد مصطفیٰ ہیں یہ پروگرام دیگر چینلو کے مقابلے میں نمبر 1 کی دوڑ میں شامل ہے۔ فہد مصطفیٰ کی خوبصورت باتوں نے اس پروگرام کو چار چاند لگا دیے ہیں ایک کثیر حلقہ اس پروگرام سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ یہ پروگرام ہر جمعہ اور اتوار کی رات 7:30 بجے ہدایت کار کامران خان پیش کرتے ہیں۔

ARY ڈیجیٹل سے پیش ہونے والا مارننگ شو جس کی میزبان ندا یاسر ہیں کامیابی کی روایات

کو برقرار رکھا ہے اس پروگرام کے پرستاروں کی تعداد لاکھوں میں ہے یہ پروگرام پیر سے لیکر جمعہ تک ہر صبح 9 بجے پیش کیا جاتا ہے۔ مزاحیہ کھیل 'بلبلے' نے لوگوں کے دل جیت لیے ہیں۔ حنا دل

ARY زندگی کے سوپ ''بے گناہ'' میں عالیہ علی اور دیا مغل
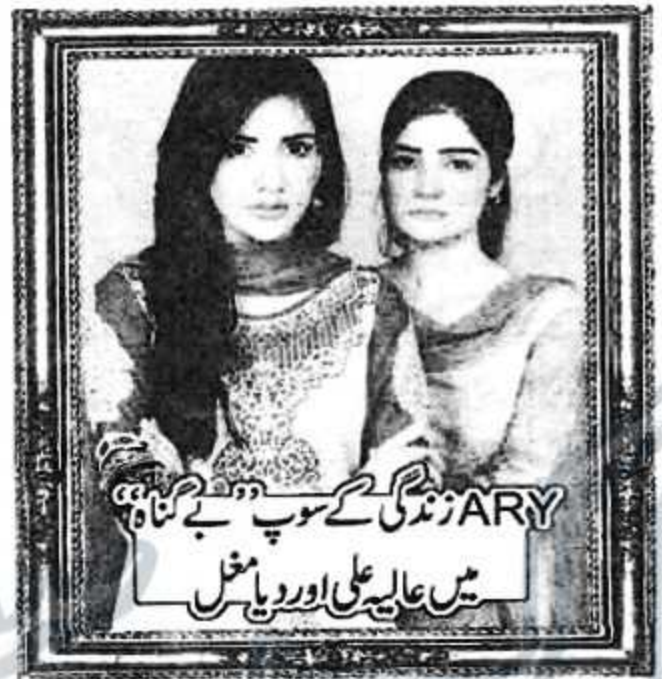
پذیرے نے اس پروگرام میں اپنی شخصیت کو منوالیا ہے۔ یہ مزاحیہ کھیل ہر اتوار کی رات 7 بجے پیش کیا جارہا ہے اور پھر حنا دل پذیرے نے 'دل پذیر شو' میں کام کرکے اپنے چاہنے والوں کا ایک وسیع حلقہ بنالیا ہے یہ شو اتوار کی شام 5:30 بجے پیش کیا جارہا ہے۔ مزاحیہ سٹ کام 'بتاشے' پر لطف کہانیوں پر مبنی پروگرام ہے اس کے کردار دو شاگرد اور ایک لڑکی کے درمیان گھومتے ہیں اسے تحریر کیا ہے اجو بھائی نے جبکہ فنکاروں میں خواجہ اکمل، گل رعنا، اروبا مرزا، گل پیرزادہ اور ایاز سومرو شامل ہیں۔ یہ سٹ کام ہر ہفتے کی رات 7 بجے دکھایا جارہا ہے اِدھر سٹ کام 'بے وقوفیاں' ایک ہلکی پھلکی مزاحیہ سیریز ہے اس کے فنکاروں میں شگفتہ اعجاز، شیری شاہ اور حماد فاروقی قابل ذکر ہیں۔ یہ سیریز ہر ہفتے کی رات 7:30 بجے دکھائی جارہی ہے۔ سیریل 'ناراض' نے اپنی مقبولیت برقرار رکھی ہے۔ اس سیریل کا کردار تین افراد پر مبنی ہے اس کے مرکزی کرداروں میں اذلان، فریحہ اور آزر ہیں جبکہ فیصل قریشی کی اداکاری کو ناظرین بہت پسند کررہے ہیں۔ یہ سیریل ہر پیر کی رات 8 بجے دکھائی جارہی ہے بے گناہ لوگ انسانوں کی نظر میں گناہ گار بن جاتے ہیں اور پھر انسان خود ہی اس کی سزا مقرر کرتا ہے یہ کہانی ہے۔ سیریل 'بے قصور' کی جس کے فنکاروں میں ثمینہ پیرزادہ، وسیم عباس، ساجد حسن، جویریہ عباسی شامل ہیں۔ یہ سیریل ہر بدھ کی رات 8 بجے دکھائی جارہی ہے۔ سیما شیخ کی تحریرہ کردہ سیریل 'میں ادھوری' اپنی مثال آپ ہے۔ یہ سیریل ہر ہفتے کی رات 8 بجے دکھائی جارہی ہے جبکہ فنکاروں میں طلعت حسین، اسفر رحمان، صبا

ARY ڈیجیٹل کی سیریل ''بے قصور میں جویریہ عباسی

حمید، ثانیہ شمشاد قابل ذکر ہیں۔ سوپ 'رفعت آپا کی بہوئیں' میں تین نہایت اہم سوشل موضوعات کو پیش کیا جارہا ہے۔ اس سوپ کے ہدایت کار شاہد یونس ہیں۔ جبکہ فنکاروں میں بشریٰ انصاری، فرح ندیم، شہزاد رضا، مدیحہ زیدی، اور نوید رضا

قابل ذکر ہیں۔ بشریٰ انصاری اور شہزاد رضا کی اداکاری کو ناظرین بہت پسند کر رہے ہیں۔ یہ سوپ پیر سے لے کر جمعرات تک رات 7 بجے دکھایا جارہا ہے۔ سوپ 'دل برباد' خواتین میں

ARY ڈیجیٹل کے سوپ
"رفعت آپا کی بہویں" میں بشرا انصاری

مقبول ہورہا ہے یہ دو بہنوں رانیہ اور ہانیہ کی کہانی ہے ان دونوں بہنوں کے والدین دنیا میں نہیں ہیں اور یہ اپنی نانی کے ہمراہ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی ہیں۔ اس خوبصورت سوپ کو تحریر کیا ہے معروف مصنفہ نزہت ثمن نے جو خوب لکھتی ہیں جبکہ اس کے فنکاروں میں سنگیتا' فرح علی' مریم انصاری' عمران اسلم' انعم تنویر اور فضیلہ قاضی شامل ہیں۔ جن کی اداکاری کو ناظرین بہت پسند کر رہے ہیں۔ یہ سوپ پیر سے لے کر جمعرات تک رات 7:30 بجے دکھایا جارہا ہے سیریل 'تیرے در پر' یہ وہ سیریل ہے جب اپنوں کی بے وفائی مقدر بن جائے تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ اسے تحریر کیا ہے رخسانہ نگار نے جبکہ ہدایت عبداللہ بدنی کی ہیں اس کے فنکاروں میں قوی خان' نائلہ جعفری' راشد فاروقی' شہود علوی' سوبر علی' سبرین صبانی شامل ہیں۔ یہ سیریل ہر منگل کی

رات 9 بجے دکھائی جارہی ہے سیریل 'خاتون منزل' حنا دل پذیر کی سیریل کہلائی جارہی ہے اور اس میں ان کی کردار نگاری واقعی لاجواب ہے اس سیریل میں جو فن کار پرفارم کر رہے ہیں اُن میں شبیر جان' قوی خان' ارسا غزل' پروین اکبر شامل ہیں۔ یہ سیریل ہر جمعرات کی رات 8 بجے دکھائی جارہی ہے۔

قارئین اب چلتے ہیں ARY زندگی سے پیش ہونے والے سوپ 'ہماری بٹیا' کی طرف کہانی کا مرکزی کردار فضا کے والد ہیں جو بے انتہا دولت مند ہیں اس کے فنکاروں میں فرحت ناز' فرقان قریشی' عدنان ٹیپو اور ارشد فاروقی قابل ذکر ہیں۔ یہ سوپ ARY زندگی سے پیر

ARY زندگی کے سوپ 'ہماری بٹیا'
میں فاطمہ آفندی اور فرقان قریشی
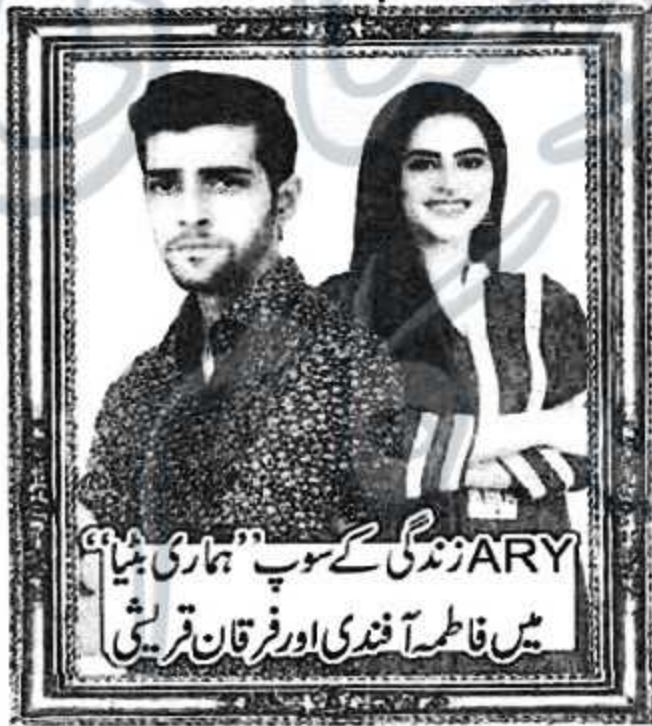
سے لے کر جمعرات تک روزانہ 7 بجے دکھایا جائے گا۔ ARY زندگی سے پیش ہونے والا خوبصورت اور کامیاب سپرہٹ سوپ 'بہنیں ایسی بھی ہوتی ہیں' پیر سے لے کر جمعرات تک 7:30 بجے روزانہ دکھایا جارہا ہے۔ سوپ 'بے گناہ' جمعہ ہفتہ اتوار 7:30 بجے دکھایا جارہا ہے۔

☆☆......☆☆

اسماء اعوان

نعت رسول مقبول ﷺ

حضور آپ ﷺ سا پیدا ہوا نہ ہوگا کوئی
اُفق کے پار یہ نغمہ سنا رہا ہے کوئی
دھڑک دھڑک کے میرا دل یہ کہہ رہا ہے کہ سُن
حضور پاک ﷺ کا روضہ دکھا رہے کوئی
فضا یہ کیسی معطر ہوئی میرے گھر کی
فلک یہ کہتا ہے نزدیک آ رہا ہے کوئی
درِ حبیب پہ جاؤں تو ایک نعت پڑھوں
جو دل میں سویا ہے جذبہ جگا رہا ہے کوئی
یہ کیسا نور ہے پھیلا جہانِ عالم میں
نگاہِ شوق سے پردے ہٹا رہا ہے کوئی

شاعرہ: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی
انتخاب: نگہت غفار۔ کراچی

حضرت علیؓ کے سنہرے اقوال

☆...... رزق کے پیچھے اپنی عزت کا سودا مت کرو کیونکہ نصیب کا رزق انسان کو ایسے تلاش کرتا ہے جیسے مرنے والے کو موت۔

☆...... مشکل ترین کام بہترین لوگوں کے حصے میں آتے ہیں کیونکہ وہ اسے حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

☆...... خدا کے نزدیک کسی انسان کی عزت جتنی زیادہ ہوتی جاتی ہے اِس کا امتحان بھی اِس قدر سخت ہوتا چلا جاتا ہے۔

☆...... جب بھی فارغ وقت ملے تو اپنی ماں کے پاس جا کر بیٹھ جایا کرو کیونکہ ماں کے ساتھ گزرا ہوا وقت قیامت کے دن نجات کا باعث بنے گا۔

☆...... مصیبت میں ہو تو کبھی یہ مت سوچو کہ کون سا دوست کام آئے گا بلکہ یہ سوچو کہ اب کون سا دوست چھوڑ کر جائے گا۔

مرسلہ: معصومہ رضا۔ کراچی

خوبصورت بات

اگر راستہ خوبصورت ہے تو معلوم کرو کہ کس منزل کو جاتا ہے لیکن اگر منزل خوبصورت ہے تو راستے کی پرواہ مت کرو۔

مرسلہ: ندیا مسعود۔ کراچی

کوا

لڑکا: ''اپنا ایڈریس بتائیں آپ کے گھر آنا ہے۔''
لڑکی: ''جس گھر کی چھت پر کوا بولے وہیں آ جانا۔''
لڑکا: ''لیکن کوا تو کسی بھی گھر میں بول سکتا ہے۔''
لڑکی: ''تم نے بھی تو چھتر (جوتے) ہی کھانے ہیں کہیں سے بھی کھالینا۔''

مرسلہ: چیکو۔ لندن

بے بسی

ہوں تو خفا اُس سے پر جانے پھر بھی کیوں
نہ چاہ کر بھی اُس کو چاہنا اچھا لگتا ہے
حقیقت سے ہوں دور یہ مجھ کو ہے پتا
پر جان کر انجان رہنا اچھا لگتا ہے
قائل نہیں ہم رونے کے پھر بھی کبھی کبھی
تنہائی میں کچھ دیر رونا اچھا لگتا ہے

پسند: افشاں چوہدری۔ یو کے

گہری باتیں

☆...... آنسوؤں کا جاری نہ ہونا دل کی سختی کی وجہ سے ہے۔

☆...... محنتی شخص کے سامنے پہاڑ کنکر ہے اور کاہل انسان کے سامنے کنکر پہاڑ۔

☆...... بڑا انسان وہ ہے جس کی محفل میں کوئی خود کو چھوٹا نہ سمجھے۔

☆...... دوست ہو یا پرندہ دونوں کو آزاد چھوڑ دو لوٹ آیا تو تمہارا اور نہ لوٹ کے آیا تو تمہارا کبھی تھا ہی نہیں۔

☆...... اگر تم کسی کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو جاتے ہو تو یہ نہ سمجھنا وہ کتنا بیوقوف ہے بلکہ یہ سوچنا کہ اُس کو تم پر کتنا اعتبار تھا۔

مرسلہ: ریحانہ مجاہد۔ کراچی

پتہ نہیں......

ایک سردار جی دوسری منزل سے نیچے گر گئے۔ لوگ دوڑ کر نزدیک آئے اور پوچھا۔

''سردار جی کیا ہوا؟''

سردار جی نے جواب دیا۔

''پتہ نہیں میں تو ابھی آیا ہوں۔''

مرسلہ: شاہ زیب انصاری۔ جہلم

آکسیجن

اگر زمین سے آکسیجن صرف 5 منٹ کے لیے ختم ہو جائے تو......

☆...... کنکریٹ سے بنی تمام بلڈنگ گر جائیں۔ کیونکہ آکسیجن انہیں اکٹھا رہنے میں مددگار ہے۔

☆...... تمام سمندروں سے پانی اڑ جائے گا۔ کیونکہ آکسیجن کے بعد اس میں صرف ہائیڈروجن رہ جائے گی۔

☆...... ہم سب کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے کیونکہ ہم ہوا کا 21% دباؤ کھو دیں گے۔

☆...... زمین کھردری ہو جائے گی۔ کیونکہ زمین کا 45% حصہ آکسیجن سے بنا ہے۔

''تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔''

مرسلہ: کوکب جمال۔ لاہور

گلہ

خدا کی اتنی بڑی کائنات میں، میں نے
بس ایک شخص کو مانگا مجھے وہی نہ ملا
بہت عجیب ہے یہ قربتوں کی دوری بھی
وہ میرے ساتھ رہا اور مجھے کبھی نہ ملا

پسند: رازِ عدن۔ بحرین

رشک

ایک عورت کو اُس کے میکے سے واپسی پر اُس کا شوہر اسٹیشن لینے کے لیے گیا۔ اُس کے بجھے ہوئے سے چہرے کو دیکھ کر بیوی خفگی سے بولی۔

''میرے آنے پر آپ ذرا بھی خوش نہیں لگ رہے، ذرا سامنے اس جوڑے کو دیکھیے شوہر خوشی سے کھلا جا رہا ہے۔'' میاں نے بڑے رشک سے جواب دیا۔

"ارے وہ اپنی بیوی کو لینے نہیں بلکہ ٹرین میں سوار کرانے آیا ہے اِس کی بیوی آج میکے جا رہی ہے۔"

مرسلہ: طاہر غنی۔ میانوالی

یاد رکھیں

لوگوں کے لیے آپ تب تک اچھے ہیں جب تک آپ اُن کی امیدوں کو پورا کرتے ہیں۔ اور آپ کے لیے سب لوگ اچھے ہیں جب تک آپ اُن سے کوئی امید نہیں رکھتے۔

مرسلہ: ماہین خاور۔ سیالکوٹ

طب کی باتیں

حجاج بن یوسف نے اپنے دور کے مشہور طبیب 'شیب بن زید' سے فرمائش کی کہ مجھے طب کی کچھ اچھی باتیں بتاؤ۔ طبیب نے کہا۔

☆...... گوشت صرف جوان جانور کا کھاؤ۔

☆...... جب دوپہر کا کھانا کھاؤ تو تھوڑی دیر سو جاؤ اور شام کا کھانا کھا کر چلو چاہے تمہیں کانٹوں پر چلنا پڑے۔

☆...... جب تک پیٹ کی پہلی غذا ہضم نہ کر لو دوسرا کھانا نہ کھاؤ چاہے تمہیں تین دن لگ جائیں۔

☆...... پھلوں کے نئے موسم میں پھل کھاؤ اور موسم جانے لگے تو پھل کھانا چھوڑ دو۔

☆...... کھانا کھا کر فوراً پانی پینے سے بہتر ہے کہ زہر پی لو۔

مرسلہ: فہمیدہ نسرین۔ کراچی

جواب در جواب

زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا وہ جگہ بتا جہاں خدا نہیں
(مرزا غالب)

مسجد خدا کا گھر ہے پینے کی جگہ نہیں
کافر کے دل میں جا، وہاں خدا نہیں
(علامہ اقبال)

کافر کے دل سے آیا ہوں میں یہ دیکھ کر
خدا موجود ہے وہاں، پر اُسے پتہ نہیں
(احمد فراز)

مرسلہ: سلمیٰ۔ بحرین

عامل

ایک عامل صاحب کا بڑا چرچہ تھا کہ وہ روحوں سے بات کرا دیتے ہیں۔ ایک بچہ اُن کے پاس پہنچا اور مقررہ رقم اُن کے ہاتھ پر رکھ کر اپنے دادا سے بات کرنے کی فرمائش کی۔ اُسے ایک اندھیرے کمرے میں لے جایا گیا۔ چند لمحے بعد ایک بھاری سی آواز سنائی دی۔

"کیوں آئے ہو برخوردار......"

"دادا جان......" بچے نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہ پوچھنا ہے کہ آپ کی روح یہاں کیا کر رہی ہے۔ آپ کا تو ابھی انتقال بھی نہیں ہوا۔"

مرسلہ: احسن رضا۔ اسلام آباد

پھر......

سکوں بھی خواب ہوا، نیند بھی ہے کم کم پھر
قریب آنے لگا، دوریوں کا موسم پھر
وہ نرم لہجے میں کچھ کہہ رہا ہے پھر مجھ سے
چھڑا ہے پیار کے کومل سروں میں مدھم پھر
تجھے مناؤں کہ اپنی انا کی بات سنوں
اُلجھ رہا ہے مرے فیصلوں کا ریشم پھر
بہت عزیز ہیں آنکھیں مری، اسے لیکن
وہ جاتے جاتے انہیں کر گیا ہے پُرنم پھر

شاعرہ: پروین شاکر/ پسند: خولہ عرفان۔ لاہور

”2016ء میں“

کوئی دکھ نہ ہو، کوئی غم نہ ہو
کوئی آنکھ کبھی نم نہ ہو
کوئی دل کسی کا توڑے نہ
کوئی ساتھ کسی کا چھوڑے نہ
بس پیار کا دریا بہتا ہو
کاش 2016ء ایسا ہو

مرسلہ: فصیحہ آصف۔ ملتان

رشتے

فاصلے کبھی بھی رشتے الگ نہیں کرتے اور نزدیکیاں کبھی رشتے نہیں بناتیں لیکن اگر احساس سچے اور پُرخلوص ہوں تو رشتے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

مرسلہ: صبوحی کاظمی۔ کلفٹن کراچی

وجہ

پیرس کے ایک ریسٹورنٹ میں رات دو بجے آخری گاہک نشے میں اپنی میز پر سر رکھے سو رہا تھا۔ صفائی کرنے والی عورت نے مالک سے کہا۔
”میں نے پانچ بار آپ کو اس شخص کو اٹھاتے دیکھا ہے آپ اِسے نکال کیوں نہیں دیتے۔“
مالک نے جواب دیا۔
”اِس کی ضرورت نہیں، میں جب بھی اسے اٹھاتا ہوں اور بل مانگتا ہوں یہ ہر بار بل ادا کر کے پھر سو جاتا ہے۔“

مرسلہ: زرین زبیر کوٹھاری۔ کراچی

خاموشی

خاموشی عورت کا زیور ہے اور وہ یہ زیور اُس وقت پہنتی ہے جب وہ سو رہی ہو۔

مرسلہ: افشاں منصوب۔ اسلام آباد

حسن

تم لاکھ جاذب وجمیل سہی
زندگی جاذب وجمیل نہیں
نہ کرو بحث ہار جاؤ گی
حسن اتنی بڑی دلیل نہیں

شاعر: جون ایلیا/ پسند: سعدی سیٹھی۔ یو کے

ابو

ٹیچر: ”اگر میں 500 تمہارے ابو کو دوں جبکہ انہیں صرف تین سو کی ضرورت ہو تو وہ مجھے کتنے واپس کریں گے۔“
بچہ: ”سر کچھ بھی نہیں۔“
ٹیچر (غصے سے) ”تم حساب نہیں جانتے؟“
بچہ: ”سر آپ میرے ابو کو نہیں جانتے۔“

مرسلہ: اسلم شہزاد رحمانی۔ سیالکوٹ

گھریلو ٹوٹکے

☆......اگر آپ کے بالوں میں چیونگم چپک جائے تو وہاں تھوڑا سا شہد لگالیں اور پھر کچھ دیر بعد دھولیں۔ چیونگم اتر جائے گی۔
☆......وہ لوگ جن کا بلڈ پریشر کم ہوتا ہے روزانہ کھجور کھائیں۔
☆......ایک گلاس نیم گرم پانی میں چٹکی بھر نمک اور ایک کھانے کا چمچہ گنے کا سرکہ ڈال کر دن میں دو مرتبہ اچھی طرح کلی کریں۔ درد جاتا رہے گا۔
☆......اگر گھر میں ایک جگہ بہت سی چیونٹیاں جمع ہو جائیں تو تھوڑا سا وہاں آٹا چھڑک دیں چیونٹیاں چلی جائیں گی۔
☆......روز صبح لہسن کے دو جوئے اور ایک چائے کا چمچہ شہد کھانے سے بلڈ پریشر نارمل رہتا ہے۔

مرسلہ: مسز شہزاد زیدی۔ میر پور خاص

☆☆......☆☆

نئے لہجے نئی آوازیں

میں چپ رہی

تم نے دیکھا تھا میں کس قدر چپ رہی
مجھ کو کرنے لگے در بدر، میں چپ رہی
میری سہمی ہوئی آنکھ میں خوف تھا
راہ کتنی تھی پُر خطر، میں چپ رہی
کتنے موسم میرے دکھ پر ہنستے رہے
زخم سہتی رہی عمر بھر، میں چپ رہی
میری قسمت میں ہر سو اندھیرے ہی تھے
میری چاہت کی تذلیل ہوئی میں چپ رہی
بات بڑھ جائے گی اگر، میں چپ رہی
جس کو مانگا تھا وہ مجھے ملا ہی نہیں
سب دعائیں ہوگئیں رائیگاں میں چپ رہی

شاعرہ: فریدہ جاوید فری۔ لاہور

یاد کے گہنے

تمہاری یاد کے گہنے
میں دن بھر پہنے رہتی ہوں
مگر جب رات ہوتو یہ
بڑا بے چین کرتے ہیں
جدائی کی کبھی بالی
کوئی سرگوشی کرتی ہے
کبھی ذو معنی سے
جملے کا کنگن
کھنکھناتا ہے
تیری خاموشی چاہت سے جڑا
خوش فہمیوں کا ہار
نگاہیں خیرہ کرتا ہے
تیری نظروں کی شوخی اور شرارت
سے بنا جھومر مجھے سونے نہیں دیتا
اُمیدوں سے بنی پازیب
شب بھر بجتی رہتی ہے
یہ میری نیند کے بدلے
جو گہنے دیے گئے ہو تم
بڑے ہیں قیمتی لیکن
گزارش میری سن لو تم!
میری نیندیں چرائی ہیں
یہ گہنے بھی چرا لو تم!

شاعرہ: خولہ عرفان۔ کراچی

غزل

اُن کے ہونٹوں پہ میرا نام بھی ہوگا ایک دن
مجھ پر الزام سرِ عام بھی ہوگا ایک دن
مشک و عنبر کی طرح پھیلے گی خوشبو ہر سو
میرا خوشبو پہ لکھا نام بھی ہوگا ایک دن
زرد پتے جو درختوں کے ہیں جھڑ جائیں گے
پھر بہاروں کا یہ اکرام بھی ہوگا ایک دن
میری نظروں سے ہی بھر جائے گا پیمانہ تیرا
اور چھلکتا یہ تیرا جام بھی ہوگا ایک دن
سب دھنک رنگ بھی، خوشبو بھی تمہاری انزاء
اور حسین اس قدر انجام بھی ہوگا ایک دن

شاعرہ: انزاء نقوی۔ کراچی

غزل

شب دیجور تھی اس کی یادوں سے مزین
الفاظ بے معنی اور میرے اندر کی کشتِ سخن

اجڑے دیار اور یہ میری چشمِ انتظار
دل مختل کیوں روتا ہے میں خود ہوں پریشان
اے آتش غم تُو ہے میرے مزاج کے خلاف
تجھے اپنا لوں میں گر تو بڑا عجیب ہے یہ ملن
یادوں کے صحرا' اشکوں کی رم جھم اور روتی محبت
اس کی انا لاجواب اور دلِ برباد کو وفا کا یقین
تقدیر میں سفر تھا غموں کی تھکن کے سنگ عاشا
اور اُفق کو چھونے کی خواہش کرے یہ بے چین من
شاعرہ: عائشہ نور عاشا۔ شادیوال، گجرات

جواب لکھ لو

میں اکثر یہ سوچتی ہوں
میں اُداس سی کیوں رہتی ہوں
اِک دن اکیلے بیٹھے بیٹھے
دل کو ٹٹولا، یہ سوال پوچھا
تیری اداسیوں کا راز کیا ہے
یہ بھیگی آنکھوں کا جواز کیا ہے
یہ جو لڑکھڑاتے سے قدم ہیں پڑتے
یہ جھکی سی آنکھوں سے اشک گرتے
ان کے سوال کیا ہیں، جواب کیا ہیں
یہ جو بے قراری سے دل تڑپتا
ہچکیوں سے یہ سسکتا، آہیں بھرتا، یہ مچلتا
کوئی تو اِس سب کا سبب بتادے
دل کے گپت کونے سے آواز آئی
پیار کے کھیل ہیں عجب نرالے
تیری بھیگی آنکھیں اُسی کو ڈھونڈیں اُسی کو کھوجیں
تیرے اُداس دل میں آئیں اُسی کی سوچیں
لیکن جس کا کام اُسی کو ساجھے
وہ تیرے لیے نہیں بنا ہے پیارے
اپنے دل میں یہ جواب لکھ لو
یہ سوال لکھ لو، جواب لکھ لو
شاعرہ: ماریہ یاسر۔ کراچی

سانحۂ پشاور

اب لوٹ آ میرے لاڈلے
اس دل پہ بہت غبار ہے
نہ مٹ سکیں گی وہ چاہتیں
یہ آنکھیں اشک بار ہیں
اب آ بھی جا مرے من چلے
در و دیوار بھی اُداس ہیں
میری گود سُونی ہے اب تلک
میرا من بھی بیقرار ہے
میں جوان بیٹے کی ماں ہوں
مگر درد کی اک آہ ہوں
میرے من کو کوئی قرار دو
مری روح کو کوئی سکون دو
اب لوٹ آ میرے لاڈلے
اب لوٹ آ ......
شاعرہ: ذرینہ جونیجو۔ خیر پور ناتھن شاہ

تم ایسے کبھی رہے نہ تھے

تم شناسا تھے میری خواہش کے
رازداں تھے مری امیدوں کے
پھر سب کچھ بدل گیا کیونکر
کیوں بدلے بدلے سے لگ رہے ہو تم
ایسی آنکھوں میں بے وفائی ہے
بولو کس کس سے آشنائی ہے
تم کو آخر بدل دیا کس نے
تم ایسے کبھی رہے نہ تھے
ایسے بدلے ہو جیسے فصلِ گل
دو گھڑی نے بدل کر رہ جائے
اور کوئی کچھ بھی سمجھ نہیں پائے
تم تو ایسے کبھی رہے نہ تھے
شاعرہ: نوشابہ صدیقی۔ کراچی

چٹ پٹی خبریں

وہ خبریں جو آپ کا موڈ بدل ڈالیں......

کنگنا کا پرابلم

بالی وڈ کی مشہور ہیروئن کنگنا رناوٹ جو اپنی ہر نئی فلم میں اپنی ایکٹنگ سے دیکھنے والوں کو مسحور کر دیتی ہیں انہیں یہ شکایت ہے کہ وہ اپنی

عمر سے زیادہ بڑی لگتی ہیں۔ فلم ''کوئین'' میں تہلکہ مچانے والی اس اداکارہ نے بتایا کہ ایک فلم کی شوٹنگ کے دوران ارجن کپور مجھے مسلسل ''میم'' کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ میں نے انہیں ''میم'' کہنے سے منع کرتے ہوئے کہا کہ پلیز مجھے میرے نام سے پکاریے کیونکہ میں آپ سے چھوٹی ہوں۔ لیکن انہیں اِس بات کا یقین ہی نہیں آیا، پھر ایک موقع پر انہوں نے اچانک ہی میرے ہاتھ میں پکڑا ہوا میرا پاسپورٹ چھین کر میری ڈیٹ آف برتھ دیکھی تو بہت ہی حیران ہوئے تھے۔

گورنر پنجاب نصیر الدین شاہ کے فین

فیض انٹرنیشنل فیسٹیول کی اختتامی تقریب

کے مہمان خصوصی گورنر پنجاب ملک محمد رفیق رجوانہ نے اپنی تقریر کے دوران جہاں مشہور شاعر فیض احمد فیض کو اپنا نذرانہ عقیدت پیش کیا وہیں انہوں نے تقریب میں شریک انڈیا کے لیجنڈ اداکار نصیر الدین شاہ کو مخاطب کر کے اُن کا فین ہونے کا اعتراف کیا اور کہا کہ میں نے آپ کی بہت سی فلمیں دیکھی ہیں۔

خصوصاً مرزا غالب تقریباً دس دفعہ دیکھی ہے اس میں وہ سین میرا بہت پسندیدہ ہے جس میں آپ اپنی پنشن کی ساری رقم ایک کام پر لگا دیتے ہیں۔

میں نے اچھی بیوی بننے کی کوشش کی تھی، عمائمہ ملک

ٹی وی اور فلم کی مشہور اداکارہ عمائمہ ملک سے جب یہ پوچھا گیا کہ وہ دوسری شادی کب کر رہی ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ

فی الحال اُن کی ساری توجہ اپنے کیریئر پر ہے

انہوں نے مزید کہا۔ میری پہلی شادی ناکام ہوئی جس کی وجہ سے اب میں فوری طور پر شادی کے بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتی۔

شمعون عباسی کی میں نے ایک اچھی بیوی بننے کی کوشش کی تھی لیکن قسمت میں ہمارا ساتھ بس اتنا ہی تھا۔ اب اگر میں نے شادی کی تو اسے دنیا سے چھپاؤں گی نہیں بلکہ بہت دھوم دھام سے کروں گی۔

سنجے دت کی سزا میں کمی کا امکان

بالی وڈ کے مقبول فنکار سنجے دت کے اچھے رویے کے باعث جیل میں کاٹی جانے والی سزا میں 3 ماہ کمی ہونے کا امکان روشن ہوگیا ہے۔

جس کے بعد اُن کی سزا پوری ہونے سے 6 ماہ قبل ہی رہائی متوقع ہے۔

سنجے دت نے اپنی سزا کے دوران بے مثال رویہ کا مظاہرہ کیا جس کے بنا پر جیل حکام کی سفارش پر انہیں اس کا صلہ بھی بہت جلد ہی ملنے والا ہے۔

میں اپنے شوہر سے مزید محبت کرنے لگی ہوں، کاجول

بالی وڈ کی مشہور اداکارہ کاجل آج کل ہر جگہ اپنے شوہر کے گن گاتی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ ایک

انٹرویو میں انہوں نے بتایا جب مجھے 'دل والے' کی آفر آئی تو میں اپنے بچوں کی وجہ سے تذبذب کا شکار تھی۔ لیکن اجے دیوگن نے مجھے ہمت دلاتے ہوئے کہا کہ تم ضرور یہ فلم کرو۔ بچوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری میری ہوگی اور یقین کریں انہوں نے میری غیر موجودگی میں بچوں کی اتنی اچھی کیئر کی کہ میرے بچوں کو یقیناً میری کمی نہیں محسوس ہوئی ہوگی۔ اجے یوں تو پہلے ہی ایک اچھے شوہر کے طور پر میرے دل میں گھر کر چکے ہیں لیکن اب میری محبت اُن کے لیے مزید بڑھتی جا رہی ہے۔

شادی نہ کرنے کا افسوس نہیں، ہما نواب

ٹی وی کی مشہور فنکارہ ہما نواب جو 98ء میں اپنے عروج کے زمانے میں امریکہ چلی گئی تھیں وطن کی محبت انہیں واپس لے آئی ہے اور آج کل وہ ہر دوسرے ڈرامے میں ماں کا کردار کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک ملاقات میں انہوں نے بتایا

کہ حال ہی میں دوسرے ساتھیوں کی طرح میں نے بھی ایک فلم 'ماہ میر' سائن کرلی ہے جو جلد ہی مکمل ہونے والی ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ مجھے ماں کا کردار کرتے ہوئے کوئی دکھ یا افسوس نہیں ہے۔ اب تک شادی نہ کرنے کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ اپنی خودمختاری عزیز تھی۔ اس لیے بغیر شادی کے زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا اور اپنے اس فیصلے پر کبھی پچھتاوا نہیں ہوا بلکہ بہت خوش ہوں۔

☆☆......☆☆
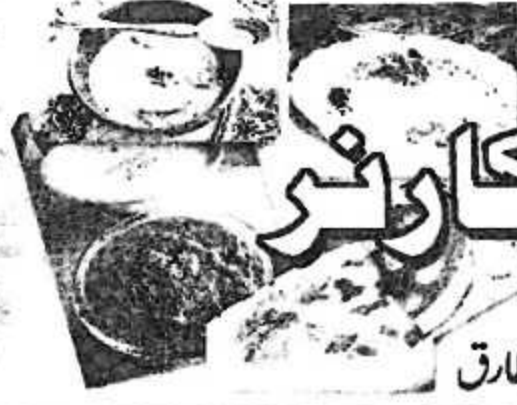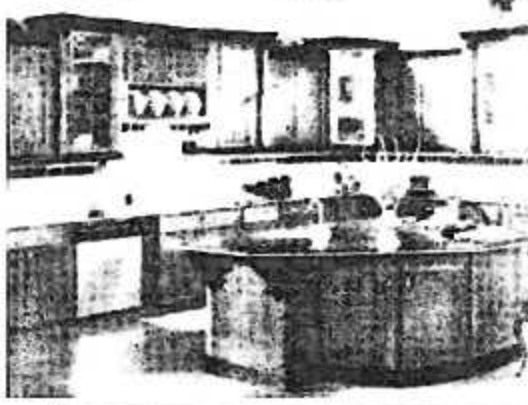
نادیہ طارق

دوشیزہ قارئین کی فرمائش پر اب سے انتہائی سہل کھانے کی تراکیب پیش کی جارہی ہیں وہ تراکیب جو عام زندگی میں سہولت کے ساتھ استعمال کی جاسکیں۔

چٹ پٹی مچھلی

اجزاء

مچھلی	ایک کلو (فش بنوالیں)
سرکہ	حسب ضرورت
زیرہ	حسب ضرورت (بھون لیں)
گرم مسالا پسا ہوا	ایک چائے کا چمچہ
لال مرچ پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ضرورت
انڈا	ایک عدد
چاٹ مسالا	دو کھانے کے چمچے
لیموں	دو عدد
بیسن	ایک پیالی
بریڈ کرم	3 کھانے کے چمچے

ترکیب:

سب سے پہلے سرکا لگا کر مچھلی کو آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پھر اچھی طرح دھولیں اس طرح مچھلی میں جو ایک مخصوص مہک ہوتی ہے وہ ختم ہوجائے گی اس کے بعد لیموں کا رس نمک اور ہلدی لگا کر مچھلی کو ایک گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ تلنے سے قبل تمام مسالے مکس کرلیں اور مچھلی کو اس آمیزے میں ڈپ کر کے فرائی کریں۔ جب مچھلی تیار ہوجائے تو اس پر چاٹ مسالا چھڑک کر کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

چرغہ

اجزاء

ثابت چکن	ایک کلو
سفید سرکہ	6 کھانے کے چمچے
لال مرچ پسی ہوئی	1 کھانے کا چمچہ
گرم مسالا پسا ہوا	½ چائے کا چمچہ
ہلدی پسی ہوئی	½ چائے کا چمچہ
کالی مرچ پسی ہوئی	½ چائے کا چمچہ
لہسن پیسٹ	1 کھانے کا چمچہ
چاٹ مسالا	1 کھانے کا چمچہ
تیل	2 کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:

سب سے پہلے چکن پر سرکہ اور نمک لگا کر 2 گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں اس کے بعد چاٹ مسالا اور تیل چھوڑ کر تمام مسالے کو چکن پر اچھی طرح لگالیں...... مسالہ لگانے سے قبل اگر چکن کو

ہلکا ہلکا کانٹے سے گود لیں تو مسالا اندر تک چلا جائے گا آدھے گھنٹے کے بعد چکن پر چاٹ مسالا بھی لگالیں اور کڑھائی میں ڈیپ فرائی کرلیں۔
مزے دار چرغہ تیار ہے تندوری نان اور دہی کے رائتے کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

چپلی کباب

اجزاء

باریک قیمہ (بڑے کا)	1/2 کلو
لال مرچ (کٹی ہوئی)	1 کھانے کا چمچہ
دھنیا (ثابت)	1/2 کھانے کا چمچہ
زیرہ (ثابت)	1/2 کھانے کا چمچہ
کالی مرچ (ثابت)	1/2 کھانے کا چمچہ
ادرک لہسن (کٹا ہوا)	1/2 کھانے کا چمچہ
ہری مرچ (کٹی ہوئی)	1 کھانے کا چمچہ
پیاز (کٹی ہوئی)	آدھی
بریڈ کرم	3 کھانے کے چمچے
انڈہ	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:
تمام اجزا کو ایک پیالے میں اچھی طرح مکس کرلیں اور چھوٹے چھوٹے کباب بنا کر رکھ لیں پھر فرائی پین میں تیل گرم کریں اور کباب فرائی کرلیں۔
گرم گرم کباب ہری چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

شکرقندی کی کھیر

اجزاء

شکرقندی	1/2 کلو
چھوٹی الائچی	4 عدد
چینی	1/2 کپ

ترکیب:
شکرقندی کو اچھی طرح ابالیں پھر اچھی طرح میش کر کے ایک طرف رکھ دیں۔ ایک دیگچی میں دودھ ابالنے رکھ دیں اور الائچی کوٹ کر اس میں شامل کردیں۔ جب دودھ میں ابال آجائے تو آنچ دھیمی کر کے چینی ملادیں اور پیسی ہوئی شکرقندی میں مکس کردیں جب دودھ گاڑھا ہونے لگے تو چولہا بند کردیں۔ شکرقندی کی کھیر تیار ہے باؤل میں نکال کر پستے بادام سے گارنش کریں۔

بیف وِد لیمن گراس

اجزاء:۔

گوشت (بغیر ہڈی کا)	آدھا کلو
کدو (پیلا)	آدھا کلو
لیمن گراس (کٹی ہوئی)	دو کھانے کے چمچے
لہسن ادرک (پسا ہوا)	ایک کھانے کا چمچہ
پیاز (کٹی ہوئی)	ایک عدد
ہری مرچیں	تین چار عدد
کٹی ہوئی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالا (ثابت)	ایک چائے کا چمچہ
تیل	چار کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب: گوشت میں تھوڑا سا لہسن ادرک ڈال کر اُبال لیں۔ جب گل جائے تو یخنی الگ کرنے کے بعد بوٹیاں نکال لیں۔ ایک بڑے سوس پین میں تیل گرم کر کے پیاز سنہری کرنے کے بعد لہسن، ادرک اور مسالے ڈال کر بھونیں۔ ساتھ میں گوشت بھی ملا دیں۔ گھیا (کدو) کے چوکور پیس کاٹ کر ملائیں اور جب گل جائے تو لیمن گراس ڈال کر نکال لیں۔ ڈش میں نکالنے کے بعد لیموں کا رس بھی ملا سکتے ہیں۔
گرم گرم نان کے ساتھ پیش کریں۔

☆☆......☆☆

بیوٹی گائیڈ

شبانہ عنایت

بڑھتی ہوئی عمر کے اثرات اوراس کی علامات کو چھپانے کے لئے بے شمار پروڈکٹس مارکیٹ میں دستیاب ہیں۔ اب ٹیکنالوجی اتنی ترقی کر چکی ہے کہ فلرز سے لے کر بوٹاکس انجکشنز تک موجود ہیں جو آپ کی جوانی برقرار رکھنے میں آپ کی مدد تو کر سکتے ہیں لیکن وقتی طور پر...... جبکہ بہت سے ایسے سادہ اور آسان، قدرتی طریقے موجود ہیں جن پر عمل کر کے آپ گردش ایام کو پیچھے کی جانب لوٹنے پر مجبور کر سکتی ہیں اور تادیر جوان نظر آ سکتی ہیں۔

مسکراتی رہیں: آپ کی مسکراہٹ ہر شے کو جگمگا سکتی ہے تو پھر آپ کی شخصیت پر تو اس کے اثرات سب سے پہلے نظر آتے ہیں۔ سو، مسکراتی رہیے! ایک حالیہ جرمن ریسرچ کے مطابق مسکراہٹ کسی بھی فرد کی عمر سے کئی سال کم کر دیتی ہے۔ یہ محض کہنے کی بات نہیں بلکہ اس کی سائنسی توجیہات ہیں جن پر آپ بھی ایک نظر ڈال سکتی ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ مسکراہٹ کی بدولت آپ کی قوت مدافعت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مسکراہٹ کے نتیجے میں انڈورفنز پیدا ہوتے ہیں جو کہ قدرتی طور سے درد کا احساس زائل کرنے والے ہارمونز ہیں۔ یہ قدرتی اصول ہے کہ ہمارے جسم میں جس قدر انڈورفنز پیدا ہوں گے ہمارے جسم میں اسی قدر بیماریوں سے لڑنے کی طاقت پیدا ہوگی۔ مسکرانے کے نتیجے میں ہمارے اندر خوشی کا احساس جنم لیتا ہے۔ کیونکہ مسکرانے سے سیروٹونن نامی ہارمونز کا اخراج ہوتا ہے جو قدرتی طور سے پریشانی کا احساس ختم کرتے ہیں اور ہمارے دل میں خوشی کا احساس جگاتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ آپ کی ایک مسکان آپ کو ایک دم جوان کر دیتی ہے۔ برلن میں کی جانے والی ایک حالیہ ریسرچ میں 150 افراد کو مختلف تصویریں دکھائی گئیں اور ان میں نظر آنے والے چہروں کی عمر پوچھی گئی۔ نتیجتاً مسکراتے ہوئے خوش باش چہروں کی عمر تمام لوگوں نے کم بتائی۔

اچھا کھائیں: اچھی اور متوازن غذا آپ کو تادیر جوان رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اپنی غذا میں اچھی چکنائی کو ضرور شامل رکھیں۔ جیسے کہ مچھلی، اخروٹ اور دیگر پھلیوں میں پائے جانے والے اومیگا تھری فیٹی ایسڈز نا صرف آپ کا موڈ خوش گوار رکھتے ہیں بلکہ ہڈیوں کو مضبوط رکھنے کے ساتھ ساتھ جلد پر سے بڑھتی ہوئی عمر کے اثرات کو بھی مٹاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ٹماٹر کھائیں، کیونکہ ان میں موجود کیمیکلز جلد

کی حفاظت کرتے ہیں۔

اپنا خیال رکھیں: جدید ریسرچ سے ثابت ہوا کہ اسٹریس اور ذہنی تناؤ جسم میں ایسی تبدیلیاں پیدا کرتا ہے، جس سے بڑھاپے کے اثرات تیزی سے نمودار ہونے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ ذہنی پریشانیوں کے سبب بلڈ پریشر اور دل کی دھڑکن میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر جوان اور خوبصورت نظر آنا چاہتی ہیں تو پرسکون رہیں اور اپنی خوشیوں کا خیال رکھیں۔

فیشل ایکسر سائز: یہاں آپ کے لیے یوگا ایکسپرٹ ڈینئل کولنز کی تجویز کردہ تین فیشل ایکسر سائز پیش ہیں۔ بیس منٹ کی جانے والی یہ ورزشیں آپ کے لیے 'فیس لفٹ' کا سا کام دکھائیں گی، آزمائش شرط ہے!

☆ اپنے ہاتھوں کی دونوں درمیانی انگلیاں اپنی بھوؤں کے درمیان رکھیں۔ پھر انگلیوں کے پوروں کی مدد سے آنکھوں کے بیرونی گوشوں پر دباؤ ڈالیں۔ اب اوپر کی جانب دیکھتے ہوئے پپوٹوں کو اوپر کی جانب حرکت دیں۔ اس کے بعد ذرا وقفہ دیں اور چھ بار اس ورزش کو دہرائیں۔ آخر میں آنکھوں کو دس سیکنڈ کے لیے بند کرلیں۔ اس سے آنکھوں کی سوجن دور ہوگی اور ان کے اردگرد بننے والی جھریوں میں کمی واقع ہوگی۔

دہانے کے گرد بننے والی لائنیں ختم کرنے، رخساروں اور جبڑے کو جھریوں سے دور رکھنے کے لیے اپنے دانتوں کو ہونٹوں میں دبائیں اور منہ کو O کی شکل میں گول کرلیں۔ اس کے بعد جتنا مسکراسکتی ہیں، مسکرائیں لیکن اس دوران دانتوں کو چھپائے رکھیں۔ اس ورزش کو چھ بار دہرائیں۔ اگلی بار مسکراتے ہوئے اپنی شہادت کی انگلی کو ٹھوڑی پر رکھیں، جبڑے کو اوپر نیچے حرکت دیں اور سر کو پیچھے کی جانب جھکائیں۔ اس ورزش کو دوبار دہرائیں۔

☆ گردن کی خوبصورتی قائم رکھنے کے لیے ایک ورزش ہے کہ سامنے کی جانب دیکھیں اور انگلیوں کی پوروں کو گردن کے اوپری حصے پر رکھتے ہوئے جلد کو نیچے کی جانب کھینچیں۔ اس دوران سر کو پیچھے کی طرف جھکاتی جائیں، اسے دو بار دہرائیں۔ اس کے بعد نچلے ہونٹ کو جس قدر باہر نکال سکتی ہیں نکالیں۔ کالر بون پر انگلیاں رکھ کر ٹھوڑی کو اوپر کی طرف اٹھائیں۔ اب دہانے کے دونوں گوشوں کو نیچے کی طرف جھکائیں، وقفہ دیں اور گہری سانسیں لیں۔ اب آپ کا فیشل ورک آؤٹ مکمل ہے۔

آنکھوں کی صحت اور دلکشی

خواتین اپنی آنکھوں کی دیکھ بھال کس طرح کرتی ہیں اس کا اندازہ اردگرد کی جلد آنکھوں کی چمک وخوبصورتی اور عمومی صحت سے ہوجاتا ہے، اگر آپ اپنی آنکھوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں یعنی انہیں نہ صرف دھوئیں بلکہ گردوغبار سے بھی بچا کر رکھیں تاکہ آنکھوں کی چمک اور خوب صورتی برقرار رہے۔ آنکھوں کے اردگرد کی جلد پورے چہرے کی جلد سے زیادہ پتلی اور نازک ہوتی ہے اور اس میں آئل گلینڈ پھیلے ہوتے ہیں ان کی صحت کے لیے اچھی کریم استعمال کی جاسکتی ہے جس کے استعمال سے اس حصے کی جھریاں خاصی حد تک ختم ہوجاتی ہیں اور ایسی خواتین کو کریم کا استعمال ضرور کرنا چاہیے جن کی جلد خشک ہو اور عمر چالیس برس سے زائد ہو۔ آنکھوں کو مسکارا لگاتے وقت خیال رکھیں کہ آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی نہ ہوں اور آئینے کی جانب براہ راست نہ دیکھیں۔

☆☆......☆☆